اسلامی کتب خانے

اُن کتب خانوں کا تذکرہ

جو مسلمانوں نے قرونِ وسطیٰ میں قائم کیے

از

جناب الحاج محمد زبیر صاحب اسسٹنٹ لائبریرین

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ندوۃ المصنفین جامع مسجد۔ دہلی

فہرست تصاویر

۱ نہج البلاغہ
۲ نوسو برس پرانی ایک تحریر
۳ صحاح جوہری مکتوبہ ۶۴۸ھ
۴ نقاشی اور جلد سازی کا ایک نمونہ
۵ کتب خانہ مشہد مقدس کا شعبۂ مخطوطات
۶ وصلی نوشتہ عبدالرشید دیلمی
۷ ہمایوں کی لائبریری - پرانا قلعہ دہلی
۸ ایک ترکی دیوان کے سرورق پر جہانگیر کی تحریر
۹ مدرسہ اور کتب خانہ بیدر
۱۰ آثار مبارک بیجاپور یعنی کتب خانہ عادل شاہی
۱۱ جعفر خاں کا مدرسہ

ان تصاویر میں نمبر ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۸ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری سے ۴ آرنلڈ کی کتاب "اسلامک بک" اور ۷، ۹، ۱۰، ۱۱ لا کی کتاب "پروموشن آف لرننگ" سے لی گئی ہیں

طبع اول ۱۹۶۱ء

قیمت مجلد پانچ روپے

مطبوعہ الجمعیۃ پریس، دہلی

اپنی رفیقۂ حیات کے نام ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفصل فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
پیش لفظ	۱۱	اسلام اور علم	۲۵	عام کتب خانے	۳۹
دیباچہ	۱۲	ذوق مطالعہ	۲۶	اسلامی کتب خانے دور	
اسلامی کتب خانوں کے قیام اور نظام پر ایک نظر		تصانیف کی کثرت	۲۷	حاضر کی لائبریریوں کے پیشرو	۴۱
		علم عروض [illegible] ذوق	۲۹	تعلیمی کتب خانے	۴۲
		قید اور تصنیف	۳۰	مدارس کی کثرت	،،
		ذوق کتابت	۳۰	ایک درس میں ۷۰ ہزار	۴۳
عہد قدیم کے دو کتب خانے	۱۸	اسلامی کتب خانوں کی ابتدا	۳۲	اشخاص کی شرکت	
مٹی کی تختیوں اور قرطاس	،،	وسیع ترقی		خواجہ نظام الملک طوسی	،،
مصری پر لکھنے کا آغاز		اسلامی کتب خانوں کا بانی	،،	کا مدرسے اور کتب خانے	
یورپ میں کتب خانوں کی ترقی کی ابتدا	۱۹	خلیفہ [illegible] کے کتب خانے	۳۳	قائم کرنے کا حکم	
قسطنطین اول کا کتب خانہ	۲۰	میں کتابوں کی کثرت		کتب خانوں کا انتظام	۴۵
کتب خانوں کی تعمیر صدوق	۲۱	حضرت [illegible] اور کتابوں کی تباہی	۳۵	بحث کا ایک نمونہ	،،
کتب خانوں کی ترقی کے اسباب	۲۲	کتب خانوں کے اقسام	۳۸	کتابوں کی فراہمی	۴۶
ثقافتی سرگرمیوں کا پس منظر	۲۲	گشتی کتب خانے	،،	فراہمی کے چند ذرائع	۴۷

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
کتبخانوں کی توسیع اور سمرقند	۹۹	نیشاپور میں اعلیٰ درجہ کے مدرسے اور کتبخانے		سلطنت عثمانیہ میں کتبخانوں	۱۲۲
علم ہیئت کے مخصوص کتبخانے	۱۰۰	عمر خیام	۱۱۱ ″	کے قیام کی ابتدا	
مراغہ کا کتب خانہ	″	حسن بن صباح اور قلعہ الموت کا کتبخانہ		سلطان محمد خان ثانی کے عہد	″
رصدگاہ مراغہ کی تعمیر کا حال	″	عضد الدولہ کا کتب خانہ	۱۱۲ ″	میں مدرسوں اور کتبخانوں کی کثرت	
بخارا	۱۰۲	مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ	۱۱۳	رستم پاشا کا کتب خانہ	۱۲۴
کتب خانے اور عمارات بخارا کے مزارات		عبد الملک کندری کا کتبخانہ	″	قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتبخانے	
نوح بن منصور کا کتب خانہ	۱۰۲ ″	بارہ کتب خانوں کی بربادی	″	۲۷۵ تعلیمی کتب خانے	۱۲۴ ″
ایران کا سب سے پہلا بڑا شاعر	۱۰۳	مرو	۱۱۴	کتب خانہ راغب پاشا	″
غزنی	۱۰۴	مرو کے کتبخانے اور یاقوت حموی		مدرسہ توحیدیہ کا کتب خانہ	۱۲۵
غزنی کا کتب خانہ	″	دس عظیم الشان کتبخانے	۱۱۴ ″	شاہی کتب خانہ	″
آٹھویں صدی عیسوی کا ایک کتبخانہ		کتب خانہ نظامیہ کتبخانہ عزیزیہ		چند کتب خانے	″
پادری الکوئین، ورکتابخانہ شیراز	۱۰۴ ۱۰۵	اور کتب خانہ الدریہ	۱۱۴	شمالی افریقہ	۱۲۷
ہرات	۱۰۶	بلخ	۱۱۵	کتبخانہ جامع زیتون تونس	″
ہرات کے نادر مطبوعہ کتبخانے	۱۰۶	مدرسوں اور کتبخانوں کا قیام	″	کتب خانہ رباط مراکش	″
کتب خانہ مدرسہ گوہر شاد بیگم	۱۰۷	فارسی میں صنائع شعری پر قدیم کتابیں		کتب خانہ مدرسہ سلطان	″
کتب خانہ مدرسہ مرزا	″	طوس	۱۱۶ ۱۱۷	فاس کا ایک کتبخانہ بہترین کتابوں سے معمور	۱۲۰
کتب خانہ جامع علی شیر	۱۰۸	کتب خانہ مشہد مقدس	″	مراکش کے کتب خانے	″
کتب خانہ مدرسہ اخلاصیہ	″	شیراز۔ عضد الدولہ کا کتبخانہ	۱۱۹	اندلسی کتاب خانوں کی بہترین کتابیں مراکش میں	۱۲۸
میر علی شیر کا کتب خانہ	″	کتب خانہ ابن العمید	۱۲۰	یوسف بن تاشفین اور امام غزالی	۱۲۹
مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ	۱۰۹	صاحب ابن عباد کا کتبخانہ	″	ابو یعقوب کا کتب خانہ	۱۳۰
جامع عثمانیہ کا کتب خانہ	″	قسطنطنیہ	۱۲۲	ابن طفیل کی کتابوں سے محبت	″

ایک ہزار تعلیمی کتبخانے ۱۹۰
چند مصنفین اور ان کی کتابیں ۱۹۱
فیروز شاہ تغلق کا کتبخانہ ۱۹۲
فتح کانگڑہ اور کتابیں ،،
فقہ کی شعرلنہ الاسرار کتابیں ،،
مدرسہ فیروز شاہی کا کتبخانہ ۱۹۳
لودی خاندان ،،
امیر غازی خاں کا کتبخانہ ۱۹۴
سید ابراہیم کا کتب خانہ ،،
ایک اہم طبی تصنیف ،،
عبداللہ تلنبی، شیخ فتح اللہ اور میاں لاڈن کے کتبخانے ۱۹۵
مخدوم شیخ سماء الدین کی تالیفات ۱۹۶
شیخ جمالی کا کتبخانہ اور انکی تصانیف ۱۹۸
سلطان سکندر لودی کا منظوم
خط شیخ جمالی کے نام ۱۹۹

ہندستان کے مسلم عہد میں کتبخانوں کا عروج و زوال

شاہان مغلیہ کے کتبخانے ۲۰۳
پہلا مغل کتب خانہ ۲۰۴
بابر کی پسندیدہ کتابیں ۲۰۶
ہمایوں ۲۰۷
کتب خانہ ۲۰۸
ہمایوں کے دو محبوب مشغلے ۲۰۹
چند تصانیف ۲۱۰
کتب خانہ مقبرہ ہمایوں ۲۱۱
اکبر اور کتبخانوں کی ترقی ۲۱۲
اکبر کا کتابی ذوق ۲۱۳
کتبخانہ کی نسبت ابوالفضل کا بیان ۲۱۴
چند نامور خطاط اور مصور ۲۱۷
چند مصور کتابیں ،،
درباری علماء کے کتبخانوں کی تعداد ۲۱۸
ہندو قوم کا سب سے پہلا فارسی شاعر ۲۱۹
تعلیمی کتبخانوں کی کثرت ۲۲۰
جہانگیر۔ اس کا مذاق شاعری ۲۲۰
کتبخانوں اور مدرسوں کے قیام کی طرف اس کی توجہ ۲۲۱
کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد ،،
چند ارباب فضل و کمال ۲۲۳
امیر تیمور کے معرکۂ جنگ کا مرقع ۲۲۴
ایک تصویر کی قیمت ۵ ہزار روپیہ ۲۲۵
تصویر شناسی میں جہانگیر کی مہارت ۲۲۵
جہانگیر کا سفری کتبخانہ ۲۲۶
کتابوں پر جہانگیر کی تحریریں ۲۲۷
شاہجہاں۔ اس کا شوق مطالعہ ۲۲۸
شاہی کتبخانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں
کتابوں پر شاہجہاں کی تحریریں ۲۲۹
مدرسہ دار البقاء ۲۲۹، ۲۳۰
کتب خانوں کی کثرت ،،
شاہجہاں کی فیاضیاں ،،
عبدالحکیم سیالکوٹی کا کتبخانہ ۲۳۱
عالمگیر۔ اس کی کتابوں سے محبت ۲۳۲
شاہی کتبخانہ اسلامی علوم کا مخزن ۲۳۲
فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ۲۳۳
مہمات کے دوران میں کتابوں کا خیال ۲۳۳
مثنوی گوئے چوگاں ،،
شاہی کتبخانے کے ناظم ۲۳۴
چند تصانیف ۲۳۵
چارسو تعلیمی کتب خانے ۲۳۶
دار العلوم فرنگی محل کی ابتدا ۲۳۷
عالمگیری عہد کے دو ترانے ،،

سیالکوٹ تعلیم اور کاغذ سازی کا مرکز ۲۳۸
بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ظفر تک ۲۳۸
محمد شاہ اور کتب خانے ۲۳۹
علم ہیئت اور جے سنگھ ۲۴۰
عمدۃ الملکی انجمن اور عبد خانی کا کتبخانہ
شاہی کتبخانہ سے شاہ عبدالعزیز ۲۴۱
کا استفادہ کرنا ۲۴۲
داراشکوہ کا کتبخانہ۔ مدرسہ شیخ جلی
زیب النساء کا کتب خانہ ۲۴۳ ۲۴۴
عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ ۲۴۵

دکنی سلطنتیں اور کتب خانے

بہمنی سلطنت ۲۴۸
بہمن شاہ کا کتب خانہ ″
خواجہ گیسو دراز کا کتب خانہ ۲۴۹
اردو نثر کی سب سے قدیم کتاب ″
مدارس بہمنی کے کتب خانے ۲۵۰
کتب خانہ محمود گاواں ″
کتب خانہ مدرسہ بیدر ۲۵۱
قطب شاہی سلطنت ۲۵۱
شاہی کتب خانہ ۲۵۲
قطب شاہی دور کے دو شاہکار ۲۵۲
کتب خانہ مدرسہ چار مینار ″
کتب خانے کی سات کتابیں ″
عادل شاہی سلطنت ۲۵۵
شاہی کتبخانہ بیجاپور ″
کتب خانہ عادل شاہی ۲۵۶
کتاب نورس۔ چند اردو مثنویاں ۲۵۷ ۲۵۸
سلطنت خداداد ۲۵۹
یونیورسٹی جمیع الامور کا کتب خانہ ″
ٹیپو کا کتب خانہ ″
کتب خانہ کے متعلق ٹیپو کی دو تحریریں
کشمیر میں شاہ کی خانقاہ ۲۶۱ ۲۶۷
سید ہمدانی کا کتب خانہ ۲۶۸
سلاطین کشمیر اور کتب خانے ″
چند تصانیف ۲۷۱
کتبخانہ مدرسہ دارالشفاء۔ مدرسہ حسینیہ کا کتبخانہ ″
نورجہ شیراز، سمرقند کا ہمسر ۲۷۲
غیاث الدین کے عہد میں چند اکتب خانے ″
گجرات ۲۷۴ ۲۷۶
سلاطین گجرات کا شاہی کتب خانہ ۲۷۷
شاہ عالم کا کتب خانہ ۲۷۹
شیخ محمد بن طاہر کا کتبخانہ ۲۸۰
شیخ عبدالقادر حضرمی کا کتبخانہ ۲۸۱
شیخ علی مہائمی کا کتب خانہ ″
مفتی رکن الدین کا کتب خانہ ۲۸۲
قاضی برہان الدین کا کتبخانہ ″
مدرسہ وجیہ الدین کا کتبخانہ ″
مدرسہ شیخ الاسلام کا کتبخانہ ۲۸۳
مدرسہ عثمان پور کا کتبخانہ ۲۸۴
مدرسہ میر خیر اور شیخ احمد کھٹو کے کتبخانے ۲۸۴
مدرسہ نفیس کا کتب خانہ ۲۸۴
مدارس سورت کے کتبخانے ۲۸۵
اعتماد خان گجراتی کا کتبخانہ ″
بنگال ۲۸۶
۱۵۰ اعلیٰ شاہی کتبخانے ۲۸۷
کتبخانہ مدرسہ لکسمی پور۔ مدرسہ شیلہ ″
مدرسہ گور کا کتب خانہ ۲۸۸
مدرسہ شائستہ خاں کا کتبخانہ ۲۸۹
مدرسہ جعفر خاں کا کتبخانہ ۲۸۹
میر محمد علی خان کا کتب خانہ ۲۹۰
نواب علی الدولہ کا کتب خانہ ″
ایک لاکھ کتب خانے ″

عنوان	صفحہ
بہار۔ چند ممتاز علماء و فضلاء	۲۹۱ ۲۹۲
خانقاہ شاہ کبیر کا کتبخانہ	۲۹۳
خانقاہ شاہ مبیر کا کتبخانہ	۲۹۳
خانقاہ اسلام پور کا کتبخانہ	"
خانقاہ پھلواری کا کتبخانہ	۲۹۴
بہار شریف کے کتبخانے	"
پٹنہ کے کتب خانے	"
شیر شاہ سوری اور کتبخانے	۲۹۶
یوپی	۲۹۷
چند علماء و فضلاء۔ چند مدارس	۲۹۷ ۲۹۸
جون پور۔ ۲۹ کتبخانے	۲۹۹
منعم خاں کا کتب خانہ	۳۰۰
قاضی ابو البقا کا کتبخانہ	۳۰۱
مولوی معشوق علی خاں کا کتبخانہ	۳۰۱
کچھوچھا۔ کتبخانہ اشرفیہ	۳۰۲
اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر	"
لکھنؤ۔ کتابوں کا مخزن و ماخذ	۳۰۶
حافظ نور اللہ کے قطعات	
موتیوں کے داموں	۳۰۷
نوابین اودھ کے کتبخانوں	
میں تین لاکھ کتابیں	۳۰۸
واجد علی شاہ کا ذاتی کتبخانہ	۳۰۸
واجد علی شاہ کی تصانیف	۳۰۹
ایک کتابیں تصنیف کرنے کا طریقہ	۳۰۹
ان کی ایک نایاب تصنیف	۳۱۰
رام پور۔ رضا لائبریری	۳۱۱
بلگرام	۳۱۲
کتب خانہ قاضی ابو الفتح	۳۱۲
کتب خانہ سید عبد اللہ بلگرامی	۳۱۲
کتب خانہ شاہ طیب	۳۱۲
کتب خانہ سید عبد الجلیل	۳۱۴
فارسی خط کی قدیم ترین کتاب	۳۰۵
مارہرہ	
ہر گھر میں ایک چھوٹا موٹا کتبخانہ	
چند تصانیف	۳۲۱
خانقاہ برکاتیہ کے کتب خانہ	
میں ہزاروں کتابیں	۳۲۲
ہندی شاعری کا ایک	
لافانی شاہکار	"
مارہرہ کے کتب خانوں کی	
کتابیں شاہ عالم گڑھ میں	۳۲۳
ملا قطب الدین شمس آبادی	۳۲۴
سید ولی اللہ کا کتبخانہ	
اور ان کی تصانیف	۳۲۴
حافظ رحمت خاں کا کتبخانہ	۳۲۶
نواب وزیر الدولہ کا کتبخانہ	۳۲۸
شاہ ولی اللہ کا کتب خانہ	۳۲۹
شاہ عبد العزیز کا کتب خانہ	۳۳۰
شاہ فخر الدین کا کتب خانہ	۳۳۱
آزردہ کا کتب خانہ	۳۳۲
ارختاں کا کتب خانہ	"
مدرسہ غازی الدین کا کتبخانہ	۳۳۳
کتب خانوں کی بربادی	۳۳۵
بہت سی کتابیں منتشر ہو گئیں	۳۳۷
مصحف عثمانی کا ایک نسخہ	۳۳۷

پیش لفظ

(از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے بادۂ تازہ و تیز سے سرشار ہو کر علوم و فنون کا رُخ کیا تو یونان و روما کے خزانوں کو کھنگال ڈالا۔ جو علوم و فنون مردہ ہو گئے تھے۔ انھیں اپنی مسیحا نفسی سے دوبارہ زندگی بخشی پھر ان کو جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ ان پر تنقید کی۔ ان کا کھرا کھوٹا معلوم کیا اور ان کے علاوہ کتنے علوم و فنون ہیں جن کی ایجاد انھوں نے کی۔ ظاہر ہے حصول علم کی پہلی ضرورت کتاب ہے۔ جب مسلمانوں کو علوم و فنون کے ساتھ یہ شغف اور عشق تھا تو خود کتابوں کی غور و پرداخت اور ان کی دیکھ بھال، ان کی حفاظت و انتظام کا انھیں کس قدر اہتمام نہ ہوتا ہوگا چنانچہ حضرت امیر معاویہ کے زمانہ سے ہی کتب خانوں کے قائم کرنے اور ان کی دیکھ بھال کا سراغ ملتا ہے اس کے بعد جوں جوں مسلمان تہذیب و تمدن اور شائستگی و ثقافت میں ترقی کرتے رہے دوسرے لوازم زندگی کے ساتھ کتب خانہ بھی اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتا رہا اور اس کے نظم و نسق میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔

ان کتب خانوں کا تذکرہ اگرچہ تاریخ و ادب کی کتابوں میں جستہ جستہ ملتا ہے لیکن اول تو جو کچھ بھی ہے وہ اس قدر کم ہے کہ اس سے اسلامی کتب خانوں کی تصویر کا مکمل خاکہ تیار نہیں ہوتا پھر وہ اس درجہ منتشر اور غیر مرتب ہے کہ اس کو یکجا کرنے کے لیے بڑی محنت و کاوش درکار ہے۔ خدا جزائے خیر عطا فرمائے

جناب حاجی محمد زبیر صاحب کو کہ اس جوئے شیر لانے کی انھیں دھن سوار ہوئی مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کے اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کی حیثیت سے کمی کس بات کی تھی۔ لائبریری سائنس سے اچھی طرح واقف۔ ذوق پختہ اور مستعد پس جب فرصت ملی کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔ چنانچہ "اسلامی کتب خانوں کی سیر" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع کر چکے ہیں جو عام طور پر بڑی مقبول پسندیدہ ہوئی لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی موصوف کا مطالعہ اور تلاش و جستجو کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کی سعی و محنت کا یہ نقش ثانی معلومات کی افراط اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بہمہ وجوہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کا مصداق ہے۔ اس کتاب سے علمی و ادبی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ ہوگا جس پر ابھی تک پوری توجہ نہیں کی گئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اسلامی کتب خانوں پر اتنی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بلکہ عام شائقین علم کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سندِ قبول عطا فرمائے اور لائق مصنف کو ان کے خلوص اور مجاہدانہ محنت و کوشش کی داد ملے۔

۹ جنوری ۱۹۶۱ء

سعید احمد اکبرآبادی

مختصر اور منتشر ملتی ہیں۔ مورخین نے سیاسی اور تمدنی حالات تو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں مگر کتب خانوں کی نسبت کہیں کہیں ضمنی طور پر لکھدیا ہے اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ کتب خانوں کی تاریخ پر جو کتابیں یورپ اور امریکہ وغیرہ سے شائع ہوئی ہیں ان میں بھی اسلامی کتب خانوں کا ذکر بالکل نہ ہونے کے برابر کر دیا گیا ہے۔ مواد کی یہ کمیابی اتنی حوصلہ شکن اور محنت طلب ثابت ہوئی کہ اس موضوع کے ساتھ آج تک پورا انصاف نہ ہو سکا اس پر متفرق مضامین تو لکھے گئے لیکن کتب خانوں کی مکمل تصویر کسی نے نہیں کھینچی۔ اردو میں شاید سب سے پہلے علامہ شبلی نے اسلامی کتب خانوں پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں موصوف نے کہا ہے کہ "عنوان کے لحاظ سے مضمون کو نہایت مفصل اور وسیع ہونا چاہیے تھا لیکن جن واقعات کو قدمار نے نظر انداز کر دیا ہو ان کے متعلق مشکل سے کچھ اجمالی حالات مل سکتے ہیں تفصیل تو بالکل نہیں ملتے۔

وسائل کی قلت اور میری مجبوریاں

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ قرون وسطی کی اسلامی دنیا میں جو ان گنت کتب خانے قائم ہوئے ان سب کو قید تحریر میں لانے کے لئے کتنے وسائل درکار ہوں گے۔ میرا بہت جی چاہا کہ شہر شہر پھر کر اس عہد کے علمی خزانوں کا کھوج لگاؤں یا کم از کم ہند و پاک کے خاص خاص کتب خانوں سے ہی استفادہ کر لوں مگر وسائل کی قلت اور حالات کی ناسازگاری سد راہ بنی رہی اور اس اہم موضوع کا پورا حق ادا نہ ہو سکا۔ یہ کتاب آج سے بہت پہلے شائع ہو جاتی اگر اس کی تکمیل میں میری مجبوریاں حائل نہ ہوتیں۔ حصول معاش کی جد و جہد میں سارے دن مصروف رہنے کے بعد جو وقت بھی زیادہ اس کام کی نذر کرتا رہا۔ خدا بھلا کرے میری بیوی کا جنھوں نے ان خانگی ذمہ داریوں کا بھی بوجھ اٹھالیا

جو مجھ سے متعلق تھیں اور مجھے اس کام میں یکسوئی کے ساتھ منہمک رہنے کا موقع دیدیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کی تکمیل کے دوران میں دل و دماغ کو پراگندہ کر دینے والے ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ کئی ماہ تک مسودہ کو ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آسکی۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ طرح طرح کے موانع کے باوجود میں اپنی سعی کاوش کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔

کتب خانوں کا یہ مرقع

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کتب خانوں کا یہ مرقع اس طرح تیار ہوا ہے کہ ان کے متعلق جس قدر مواد مل سکا اس سے استفادہ کیا اور اس باب میں جہاں تاریخ کو خاموش پایا وہاں لوگوں کے علمی ذوق، مدارس و تصانیف کو اساس بنا کر تخمینوں کے مرقعے تیار کئے مثلاً اگر کسی بادشاہ کا کتب خانہ ملا ہے اور اس کے درباری علماء اور امراء کے کتب خانوں کا ذکر نہیں آیا تو اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِم کے تحت شاہی دربار کے ہر صاحب علم کے پاس کتابوں کے ذخیرے ہونا ضروری خیال کیا گیا اور جہاں مدارس، اہل فن اور ارباب علم ملے ہیں اور ان کے کتب خانوں کا ذکر نہیں ملا وہاں تعلیمی اور شخصی کتب خانوں کا ہونا لازمی قرار دیا اس لئے کہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی جان کتابیں ہیں اور کتابوں سے صحیح استفادہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب انھیں کتب خانوں کی شکل میں رکھا جائے۔ چنانچہ کتب خانوں کے ساتھ مدارس اور تصانیف کا بھی کچھ ذکر آگیا ہے اور یہ خیال رکھئے کہ جہاں تعلیمی کتب خانے آئے ہیں ان سے مدارس کے کتب خانے مراد ہیں۔

اس کتاب کی تیاری میں سو سے زائد مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور ہزارہا صفحات پر بکھری ہوئی معلومات کا ایک ایک ذرہ چن کر اسے تیار کیا گیا ہے

لیکن اس پراگندہ اور منتشر مواد کو صرف یکجا کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے نئے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی کتبخانوں کی واضح صورت علمی دنیا کے سامنے آجائے اور یہ خشک موضوع عام قارئین کے لئے دلچسپ اور جاذبِ نظر بن جائے۔

اعتراف شکریہ اور ارادہ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صحت کے اہتمام کے باوجود اس کتاب میں خامیاں اور کوتاہیاں نظر آئیں گی۔ اور یہ کہنے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں کہ جو کچھ میں نے قلم بند کیا ہے وہ ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے اور اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔

میں ان حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کے سلسلہ میں مجھے مفید مشورے دئے۔ خصوصاً مولوی مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا میں نہایت ممنون ہوں جن کی خصوصی توجہ سے طباعت کے مراحل انجام پذیر ہوئے۔ مولوی حامد حسین صاحب جیلانی کا بھی میں بڑا شکرگذار ہوں جنھوں نے پروف کی تصحیح میں اعانت کر کے میری مشکلات آسان کر دیں۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ میں اب زندگی کی آخری منزل سے گذر رہا ہوں، اسے طے کرنے سے پہلے فنِ لائبریری کے متعلق اپنے تینتیس سالہ تجربات و مشاہدات کو کتابی شکل دیدینا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اس فن پر ایک ایسی جامع کتاب پیش کر دوں جو طلبا، لائبریری سائنس اور اصحابِ ذوق دونوں کے لئے مفید ہو اور جس سے لائبریریوں کی تنظیم و ترتیب میں مدد مل سکے۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے میں خدا کی مدد اور اربابِ علم کی توجہ کا طالب ہوں۔

۱۸ ر فروری ۱۹۶۱ء

محمد زبیر

اسلامی کتب خانوں کے قیام اور نظام پر ایک نظر

کوئی ذی علم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ قرون وسطیٰ میں اسلامی کتب خانے تہذیب و تمدن کے وہ بے بہا خزانے تھے جن کے فیض سے دنیا کا کوئی متمدن گوشہ محروم نہ رہا لیکن ان کے ذکر سے پہلے کتب خانوں کے تاریخی پس منظر کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مسلمانوں نے اس خاکہ میں کتنے انہماک اور حوصلے سے رنگ بھرے تھے اور کتب خانوں کی دنیا کو کتنی نئی قدروں سے متعارف کرایا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عہد قدیم سے لے کر آج تک کتب خانے علمی و تہذیبی زندگی کے

اہم عناصر مانے گئے ہیں۔ اور ہر زمانہ میں ان کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا گیا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے کتب[۱] خانہ اشور بانی پال اور کتب[۲] خانہ اسکندریہ کے نام آتے ہیں جو عہد قدیم کے مشہور ترین کتب خانے کہے جاتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ کے کتب خانے آجکل کی لائبریریوں کی طرح نہ تھے اور نہ اس عہد کی کتابیں موجودہ زمانہ کی کتابوں کی شکل میں تھیں ان دونوں کی نوعیت ہر زمانہ میں بدلتی رہی ہے مثلاً کاغذ کے رواج سے پہلے مٹی کی تختیوں قرطاس مصری

---

[۱] سلطنتِ اشوریا کے فرمانروا اشور بانی پال ۶۶۸ــــ ۶۲۶ ق م کا کتب خانہ نینوا (بابل) میں تھا اس کی کتابیں مٹی کی تختیاں (clay Tablets) تھیں جن پر خط پیکانی (Cuneiform) میں مذہبی امور اور شاہی احکام وغیرہ کندہ تھے۔ بابل میں مٹی کی تختیوں پر لکھنے کی ابتدا حضرت مسیح سے دو ہزار چار سو برس پہلے ہوئی تھی

[۲] عظیم الشان کتب خانہ مصر کے بطلیموسی خاندان کے بادشاہ نے اپنے پایہ تخت اسکندریہ میں حضرت مسیح سے پونے تین سو سال قبل قائم کیا تھا اس میں سات لاکھ کتابیں تھیں۔ کتب خانہ اسکندریہ کی کتابیں قرطاس مصری (Papyrus) پر لکھے ہوئے نوشتے تھے۔ مصر میں ان پر لکھنے کا آغاز حضرت مسیح سے تقریباً چار ہزار برس پہلے ہوا تھا غالباً لفظ پیپر (Paper) پیپرس سے ماخوذ ہے۔ پیپرس پر لکھے ہوئے نوشتے رول کی شکل میں تھے ان کے دونوں کناروں پر لکڑیاں لگی رہتی تھیں جن پر انھیں نقشوں کی طرح لپیٹ دیا جاتا تھا۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا الزام مخالفین اسلام نے حضرت عمرؓ پر لگایا تھا۔ علامہ شبلی نے اپنے ایک مضمون "کتب خانہ اسکندریہ" میں اس الزام کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

بھوج پتر اور جانوروں کی کھال پر لکھے ہوئے نوشتے کتابوں کا کام دیتے اور وہ جمع کرکے جہاں رکھے جاتے وہی کتب خانے کہلائے جانے لگے۔ پرانی دنیا کے علمی مرکز دیٔ یونان، مصر، روما، بابل، چین اور ہندوستان میں اسی طرز کے کتب خانے موجود تھے مگر چونکہ ان قوموں کا مزاج علمی نہ تھا اور انھوں نے علم کو خاص خاص طبقوں کی میراث بنا لیا تھا اسی لئے اُن کے کتب خانوں سے مخصوص افراد ہی استفادہ کرسکتے تھے۔

لیکن اس باب کا تاریک رخ یہ ہے کہ کاغذ اور چھاپے خانوں کا رواج ہوجانے کے بعد بھی یورپ میں کتب خانے سینکڑوں برس تک ٹھہرے پڑے رہے اور عیسائی کلیسا کی علم دشمنی نے انھیں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک محافظ خانوں اور عجائب خانوں کی شکل میں رکھا۔ ان کی غرض و غایت صرف اتنی تھی کہ ان میں کتابیں حفاظت کے ساتھ سجا کر رکھ دی جائیں۔ اُن کتب خانوں میں کتابیں زنجیروں میں

---

[1] یورپ میں کتب خانوں کی ترقی کی ابتدا اس ایکٹ سے کی جاتی ہے جو ۱۸۵۰ء میں برٹش پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا اسکی رو سے جو ٹیکس لگایا گیا وہ لائبریری سیس (Library cess) کہلاتا تھا اس ایکٹ کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے لائبریری کے لئے جائداد زمین اور فرنیچر وغیرہ تو خریدا جاسکتا تھا مگر کتابیں خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ اس ایکٹ کا نام پبلک لائبریری اینڈ میوزیم ایکٹ تھا جسے ایڈورڈ ایورٹ (Edward Ewart) نے برٹش پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔

مگر اس سے پہلے امریکہ میں بوسٹن (Boston) کی بلدیہ نے شہر کیلئے ۱۸۴۸ء میں لائبریری قانون منظور کیا تھا جو بعد میں میساچوسٹس (Massachusetts) کی ریاست میں نافذ کردیا گیا تھا۔ یہ قوانین مغربی دنیا میں موجودہ لائبریری تحریک کے بنیادی پتھر ہیں۔

باندھکر رکھی جاتی تھیں تاکہ انہیں کوئی وہاں سے لیجا نہ سکے اور اُن کے مطالعہ پر سخت پابندیاں عائد تھیں پڑھنے والے کو کتاب کے ورق الٹنے کی بھی اجازت نہ تھی ایک نگران مقرر رہتا تھا وہی ورق الٹ دیا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس وقت مسیحی دنیا میں کچھ اچھے کتب خانے[1] موجود تھے رومن شہنشاہ قسطنطین اول نے ایک کتب خانہ قسطنطنیہ میں قائم کیا تھا جس میں ۶۹۰۰ کتابیں تھیں مسیحی خانقاہوں سے بھی کتب خانے ملحق تھے مگر افادیت کے نقطۂ نظر سے ان کا عدم اور وجود برابر تھا۔ تمدن عرب[2] کے مصنف کا بیان ہے کہ عیسائی راہب اپنے وقت کو خانقاہی کتب[3] خانوں سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر ان کو چھیلنے اور ان کے چرمی ورقوں پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ غرض اس عہد میں یورپ اور دوسرے ملکوں کے کتب خانے جسد بے روح اور شمع بے نور کے مصداق بنے ہوئے تھے۔ بقول شاعر:-

دل مرکز حیات ہے اور زندگی نہیں
اک شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں

---

[1] History of Libraries by Alfred Hessel (1955)

[2] تمدن عرب مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان مترجمہ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی ص ۵۱۲

[3] Monastic Libraries

کتب خانوں کی صبح صادق

کسی زمانہ کی اسلامی دنیا میں جو کتب خانے قائم ہوئے وہ صرف کتاب گھر نہ تھے بلکہ اپنی جامعیت، ندرت اور افادیت کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے ان کے نام ہمیں بتاتے ہیں کہ مسلم ممالک میں انھیں کتنا اہم مقام حاصل تھا اور مسلمان اُن کو اپنا کس قدر عزیز سرمایہ سمجھتے تھے۔ عربی زبان میں کتب خانہ کو مکتبہ کہتے ہیں مگر عرب فرطِ ذوق کی بنا پر اپنے کتب خانوں کو بیت الحکمت، خزائن القصور، دارالعلم، خزانۃ الکتب اور خزانۃ الحکمت جیسے ناموں سے بھی یاد کرتے ہیں جس سے ان کی عظمت و اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔

علمی اور ثقافتی میدان میں مسلمانوں کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ انھوں نے اُس سکوت و جمود کو جو سینکڑوں برس سے کتب خانوں کی دنیا پر چھایا ہوا تھا دور کرکے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کے تحت کتابوں سے مستفید ہونا کسی خاص گروہ یا طبقہ تک محدود نہ رہا بلکہ ان کے استعمال کی سہولتیں بہم پہنچانا اور ان کے مطالعہ سے عوام کا علمی شعور بیدار کرنا کتب خانوں کا مقصد قرار پایا۔

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی کتب خانوں کے قیام سے کتب خانوں کی تاریخ کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوا یا یوں کہئے کہ ایک صبح صادق نمودار ہوئی جس کی روشنی میں وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہے اور بالآخر تہذیب و ثقافت کے زندگی بخش سرچشمے بن گئے۔

کتب خانوں کی ترقی کے اسباب

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں کتب خانوں کی ترقی کا ایک زبردست سبب یہ تھا کہ مسلمان کتابوں سے انتہا شغف رکھتے تھے ہر اسلامی ملک میں تحصیلِ علم، مطالعۂ کتب اور تصنیف و کتابت کے ذوق و شوق کا دریا موجزن تھا علم و فن کی اشاعت کرنا قومی شعار بن گیا تھا اور کتابیں جمع کرنے کا سودا ہر شخص کے دماغ میں سمایا ہوا تھا۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ دنیا میں مسلمانوں کی کشورکشائی اور جہانبانی کا ڈنکا بج رہا تھا اور اقلیمِ علم و سیاست پر اُن کا ہی سکہ رواں تھا اور ان کی علم دوستی، معارف پروری و علمی قدردانی نے وہ فضا پیدا کر دی تھی جس میں صرف کتب خانوں کی تشکیل و ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ تمام علوم و فنون نے حیاتِ نو پائی، نئے نئے علوم رائج ہوئے مدرسے قائم ہوئے، سائنسی تحقیقات کے لئے تجربہ گاہیں کھلیں، رصد خانے تعمیر ہوئے، کاغذ سازی کے کارخانے وجود میں آئے، خطاطی، نقاشی و جلد بندی کی ترویج و ترقی ہوئی اور کتابوں کی محبت، افادیت اور تعظیم و تکریم کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ مسلمان انھیں اپنا بہترین مونس و ہمدم سمجھنے لگے چنانچہ عرب کے شاعر متنبی اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے "وخیر جلیس فی الزمان کتاب"۔

(اور زمانے میں بہترین ہمدم کتاب ہے)

کتابوں سے قلبی تعلق کی مثال اسحاق بن سلیمان جیب کے واقعے[1] سے بہتر شاید ہی کہیں ملے کتابوں کے اس شیدائی نے عمر بھر شادی نہیں کی اولاد کی تمنا کسی کو

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء از ابن ابی اصیبعہ بحوالہ علمائے سلف از حبیب الرحمٰن خان شروانی ص

نہیں ہوتی لیکن جب کسی نے اولاد کے متعلق اُس سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ اپنی کتاب حیات کی موجودگی میں اولاد نہ ہونے کا مجھے کوئی غم نہیں۔

اگرچہ یہ سب کارنامے اب افسانے بن گئے ہیں اور مسلمانوں کی علمی شان و شکوہ کے جلوے عرصہ ہوا نگاہوں سے غائب ہو چکے ہیں مگر ان کے نقوش تاریخ کے صفحات اور مدینہ، بغداد، و قرطبہ کے در و دیوار پر ابھی تک ثبت اور روشن نظر آتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں علم کا پہلا مرکز مدینہ تھا پھر کوفہ و بصرہ تھے اس کے بعد دمشق، بغداد، قرطبہ، قاہرہ، شیراز، نیشاپور، سمرقند و بخارا، غزنی اور دہلی وغیرہ علوم کے گہوارے بن گئے۔ اسلامی مملکت کی وسعت[1] کے ساتھ علم کا دائرہ بھی بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ مدرسے اور کتب خانوں کی توسیع ہوتی رہی اگرچہ مختلف حکمراں خاندانوں کے درمیان سیاسی معاملات میں یکجہتی نہ تھی بلکہ بعض اوقات اختلافات کی شدت لڑائیوں کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی جو اقتضائے بشریت تھا لیکن علم کی اشاعت اور خدمت کا جذبہ سب کے دلوں میں موجزن تھا اور ہر فرمانروا علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ مسلم حکمرانوں کی ان علمی رقابتوں کو مورخ ایڈورڈ گبن

---

[1] اسلام کی توسیع جس سرعت کے ساتھ ہوئی، اس کا اندازہ لگانے کے لئے آنحضرت صلعم اور حضرت عمرؓ کے عہد پر نظر ڈالنی چاہیے۔ مسلمانوں کو جہاد کا حکم دوسری صدی ہجری میں دیا گیا تھا اس وقت سے حضور کی وفات (۱۲ ربیع الاول سنہ ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء) تک اسلام کا رقبہ حکومت ۱۰ لاکھ مربع میل میں پھیل گیا اس کے بعد بارہ برس کے اندر یعنی حضرت عمرؓ کے عہد (۱۳-۲۳ھ) تک رقبہ حکومت ۲۲ لاکھ مربع میل تک پہنچ گیا اور ابھی آنحضرت صلعم کو رحلت کئے ہوئے سو برس بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مسلمان ایشیا میں چین تک اور یورپ میں بحر اٹلانٹک تک جا پہونچے۔

(Edward Gibbon) نے علمی ترقیوں کا ایک سبب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے رقیبانہ مقابلہ نے علوم و فنون کا مذاق اور ان کی برکات کو سمرقند و بخارا سے لے کر فاس اور قرطبہ تک پہنچا دیا تھا۔

ثقافتی سرگرمیوں کا ایک منظر

ان اسلامی ممالک میں علم و ہنر کے چرچے کیسے پھیلے ہوئے تھے یہ ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ایک عیسائی مورخ اسکاٹ کی زبان سے سنئے اس نے قرطبہ کی ثقافتی شان و شکوہ کا منظر اس طرح کھینچا ہے۔

"یکایک خود بخود میری چشم تصور کے سامنے اس عظیم الشان دار الخلافہ کے باشندوں کے روزانہ کاروبار اور گفتار و رفتار آ گئے جو ثقافت سے غافل نہ جانتے تھے جو صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، کمالات و تحقیقات، لطافت و نفاست اور حسن واخلاق میں عیش پرست و مغرور و زوال پذیر روم سے بڑھے ہوئے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ تمام شہر میٹھی نیند سو رہا ہے اور اونچی اونچی میناروں پر علماء علم ہیئت بروج آسمانی کے نقشے لے رہے ہیں اجسام فلکی و اجرام سماوی کے مناظر و مظاہر کا مطالعہ کر رہے ہیں کواکب کی حرکات کو دیکھ رہے ہیں، سیاروں کے درمیانی فاصلوں کو ناپ رہے ہیں اور کسوف و خسوف کا حساب لگا رہے ہیں۔ میری آنکھیں ان کتب خانوں کو دیکھ رہی تھیں جن میں ہزاروں کتابیں تھیں ان کتب خانوں میں ہر ایک کے ساتھ ایک شعبہ ان کی فن مترجموں کی تھی جو زمانہ قدیم کے بڑے بڑے علماء فضلاء کی بہترین تصانیف کو عربی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ مترجم ہر ایک طالب علم کی بلا لحاظ اس کی قومیت یا مذہب کے مفت خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے ہر ایک شہر کی یہی ممتاز کیفیت ہے دنیا بھر میں کسی جگہ قلب انسانی کے نشو و نما کے

لیے ایسے مواقع نہ تھے دنیا بھر میں کہیں کسی جگہ نہ علم و ادب کی ایسی خدمت ہوئی تھی نہ اتنی قدر"

اسلام اور علم

یہ ہے نمونہ اس ثقافتی زندگی کا جس کا چشمہ کوہ فاران سے پھوٹا تھا در حقیقت دنیا کا کوئی مذہب علم کی اتنی حمایت نہیں کر سکا جتنی کہ اسلام نے کی۔ اس نے اپنے ظہور کے بعد سب سے پہلے زبانِ وحی[۱] سے علم کی عظمت و فضیلت کا اعلان کر دیا تھا جس کا یہ اثر ہوا کہ اسلام کے اولین دور میں ہی علم کے چرچے ہونے لگے آنحضرت صلعم نے ہر مسلم مرد اور عورت پر تحصیل علم[۲] واجب کر کے تعلیم عامہ کی داغ بیل ڈالی اور آپ کے زریں[۳] اقوال مثلاً اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ اُطلبوا العلم من المھد الی اللحد نے تحصیل علم کی اہمیت اور ضرورت کو واضح اور نمایاں کر دیا در حقیقت یہ تعلیم نبوی ہی کا کرشمہ تھا کہ عرب جیسی جاہل اور پس ماندہ قوم علم دوست اور علم پرور بن گئی ان میں حصول علم کا ذوق و شغف اس قدر بڑھا اور انھوں نے طلب کا دامن اتنی دور تک پھیلایا کہ بقول عیسائی مورخ جرجی زیدان "وہ آشور، بابل، مصر، یونان، فارس، اور ہندوستان کے تمام علوم کے وارث ہو گئے"

---

[۱] سب سے پہلی وحی قرآن کریم کی یہ پانچ آیتیں ہیں جو غار حرا میں شب جمعہ ۱۷ رمضان سنہ (مطابق ۷، اگست سنہ ۶۱۰ء) کو نازل ہوئی تھیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ [۲] طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ [۳] حافظ ابو عمر ابن عبد البر کی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ" جس میں علم کی فضیلت اور اہل علم کی عظمت کے متعلق احادیث اور اکابرین اسلام کے اقوال مندرج ہیں اس کا اردو ترجمہ "علم و العلماء" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوا ہے۔ [۴] علم حاصل کرو خواہ تمہیں اس کیلئے چین جانا پڑے [۵] ماں کی گود سے لے کر قبر میں جانے تک علم حاصل کرنا۔

ذوق مطالعہ | تحصیل علم کے شوق بے پایاں کے ساتھ ذوق مطالعہ اور تصنیف و کتابت کے کچھ نمونے بھی دیکھ لینے چاہئیں تاکہ اس ماحول کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجائے جو کتب خانوں کی ترقی کیلئے درکار ہے جہاں تک ذوقِ مطالعہ کا تعلق ہے اسکی سینکڑوں مثالیں مسلم سماج کے ہر طبقہ میں نظر آتی ہیں بادشاہوں میں اندلس کے اموی خلیفہ حکم ثانی کا ذوقِ مطالعہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کے کتب خانہ کی چار لاکھ کتابوں میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کو اس نے پڑھا نہ ہو کثرت مطالعہ کے سبب سے آخر عمر میں خلیفہ کی بینائی کمزور ہوگئی تھی پھر بھی اس نے مطالعہ جاری رکھا۔ علامہ ابن رشد نے ساری عمر کتب بینی میں صرف کردی اسکی عمر میں صرف دو راتیں ایسی گذری ہیں کہ جب وہ مطالعہ نہ کرسکا ایک شادی کی اور دوسری والد کی وفات کی رات۔ منجم ابو معشر کے انہماک مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے خراسان سے مکہ جاتے ہوئے بغداد کا ایک کتب خانہ خزانۃ الحکمت دیکھنے کا قصد کیا مگر وہاں پہنچکر مطالعہ میں اتنا محو ہوا کہ مکہ جانا بھول گیا بصرہ کے ایک مشہور عالم جاحظ نے تو اپنی جان ہی ذوق مطالعہ کی نذر کردی وہ آخر عمر میں مفلوج ہوگیا تھا لیکن اس حالت میں بھی کتابیں اس کے چاروں طرف لگی رہتی تھیں اور وہ مطالعہ میں منہمک رہتا تھا ایک دن کتابیں جاحظ پر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے دب کر مرگیا فتح ابن خاقان کو کتابوں کے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ اس کی آستین میں ہر وقت ایک نہ ایک کتاب رہتی تھی یہاں تک کہ وہ بیت الخلاء میں بھی کتاب کا مطالعہ کرلیا کرتا تھا۔

حضرت امام زہری کے متعلق ایک نہایت دلچسپ بات حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اپنی کتاب علمائے سلف میں لکھی ہے کہ وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے

کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی ان کی بی بی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس کے سوا کسی اور کی اسقدر گنجائش شوہر کے دل میں ہو چنانچہ ایک روز اس نے بگڑ کر کہا قسم ہے رب کی یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔

تصانیف کی کثرت

تصنیف و تالیف کے میدان میں مسلمانوں نے جو کارنامے سر کئے ہیں ان کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ غیر قوموں کے علوم کو بھی سربلند کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا حکمائے یونان و مصر و ہند کے سرمایہ علم و حکمت کو عربی کا جامہ پہنا کر حیات جاوید بخشدی۔ جرجی زیدان[1] لکھتا ہے۔

"مسلمانوں نے اس وقت کے تمام علوم و فنون فلسفہ، طب نجوم ریاضی ادب تاریخ وغیرہ وغیرہ کو جو تمام اقوام عالم میں رائج تھے اپنی زبان میں لے لیا اور اہم متمدن میں سے کسی کو نہ چھوڑا جس کی زبان سے عربی میں کتابیں نہ ترجمہ کی ہوں۔ یہ تمام علمی ذخیرہ صرف صدی ڈیڑھ صدی میں جمع کر لیا تھا اور اہل روما پوری چار صدی تک بھی یونانی علوم کو نقل نہ کر سکے تھے یہ مسلمانوں کی عجیب خصوصیت ہے جو دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں کہ انھوں نے اپنے تمدن کے تمام اسباب حیرت انگیز عجلت کے ساتھ مہیا کر لئے"

اہل نظر جانتے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت علم کہیں عام نہ تھا عرب میں بھی سوائے چند افراد[2] کے نہ کوئی لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور نہ عربی زبان میں کوئی کتاب

---

[1] علوم عرب ترجمہ تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم مصنفہ علامہ جرجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر مترجمہ مولانا اسلم جیراجپوری مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۰۷ء۔ اس میں مسلمانوں کی ہر قسم کی علمی ترقیاں نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ [2] آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت (باقی اگلے صفحہ)

موجود تھی لیکن مسلمانوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں عربی کو اتنا متمول بنا دیا کہ بقول موسیو لیبان یورپ کی یونیورسٹیاں چھ سو برس تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ رہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پندرھویں صدی تک کسی ایسے مصنف کا حوالہ نہ دیا جاتا تھا جس نے عربی کتب سے استفادہ نہ کیا ہو الغرض مسلم اہل قلم نے علم و فن کے تمام شعبوں کی آبیاری کی اور بیش نظیر تحریری سرمایہ فراہم کر دیا صرف ایک مضمون تاریخ میں بقول جرجی زیدان اس قدر کتابیں لکھیں جو حد شمار سے باہر ہیں موجودہ زمانہ سے پہلے دنیا کی کسی قوم نے فن تاریخ میں وہ درجہ نہیں حاصل کیا جو مسلمانوں نے پایا"

اسلامی دنیا میں ایسے مصنفین بھی گذرے ہیں جن کی کثیر و ضخیم تصانیف بجائے خود مستقل کتب خانے ہیں مثلاً مولانا جامی[1] نے ۵۴، خطیب بغدادی نے ۵۶، امام غزالی نے ۷۸، امام فخر الدین رازی نے ۸۰، شیخ ابن جوزی نے ۲۵۰، ابن حزم نے ۴۰۰ سے زیادہ ابن خطیب قرطبی نے ۱۱ سو کتابیں لکھیں ابن حیان نے اندلس کی ایک تاریخ ۱۰ جلدوں اور دوسری ۶۰ جلدوں میں لکھی منظفر بن الافطس نے المظفری کی ۵۰ جلدیں لکھیں ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی کی ۲۱ جلدیں تصنیف کیں جس میں پچاس برس صرف ہوئے ابن الاعرابی کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے محض اپنی یادداشت سے اتنا زیادہ علم لکھایا کہ کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر ہے۔

(بقیہ صلا) قریش میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہ، زید، ابو حذیفہ، ابوسفیان، شفاء بنت عبد اللہ شامل ہیں۔ [1] جامی کی تصانیف کی تعداد ان کے تخلص کے اعداد کے مطابق بتائی جاتی ہے اس حساب سے ۵۴ ہوئی۔

نہج البلاغہ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات، توقیعات و کلمات کے مجموعہ) کا قدیم ترین نسخہ کتبہ ۵۳۰ھ (م ۱۱۴۳ء)

اسی طرح مختلف علوم وفنون پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں مثلاً امام مالک بن انسؒ ابن شہاب زہریؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ بن حنبل، امام یوسفؒ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ جیسے بزرگوں کی تصانیف نے علم حدیث وفقہ کو بڑی وسعت بخشی۔ تاریخ وجغرافیہ اور سیرت کی دنیا میں محمد بن اسحاق ابن ہشام، ابن خلدون، ابن خلکان، ابن حجر عسقلانی، ابن اثیر، بلاذری، طبری، مقری، ادریسی، قزوینی اور یاقوت کی تصانیف کی روشنی آج تک پھیلی ہوئی ہے۔ طب، طبعیات، کیمیا، ہیئت وغیرہ میں فارابی، ابوبکر رازی، بوعلی سینا، ابن ہیثم اور ابن بیطار کے تجربات ومشاہدات اور ان کی تصانیف مشعلِ راہ کا کام دے رہی ہیں ان کے علاوہ ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد کی تصانیف نے مشرق اور مغرب کے فکر ونظر میں جو انقلاب پیدا کیا وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس فہرست میں خلیل بن احمد (متوفی ۱۷۰ھ) کا نام بھی شامل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے یہ عربی لغت وادب کے امام اور فن عروض کے موجد تھے ان کی تصنیف کتاب العین اور ان کے شاگرد سیبویہ کی "الکتاب" فن عروض اور قواعد کی سب سے پہلی کتابیں ہیں اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلیل بن احمد نے کعبہ کا پردہ پکڑ کر یہ دعا مانگی تھی کہ اے خدا مجھے ایسا علم عطا کر جو اب تک کسی کو نصیب نہ ہوا ہو اللہ نے دعا قبول کی اور یہ علم ان کو عطا کیا جس کا نام خلیل نے عروض اس لیے رکھا کہ کعبہ کا ایک نام عروض بھی ہے۔

اس موقع پر ایک کتاب "الاصابہ فی احوال الصحابہؓ" کا ذکر

بے محل نہ ہوگا اسماء الرجال پر جو کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں ان میں یہ بہترین کتاب کہی جاتی ہے اس کے انگریزی مقدمہ میں ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا ہے

"کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"

قید اور تصنیف و تالیف اسلامی تاریخ میں ایسے محبانِ علوم کے نام بھی ملتے ہیں جو دورِ ابتلاء اور ایام محن میں کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے اور جن کے قلم کی روانی قیدخانوں کی چہار دیواری بھی نہیں روک سکی تھی امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے قید خانوں میں درس کی مجلسیں گرم رکھیں امام ابن تیمیہ نے قید و بند کے دوران میں متعدد کتابیں تصنیف کیں شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط کی پندرہ جلدیں قیدخانہ میں بیٹھکر لکھیں ہندوستان کے مفتی عنایت احمد نے عربی صرف و نحو کی کتاب اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے قصائد حبسیات ایام جلاوطنی میں بمقام انڈمن لکھے۔

ذوق کتابت کتابت کا بھی کتب خانوں سے گہرا تعلق ہے اس زمانہ میں طباعت کا رواج نہ ہونے کے سبب سے اُن کی ترقی کا تمام تر انحصار کاتبوں کے دست و قلم پر تھا۔ فن کتابت پر بحث تو اگلے صفحات میں کی گئی ہے یہاں صرف اُن چند کاتبوں کا ذکر کیا جا رہا ہے

لہ ملاحظہ ہو "خطبات مدراس" از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ اعظم گڑھ (۱۹۵۸ء) ص ۴۲

جن کے ذوق کتابت نے کتب خانوں کو مالا مال کر دیا تھا اور جو قلم کے ایسے دھنی تھے کہ ہزارہا صفحات کی نقل بلا تکلف کر دیا کرتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ کے استاد احمد بن عبدالدائم نے مختلف علوم کے دو ہزار مجلدات لکھے تھے حضرت یحیٰی بن معین نے چھ لاکھ حدیثیں اور شیخ ابن الجوزی نے دو ہزار جلدیں لکھیں۔ یہ شیخ جن قلموں سے حدیث کی کتابیں لکھتے ان کے تراشے نہایت احتیاط سے اس ہدایت کیساتھ جمع کرتے جاتے تھے کہ وفات پر ان تراشوں سے غسلِ میت کا پانی گرم کیا جائے لیکن یہ اتنے تھے کہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی بچ گئے۔ امام ابو حنیفہؒ کی لکھی ہوئی کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپکے قلم صاف کرنے کی خدمت آپکے شاگرد امام محمد کے سپرد تھی وہ اپنے استاد کے قلم پر لگی ہوئی روشنائی جمع کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ اسی سے امام محمد نے تفسیر کی ایک ضخیم کتاب لکھدی۔

ان باتوں کا ذکر کہاں تک کیا جائے اس کے لئے بھی ایک مستقل کتاب درکار ہے لیکن اس کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ کتابت کا رشتہ پیغمبر اسلام کی ذات اقدس سے جا کر ملتا ہے اس فن کے ماہرین میں والہانہ ذوق پیدا کرنے کے محرک وہ اقوال ہیں جو اشاعت علم کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ چنانچہ جب مشہور محدث ترمذی اور نسائی کے استاد یعقوب الفسوی کی بینائی زیادتی کتابت کے باعث جاتی رہی اور وہ اس غم میں رات کو روتے روتے سو گئے تو انھیں خواب میں آنحضرت صلعم کی زیارت نصیب ہوئی الفسوی[1] خود کہتے ہیں کہ حضور نے اپنا دست مبارک

[1] ملاحظہ ہو نکت الہمیان فی نکت العمیان از صلاح الدین الصفدی ص ۳۱۲

میری آنکھوں پر پھیرا اور اسی وقت میری بینائی بحال ہو گئی

یہ ہیں علمی کمالات اور ثقافتی سرگرمیوں کے وہ نمونے جو بیگانوں سے بھی آجتک خراج عقیدت لے رہے ہیں چنانچہ ایک ہندو فاضل نے کہا ہے کہ "اگرچہ میں خود مسلمان نہیں ہوں لیکن اسلام نے علوم و فنون کے میدان میں جو بازی جیتی ہے اس کو سوچتا ہوں تو میرا ایشائی دل فخر و مسرت سے پھول جاتا ہے"

یہ ہی شخص اسلام کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"جب یورپ کی دنیا بربریوں کے حملوں سے زوال پذیر ہو کر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی اگر اس وقت اسلام کمک کو نہ پہنچتا اور اعلیٰ علوم کی تخم ریزی کرکے اس کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق و حریت کی جاں بخش آب و ہوا میں ان کی تربیت کر کے انھیں پھولنے پھلنے نہ دیتا تو میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کہاں ہوتی اور تہذیب جدید کا نشان کہاں ملتا؟"

لہ ملاحظہ ہو ڈاکٹر سر پی۔ سی رائے کا خطبہ "اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم" جو اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دوسرے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۲ فروری ۱۹۲۸ء بمقام علیگڑھ پڑھا۔ ہماری کتاب میں جہاں سر پی۔ سی رائے کا نام آیا ہے اس سے یہ ہی خطبہ مراد ہے۔

اسلامی کتب خانوں کی ابتدا، توسیع اور ترقی

الغرض مسلمانوں کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں کتب خانوں کے حق میں عظیم الشان محرک ثابت ہوئیں جیسے جیسے تحصیل علم اور تصنیف و تالیف کا ذوق عام ہوا اسی طرح کتب خانوں کی توسیع و ترقی ہوتی رہی اور بالآخر کتابیں جمع کرنے کا شوق اتنا بڑھا کہ جملہ اسلامی ممالک کتب خانوں سے معمور ہو گئے۔

گو اسلامی دنیا میں اخبار و سیر اور احکام و سنن کا تحریری سرمایہ آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا مگر کتب خانوں کی شکل میں کتابیں رکھنے اور غیر عربی کتابوں کے عربی میں ترجمے کی ابتدا عہد بنو امیہ[1] سے ہوتی ہے تاریخ کی سب سے پہلی کتاب کتاب الملوک و اخبار الماضین" عبید بن شریہ نے امیر معاویہ کے عہد میں لکھی۔ ان کے پوتے خالد بن یزید نے نجوم اور کیمیا پر چند رسالے[2] لکھے کہا جاتا ہے کہ خالد ہی پہلا شخص ہے جس نے اسلامی دنیا میں کتب خانوں کی بنیاد ڈالی۔

لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بنو امیہ کی حکومت قائم ہونے کے چوبیس برس بعد عبد الملک بن مروان کے عہد میں شاہی کتب خانہ نے اتنی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ جب سعید بن جبیر نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تو اسے شاہی کتب خانہ میں رکھا گیا عبد الملک نے ہر فن پر کتابیں لکھوائیں جس نے کتب خانوں کی ترقی کے

۱؎ بنو امیہ کی سلطنت ۴۱ھ (۶۶۱ء) سے ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) تک رہی

۲؎ ان رسائل کے نام یہ ہیں: کتاب الحرارت۔ کتاب الصحیفۃ الکبیر۔ کتاب الصحیفۃ الصغیر

لیے زمین ہموار کر دی اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں تصنیف و تالیف کی ترقی ہونے سے کتب خانوں کی بھی ترقی ہوئی اس نیک بخت خلیفہ نے احادیث اور مغازی کی طرف خاص توجہ دی احادیث کے مجموعے تیار کرا کے تمام مملکت میں بھیجے امام زہری کے استاد ابوبکر بن حزم انصاری کو احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری کو مغازی اور مناقب کا درس دینے کے لئے متعین کیا اس خلیفہ نے کتبخانہ (خزانۃ الکتب) کی ایک کتاب جو حکیم ماسرجویہ کی تھی سریانی زبان میں ترجمہ کرائی اور اس کو شائع کیا حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات (۱۰۱ھ) کے بعد خلیفہ ولید بن یزید کے کتب خانہ میں کتابوں کی جو کثرت بیان کی گئی ہے اس سے کتب خانوں کی رفتارِ ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے علامہ شبلی نے سیرۃ النبی (حصہ اول) میں لکھا ہے کہ ولید بن یزید کے قتل ہو جانے کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر اس کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔

امویوں کے بعد عباسیوں کا عہد آیا جس میں علوم و فنون کی غیر معمولی ترقی ہوئی خلیفہ ہارون رشید نے نہایت وسیع پیمانہ پر ایک کتب خانہ بیت الحکمت بمقام بغداد قائم کیا اب کتابیں جمع کرنے کا شوق بادشاہوں تک محدود نہ رہا بلکہ عوام میں بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا تھا یہاں تک کہ کتب خانے اسلامی تہذیب و تمدن کا جزو لاینفک بن گئے۔ ایک مصری فاضل کے

لہ رسائل شبلی ص ۲۸ ؎۲ ہارون مصنف عمر ابو النصر اردو ترجمہ از شیخ محمد احمد پانی پتی، ص ۲۲۱ (مکتبہ جدید لاہور)

قول کے مطابق بغداد کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں ایک کتب خانہ نہ ہو اور
کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ ہو۔ مورخ اسکاٹ کے
الفاظ میں اندلس میں کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جہاں تشنگانِ علوم کو سیراب
کرنے کے لئے کم ازکم ایک چشمہ (کتب خانہ) نہ ہو۔ کتب خانوں میں کتابوں
کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بیت الحکمت کے کتب خانہ (بغداد) میں ۱۰ لاکھ
کتابیں تھیں خلیفہ عزیز باللہ فاطمی کا کتب خانہ خزائن القصور (قاہرہ) ۱۶ لاکھ
کتابوں پر مشتمل تھا۔ اندلس کے اموی خلیفہ حکم ثانی کے کتب خانہ (قرطبہ)
میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں ان تینوں کتب خانوں کو مورخین نے خصوصی طور پر
عظیم الشان بتایا ہے درحقیقت یہ مشرق اور مغرب میں علم کے دو سرچشمے تھے
جنھوں نے لوگوں میں علم کی طلب اور تحصیل کا شوق پیدا کردیا تھا ان کے علاوہ
شرقی طرابلس کے کتب خانہ میں ۳۰ لاکھ اور مراغہ کے کتب خانہ میں ۴ لاکھ
کتابیں تھیں مستعصم باللہ کے وزیر ابن العلقمی کا کتب خانہ ۱۰ ہزار کتابوں
پر مشتمل تھا۔ بہاء الدین دیلمی کے وزیر شاپور بن اردشیر کے پاس دس ہزار
کتابیں تھیں صلاح الدین ایوبی کے وزیر القاضی الفاضل کا کتب خانہ
۶۰ ہزار کتابوں سے معمور تھا وزیر ابوجعفر احمد بن عباس کے کتب خانے
میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں۔ ابراہیم طبیب نے ۲۰ ہزار موفق الدین نے ۱۰ ہزار
امین الدولہ نے ۲۰ ہزار کتابیں جمع کی تھیں حکیم بلمظفر مصری کے کتب خانہ

لہ الصبح الاعشیٰ فی صناعت الانشاء از قلقشندی متوفی ۸۱۲ھ۔
مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ از مولیٰ احمد بن مصطفےٰ طاش کبری زادہ متوفی ۹۶۲ھ

میں ہزاروں کتابیں ہر فن کی تھیں حافظ ابن فرات بغدادی نے کتابوں کے اٹھارہ صندوق اور علامہ واقدی نے چھ سو قمطر کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں شیراز میں عضد الدولہ نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس میں وہ سب کتابیں موجود تھیں جو ابتدائے اسلام سے اس کے عہد تک تصنیف ہوئی تھیں بخارا کے بادشاہ نوح بن منصور کے عدیم المثال کتب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں تھیں۔ حلب کے فرماں روا سیف الدولہ کے کتب خانہ میں فن ادب کی نہایت قیمتی کتابیں جمع تھیں۔ فاس (شمالی افریقہ) کا ایک کتبخانہ بیش بہا یونانی اور لاطینی کتابوں سے پُر تھا طلیطلہ (اندلس) کی مسجد میں ایک عظیم الشان عربی کتب خانہ تھا جس کی شہرت علمی مرکز کی حیثیت سے دور دور تک پھیل گئی تھی۔ غزنی میں ایک بہت بڑا کتب خانہ سلطان محمود غزنوی نے قائم کیا تھا سلطان نورالدین زنگی شہید اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے دمشق، حلب، بیت المقدس اور مصر وغیرہ میں متعدد کتب خانے قائم کیے تھے ترکی سلاطین میں سلیمان اعظم کے ذاتی کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں تھیں محمود اول نے قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتب خانے قائم کیے تھے۔ سلیم ثالث کے عہد میں مدرسہ توپچیہ کا کتب خانہ فنون جنگ اور ریاضی کی بہترین کتابوں سے معمور تھا وزراء میں یحییٰ بن خالد برمکی کا کتب خانہ بھی نہایت عظیم الشان تھا اس میں جس قدر کتابیں جمع تھیں اتنی کسی بادشاہ کے پاس بھی نہ ہوں گی متوکل باللہ کے وزیر فتح بن خاقان کا بے نظیر کتب خانہ اہل علم کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا بغداد میں علی بن یحییٰ منجم کے کتب خانہ

خزانتہ الحکمت میں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لئے تمام ممالک سے لوگ آتے تھے محمد بن الحسین بغدادی کا کتب خانہ ایک علمی عجائب خانہ تھا وزیر ابن العمید کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی سو اونٹوں کا بوجھ کتابیں تھیں صاحب بن عباد کو اپنے کتب خانہ سے اتنی محبت تھی کہ اس کے ساتھ ہر سفر میں صرف ادب کی کتابوں کے تین سو اونٹ رہتے تھے نیشاپور کے ایک امیر ابو نصر سہل بن مرزبان نے اپنی تمام دولت کتابیں جمع کرنے میں صرف کر دی تھی۔ قرطبہ کے قاضی نطیس کے پاس نہایت قیمتی کتب خانہ تھا ایک غریب مدرس محمد بن حزم نے قرطبہ میں ایسا نایاب کتب خانہ قائم کیا تھا کہ اکثر اہل علم اس پر رشک کیا کرتے تھے۔

کتابوں کی اس تعداد کو دیکھتے وقت دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں ایک تو یہ کہ اسلامی کتب خانوں میں ایک کتاب کے بہت سے نسخے رکھنے کا رواج تھا جن کی تعداد ہزاروں تک پہونچ جاتی تھی۔ یہ نسخے مختلف اعتبار سے اہم ہوتے کوئی کتاب کی قدامت کوئی کتاب کے حسن اور کوئی جلد بندی میں ممتاز ہوتا تھا دوسرے یہ کہ زمانہ کے تعین کے بغیر کسی شے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اتنی کثیر تعداد میں کتابیں جمع کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا اس زمانہ میں ایک کتاب حاصل کرنے میں جو دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں اُن کا آج قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا مگر مسلمانوں کے شوق علم نے اپنے کتب خانوں کو دنیا بھر کے علوم کا مخزن بنا دیا تھا ان میں قرآن و حدیث کے بطلاوہ مذہب نسخوں کے علاوہ ادب، فلسفہ، طب اور ہیئت کا

وغیرہ کی کتابیں جمع تھیں ۔ یہاں قدیم کتابوں کے نایاب وکمیاب نسخے اور یونانی، رومی اور ہندی حکمار کی تصانیف کے عربی ترجمے موجود تھے ۔ واقعہ ہے کہ اسلامی کتب خانے صرف مسلمانوں ہی کی ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز نہ تھے بلکہ غیر مسلموں کے علمی سرمایہ کے بھی امین تھے چنانچہ ان کے طفیل سینکڑوں قدیم کتابیں تلف ہونے سے بچ گئیں ۔

کتب خانوں کے اقسام

مسلمانوں کے قومی مزاج میں علم دوستی ایسی سرایت کر گئی تھی کہ سماج کے ہر طبقہ نے کتب خانوں کے قیام میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا۔ سلاطین اور امرار نے انھیں اپنی سلطنت اور امارت کا لازمی جزو قرار دیا مشائخ اور علما، نے ان کو اپنی ریاضت وعبادت کا حصہ بنایا اور عام شائقین علم نے کتابیں جمع کرنا اپنا فرض سمجھا اس طرح جو کتب خانے وجود میں آئے وہ سات قسم کے تھے ۔ سلاطین کے کتب خانے، مسجدوں کے کتب خانے، خانقاہی کتب خانے، تعلیمی کتب خانے، عام کتب خانے ذاتی کتب خانے، گشتی کتب خانے

گشتی کتب خانے مسلمانوں سے پہلے گشتی کتب خانوں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا ان کے اولین نقوش

عہد اسلامی میں ملتے ہیں علاوہ ہیں کتاب میں آپ کو ایسے عاشقانِ کتب ملیں گے جو کتابیں دل وجان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اور سفر ہو یا حضر مصیبت ہو یا راحت کسی حال میں بھی انھیں کتابوں کی جدائی گوارا نہ تھی بعض بادشاہوں کے ساتھ تو دورانِ جنگ میں بھی ایک کتب خانہ رہتا تھا مگر کتابوں کے اس طرح گردش کرنے کا اس زمانہ میں کوئی نام نہ رکھا گیا تھا یہ شکل جب اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی انیسوی صدی عیسوی میں پہونچی تو اس کا نام گشتی کتب خانے (Mobile Libraries) ہوا۔

عام کتب خانے

عام کتب خانے (پبلک لائبریریاں) مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہیں انھوں نے یہ اس زمانہ میں قائم کیے تھے جب دنیا میں کتابوں کے استعمال پر کڑی پابندیاں عائد تھیں اور انھیں کتب خانوں میں مقید کرکے رکھا جاتا تھا قرونِ وسطیٰ میں یہ خصوصیت صرف اسلامی ممالک کو حاصل تھی کہ وہاں بڑے بڑے شہروں میں عام کتب خانے قائم ہوئے اور جو اسلامی تعلیم وتمدن کے اثر سے وجود میں آئے تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو علم کی اشاعت اور اس کے حصول کی تاکید کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی آگاہ کردیا تھا کہ علم ہر انسان کی ملکیت ہے اور کتابیں استعمال کرنے اور پڑھنے کا حق ہر شخص کو ملنا چاہیے اس کی تعمیل میں جب مسلمانوں نے مدرسے اور کتب خانے قائم کیے تو ان کے اخراجات کے لئے جائدادیں اور وہاں پڑھنے کے لئے کتابیں

بھی وقف کر دیں کیونکہ یہ عقیدہ راسخ ہو گیا تھا کہ موقوفہ کتابوں کو جتنا پڑھا جائیگا اسی قدر واقف کو ثواب ملے گا شروع میں یہ عمل صرف دینی کتابوں تک محدود رہا جب اسلام کے حلقہ میں طرح طرح کے علوم داخل ہو گئے تو اس عمل کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ اس طرح کتابیں جمع کرنا اور اُن کے استعمال کی سہولتیں مہیا کرنا اسلامی تمدن میں شامل ہو گیا اور موقوفہ کتبخانے (عام کتب خانے) وجود میں آ گئے

عام کتب خانوں کے قیام کی ابتدا مسجدوں سے ہوئی جو اسلام کے ابتدائی دور میں تعلیم گاہوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اور ان میں موقوفہ کتابوں کے ذخیرے بھی رہتے تھے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ کوفہ کے ایک ماہر لسانیات ابوعمرو الشیبانی نے اپنی تصنیف کے نسخے مسجدیں رکھے تھے اس بیان سے بظاہر ہوتا ہے کہ مسلم مصنفین اپنی تصانیف کے نسخے عوام کے استفادہ کیلئے اپنے محلہ یا شہر کی مسجدمیں رکھا کرتے تھے جب اسلامی کتب خانوں کا دائرہ وسیع ہوا تو یہ مسجدوں تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے لئے علیحدہ عمارتیں تعمیر کی گئیں ہارون رشید کا بیت الحکمت پہلا عام کتب خانہ تھا جو باقاعدہ وسیع پیمانہ پر بغداد میں قائم ہوا تھا اس کے بعد قاہرہ، شیراز، دمشق، غزنی بخارا اندلس، اور ہندوستان میں صدہا عام کتب خانے کھل گئے تنہا اندلس میں ستر عام کتب خانے تھے۔

ان کتب خانوں میں مطالعہ کی سہولتوں کے علاوہ قارئین کو ہر قسم

کی آسانیاں میسر تھیں ان کے لئے کاغذ اور قلم دوات بھی فراہم کئے جاتے تھے اور ان میں وہ بہت سی خصوصیات موجود ہوتی تھیں جو ڈاکٹر رنگا ناتھن نے اپنے اصولِ خمسہ[1] میں آجکل کی لائبریریوں کے لئے ضروری قرار دی ہیں اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی کتب خانے دورِ حاضر کی لائبریریوں کے پیشرو تھے۔

---

[1] ڈاکٹر رنگا ناتھن (سابق پروفیسر آف لائبریری سائنس دہلی یونیورسٹی) نے اپنی کتاب فائیو لاز آف لائبریری سائنس (Five laws of Library Science) میں مندرجہ ذیل پانچ اصول پر لائبریری سائنس کی بنیاد رکھی ہے۔

1. Books are for use — ۱۔ کتابیں برائے استعمال ہیں

2. Every reader his book. — ۲۔ ہر پڑھنے والے کے لئے کتاب (یعنی لائبریری میں ہر فرد کو اس کے مطلب کی کتاب ملنی چاہئے)

3. Every book its reader — ۳۔ (ہر کتاب کے لئے پڑھنے والا) یعنی کتابیں لائبریری میں بند کر کے نہ رکھی جائیں بلکہ ان کا استعمال ہوتا رہے۔

4. Save the time of the readee. — ۴۔ (پڑھنے والے کا وقت بچائے) یعنی لائبریری میں کتابوں کی ترتیب و تنظیم ایسی ہو کہ کتاب حاصل کرنے میں ریڈر کا وقت ضائع نہ ہو۔

5. Library is a growing organism — ۵۔ (لائبریری ایک نامیاتی (بڑھنے والا) ادارہ ہے) یعنی لائبریری جامد ادارہ نہ ہونا چاہئے بلکہ اس میں برابر اضافے ہوتے رہیں اور وہ ترقی کرتا رہے

تعلیمی کتب خانے — تعلیمی نظام میں کتب خانوں کی ہمیشہ بنیادی حیثیت رہی ہے مورخین کا بیان ہے کہ قرون وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں میں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ہوتا تھا مسجد کے علاوہ مشائخ کی خانقاہوں، علماء کے گھروں اور امراء کی ڈیوڑھیوں میں بھی مدرسے اور کتابوں کے ذخیرے ہوتے تھے۔

اسلام میں تعلیم و تدریس کی بنیاد آنحضرت صلعم کے بابرکت ہاتھوں سے پڑی اسلامی یونیورسٹی کے پہلے معلم آپ ہی تھے۔ آپ نے مکی زندگی کے آلام و مصائب کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ فرمائی اور مصعب بن عمیر کو معلم بنا کر مکہ سے مدینہ بھیجا تاکہ وہ وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کی تبلیغ کریں۔ ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو وہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اس کے بعد سنہ ۲ھ میں جنگِ بدر کے موقع پر جو قیدی گرفتار ہو کر آئے ان کی رہائی کا ایک فدیہ آپ نے یہ مقرر کیا کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے انہی قیدیوں سے لکھنا سیکھا تھا غرض آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی اور مختلف شہروں میں معلمین کی جماعتیں بھیجی جاتی تھیں اس کے بعد بنو امیہ نے اپنی سلطنت میں درس کے بہت سے حلقے جا بجا قائم کئے پھر بغداد کی عباسی مصر کی فاطمی اور اندلس کی اموی سلطنتوں میں مدارس کی اتنی کثرت ہوئی کہ صرف ایک شہر قرطبہ میں آٹھ سو مدرسے تھے اب تعلیم کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا کہ بغداد

میں امام حنبل کے استاد یزید بن ہارون کے درس حدیث میں ستر ہزار طالب علم شریک رہتے تھے اور سلیمان ابن حرب کے املائے حدیث میں حاضرین کی تعداد چالیس ہزار تھی جس میں خلیفہ مامون خود بھی شریک تھا۔

اسی قسم کی بے نظیر مثالیں خواتین کے ہاں بھی نظر آتی ہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا پایہ دینی علوم میں اتنا بلند تھا کہ بڑے بڑے اکابرین حدیث وفقہ ممدوحہ کی طرف رجوع کرتے تھے تقریباً ۲۲۱۰ احادیث آپ سے مروی ہیں حضرت رابعہؒ بصری کے علم وفضل اور زہد کا یہ عالم تھا کہ امام سفیان ثوری جیسے اعلیٰ پایہ کے محدث ان سے فیض حاصل کرتے تھے سیدہ نفیسہ (حضرت امام حسنؓ کے بیٹے زید کی پوتی) کا علم تفسیر اور فقہ میں اتنا بڑا درجہ تھا کہ امام شافعی ان کی خدمت میں آکر حدیث سنتے تھے علامہ خطیب بغدادی صحیح بخاری کا درس کریمہ بنت احمد سے لیا کرتے تھے۔

اسلامی مدارس[1] کی تاریخ میں چوتھی اور پانچویں ہجری بہت اہم ہے چوتھی صدی ہجری میں جامعہ ازہر کا قیام بمقام قاہرہ عمل میں آیا پانچویں صدی ہجری میں نیشاپور میں بڑے بڑے مدرسے کھلے اسی زمانہ میں خواجہ نظام الملک طوسی نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں قائم کیا اس علم دوست وزیر کا نام اسلامی مدارس کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اس نے تعلیم کی مد پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ طلباء کے لئے وظائف مقرر کئے اور یہ حکم جاری کیا کہ تمام اسلامی ممالک میں جہاں جس جگہ کوئی ممتاز عالم ہو اس کے لئے ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ

---

[1] علامہ شبلی نے رسائل شبلی میں اسلامی مدارس کا مفصل حال لکھا ہے اور ان کی فہرست بھی دی ہے۔

کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں سیکڑوں مدرسے اور کتب خانے قائم ہو گئے جن میں مدرسہ نظامیہ بغداد۔ مدرسہ نظامیہ نیشاپور۔ مدرسہ نظامیہ اصفہان مدرسہ نظامیہ موصل۔ مدرسہ نظامیہ بصرہ بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح محمود غزنوی۔ نورالدین زنگی۔ صلاح الدین ایوبی اور دوسرے حکمرانوں نے بھی اپنی اپنی قلمرو میں مدرسے قائم کئے۔ اور ان کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں۔ غرض چھٹی صدی ہجری تک غزنی سے لے کر قرطبہ تک مدرسے اور تعلیمی کتب خانے پھیل گئے تھے۔ مورخ ایچ جی ویلز کے الفاظ میں "اس وقت بصرہ۔ کوفہ۔ بغداد۔ قاہرہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں علم و حکمت کے مرکز تھیں اور تمام جہان میں نور پھیلا رہی تھیں۔"

کتب خانوں کا نظام

اسلامی کتب خانوں کا نظام دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ آج سے ایک ہزار برس پہلے مسلمانوں نے اپنے کتب خانوں کے لئے جو نظام قائم کیا تھا موجودہ عہد کم وبیش اسی نظام پر گامزن ہے کتب خانوں کے نظم ونسق کے لئے مخصوص محکمے قائم تھے جن کے اخراجات کیواسطے باقاعدہ بجٹ بنایا جاتا تھا۔ اس کی تنظیم کے ہر شعبہ مثلاً کتابوں کی فراہمی، کتابوں کی فہرست سازی، کتابوں کا اجرا، کتابوں کی ترتیب ونگہداشت، کتابوں کی جلدبندی، کتب خانہ کی عمارت کی حفاظت و آراستگی وغیرہ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

بجٹ کا ایک نمونہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں خلیفہ حکم ثانی (اندلس) کے کتب خانے کے لئے جو بجٹ[1] تیار کیا گیا تھا اس کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ کتب خانوں کے نظام اور ان کی طرف توجہ کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

لائبریرین کی تنخواہ	۴۸ دینار	
کاتبوں کے لئے کاغذ	۹۰ دینار	(غالباً اسی میں کاتبوں کی تنخواہ بھی شامل تھی)
فراش کی تنخواہ	۱۵ دینار	
کتابوں اور شکستہ اوراق کی مرمت کیلئے	۱۲ دینار	

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۱۰۴۷

کاغذ، قلم اور سیاہی کے لئے ۱۲ دینار
پانی بھروانے کی اُجرت کے لئے ۱۰ دینار
چٹائی (عبدانی) وغیرہ کے لئے ۱۰ دینار
نمدے کا فرش ایام سرما کے لئے ۵ دینار
دریاں ایام سرما کے لئے ۴ دینار
پردوں کی مرمت اور درستی کیلئے ۱ دینار
کل ۲۰۷ دینار

کتابوں کی فراہمی

کتب خانے کے کاموں میں پہلا اہم کام کتابوں کی فراہمی ہے اور اسی پر ان کی توسیع وترقی کا دارومدار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کاغذ کی صنعت اور چھپائی کے فن کو ترقی نہ ہوئی تھی طباعت واشاعت اور رسل ورسائل کی آسانیاں میسر نہ تھیں کتابیں کمیاب اور نایاب تھیں اور ان کے حصول کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی ابن المقری[1] نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر منزل یعنی ۸۴۰ میل کا سفر کیا تھا اور سفر بھی کیسا جو سقر کا نمونہ تھا لیکن اپنے شوق کی دُھن میں اُن لوگوں کو سفر کی صعوبتیں گراں نہ گذرتی تھیں اور ان مشکلات کے باوجود کتابیں جس ذریعہ سے بھی ممکن ہوتا حاصل کی جاتی تھیں۔ عام طور پر کتابوں کی فراہمی کے وسائل حسب ذیل تھے

---

[1] علمائے سلف ص ۴۵ یہ گذشتہ علمائے اسلام کے حالات میں وہ تاریخی کتاب ہے جو مولوی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی نے ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ جلسے (م ۱۳۱۴ھ) مقام میرٹھ میں پیش کی تھی

۱۔ بادشاہوں کے پاس ہدیوں اور تحفوں میں کتابیں آتی تھیں۔
۲۔ تاجروں سے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔
۳۔ کتابیں منگوا کر کاتبوں سے نقل کرائی جاتی تھیں۔
۴۔ فتوحات کے موقع پر کتابیں بطور مال غنیمت دستیاب ہوتی تھیں۔
۵۔ سفیر و سیاح اپنے ملک کی کتابیں لاتے اور تبادلہ میں کتابیں لے جاتے تھے۔
۶۔ حاجیوں کے ذریعہ کتابیں منگائی جاتی تھیں۔

کتابوں کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ حج تھا اسلام نے حج کے دوران میں تجارت کرنے کی اجازت دیدی ہے اس لئے اس بین الاسلامی اجتماع کے موقع پر کتابوں کی تجارت کی راہیں بہت زیادہ وسیع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ زمانہ حج کے لئے تاجر اور دلّال الکتب (کتابوں کے ایجنٹ) کتابوں کے ذخیرے مخصوص طور پر فراہم کرکے رکھتے اور شائقینِ کتب ان دنوں کا بیقراری کے ساتھ انتظار کرتے رہتے تھے خاص طور پر یہی وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں کتابیں حسب مذاق و انتخاب آسانی سے میسر آجاتی تھیں۔

بہرحال کتابوں کی فراہمی کے لئے ایک باقاعدہ نظام قائم تھا اور اس سلسلہ میں بے انتہا روپیہ صرف کیا جاتا تھا کتابوں کی تلاش و جستجو کے لئے بادشاہوں اور امراء کی طرف سے گماشتے مقرر کئے جاتے تھے جنہیں یہ حکم تھا کہ جس قیمت پر جہاں کوئی کتاب ملے فوراً خرید لی جائے یہ گماشتے کتابیں خریدتے ناقابلِ حصول کتابوں کی نقلیں کراتے اور زیرِ تصنیف کتابوں کے بارے میں اطلاعات دیتے رہتے تھے اس زمانہ میں کتابوں کی کوئی قیمت مقرر نہ تھی

کتاب کی نوعیت اور خریدار کے شوق پر قیمت کا انحصار تھا کتابوں کے شیدائی تاجروں کو منہ مانگے دام دیتے اور تحفہ کے طور پر کتابیں دینے والوں کو انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے اس زمانہ میں کتابوں کی گرانی کا یہ حال تھا کہ خلیل ابن احمد کی کتاب العین کا ایک نسخہ پچاس دینار[۱] میں بکا طبری کی تاریخ کا نسخہ سو دینار میں فروخت ہوا[۲] اندلس کے خلیفہ حکم ثانی نے کتاب الاغانی کے مصنف ابوالفرج اصفہانی کو ایک ہزار دینار[۳] عطا کئے تھے اس خلیفہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ "جو مصنف کوئی نئی کتاب تصنیف کرکے امیر المومنین کے حضور میں پیش کرے گا وہ بیش قرار انعام پائے گا"

اسلامی ممالک میں کتابوں کا جو احترام کیا جاتا تھا اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جنگ کی خونریزیاں اور فتح و نصرت کی شادمانیاں بھی اس احترام پر غالب نہ آتی تھیں مسلم فتوحات کتابوں کے حق میں رحمت ثابت ہوتیں جب مال غنیمت میں کتابیں ملتیں تو انھیں بصد احترام کتب خانوں میں

۱؎ کتاب الفہرست ص ۴۲ } بحوالہ اولگا پنٹو ص ۷ ۔ اطالوی خاتون مس اولگا پنٹو نے
۲؎ مقریزی ج ۱ ص ۴۰۸ }

اسلامی کتب خانوں پر ایک مضمون اطالوی زبان میں لکھا تھا ۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر کرنکو نے انگریزی میں کیا اس کے بعد قاضی احمد میاں جوناگڑھی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو اسلامی کتب خانے (عہد عباسیہ) کے نام سے دارالنظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا یہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ حوالوں میں جہاں کہیں اولگا پنٹو کا نام آیا ہے اس سے یہی کتاب مراد ہے ۔ ۳؎ ایک دینار دس شلنگ کے برابر ہے ۔

محفوظ کر دیا جاتا اور ترجمے کرا کے ان کی قدر و قیمت بڑھائی جاتی تھی اس طرح ہر علم و فن کی بہترین کتابیں اسلامی کتب خانوں میں پہونچ جاتی تھیں۔

فہرست سازی

کتب خانوں میں کتابیں استعمال کرنے کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے کتابوں کی فہرست سازی (Cataloguing) کی جاتی تھی تقریباً ہر کتب خانہ میں کیٹلاگ (فہرست کتب) مجلد رجسٹر کی شکل میں رہتے تھے۔ مثلاً اندلس کے خلیفہ اعظم ثانی کے کتب خانہ کی فہرست ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی اور صاحب بن عباد کے کتب خانہ کی فہرست کی دس جلدیں تھیں کتب خانہ مدرسہ محمودیہ (مصر) کی فہرستوں میں ایک حروف تہجی کے اعتبار سے اور دوسری مضمون وار مرتب کی گئی تھی۔ فہرست مرتب کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی مقرر کئے جاتے تھے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرست سازی کا کام ماہرین علوم کے سپرد ہوتا تھا چنانچہ قاہرہ کے شاہی کتب خانہ کی ہیئت اور نجوم کی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے مصر کے ایک مشہور ہیئت داں ابن السندی کو مقرر کیا گیا تھا اور کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کی فہرست ابن حجر عسقلانی نے مرتب کی تھی جو ایک بلند پایہ مصنف تھے فہرست میں جامع اور مشرح اندراجات کئے جاتے تھے اور اکثر فن وار مرتب کی جاتی تھیں۔ مورخ اسکاٹ اسلامی اندلس کے کتب خانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہے کہ فہرست کتب میں صرف کتابوں ہی کے نام نہ ہوتے تھے بلکہ مصنف کا نام، ولدیت، اور تاریخ ولادت و وفات بھی لکھی جاتی تھی اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اور دلچسپ باتوں کے ساتھ مصنف کی مختصر سوانح عمری بھی درج کر دی جاتی تھی"

اس سلسلہ میں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ فہرست سازی ہی پر کتب خانوں
کی افادیت کا انحصار ہے، کتاب کی ندرت اور اہمیت مشرح فہرست ہی کے
ذریعہ واضح کی جا سکتی ہے مگر قلمی کتابوں کی فہرست سازی مطبوعہ کتابوں کے
مقابلہ میں زیادہ وضاحت چاہتی ہے قلمی کتاب کی قدامت اور ضخامت، مصنف
کی شخصیت اور مضمون کی نوعیت کاتب کی فنی حیثیت تحریر کی قدامت اور
حسن و قبح کتاب کی نقاشی، مصوری، اور جلد بندی کی خوبیاں اور کاغذ کی حالت
بھی درج کر دینی چاہئیں تاکہ کتاب کا ہر رخ فہرست میں نمایاں ہو جائے۔ فہرست
کے اس افادی پہلو تک مسلمانوں کی رسائی آج سے ایک ہزار سال پہلے ہو چکی تھی
اور ان کی بنائی ہوئی فہرستوں کے بعض اندراجات تو بالکل وہی ہیں جو آجکل
رائج ہیں مثلاً مصنف کی تاریخ ولادت و وفات لکھنا یا فہرست کو حروف تہجی
اور فن وار مرتب کرنا غرض اسلامی کتب خانوں میں جس قسم کی ترتیب فہرست
کا آغاز ہوا اسی کی ترقی یافتہ شکل آج کل ابجدی کیٹلاگ[1] اور علمی کیٹلاگ[2] سے
نامزد کی جاتی ہے اور یہ دونوں اب دنیا کے ہر کتب خانہ کی جان
سمجھے جاتے ہیں۔

کتابوں کا اجرا

کتابوں کے اجرا (اشو[3]) کی بھی اصل محرک تعلیم محمدی

علم کو عام کرنے والوں اور تشنگان علوم کو سیراب
کرنے والوں کو جن برکتوں اور سعادتوں کی بشارتیں آنحضرت صلعم نے دی ہیں وہ
اسلامی کتب خانوں میں روح کی طرح کام کر رہی تھیں اور ان ہی کا یہ اثر تھا کہ

۱۔ Dictionary catalogue ۲۔ classified catalogue
۳۔ Issue

بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور دوسرے بڑے بڑے کتب خانوں میں شائقین علم کو بلا کسی امتیاز کے داخلہ کی اجازت تھی۔ اکثر ذاتی کتب خانوں کے مالک بھی اتنے فیاض تھے کہ انھوں نے اپنے کتب خانوں سے مستفید ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کتب خانوں میں کتابیں مطالعہ کے لئے دی جاتی تھیں اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں اشو بھی کر دیا جاتا تھا۔ بقول اونگا یوڈ علماء اور طلباء کی سہولت کے لئے پبلک کتب خانوں سے دور دراز مقامات تک کتابیں بھیجی جاتی تھیں اس کے لئے کبھی کبھی کوئی رقم ضمانت کے طور پر جمع کرائی جاتی تھی مگر مشہور و معروف اہل قلم کو اس قاعدے سے مستثنیٰ بھی کر دیا جاتا تھا چنانچہ یاقوت مصنف معجم البلدان کو مرو کے ایک کتب خانے سے دو سو کتابیں بلا ضمانت مستعار دی گئی تھیں۔ ایک اندلسی مورخ ابن حیان (متوفی ۷۴۵ھ) کا بیان ہے کہ "جس کتاب کی مجھے ضرورت ہوتی تھی کسی کتب خانہ سے منگوا لیا کرتا تھا"

اجرائے کتب کے متعلق احمد شلبی نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ جب کسی کتاب کے ایک سے زیادہ طلبگار ہوتے تھے تو ان میں جو غریب ہوتا اسے ترجیح دی جاتی تھی۔

اجرائے کتب کے لئے قاعدے اور قانون مقرر تھے جو لوگ ان کی خلاف ورزی کرتے ان پر اخلاقی دباؤ بھی ڈالے جاتے تھے ایسے عربی اشعار ملتے ہیں جن میں کتاب

۱۔ *History of Muslim Education by Ahmad Shalaby Lecturer in History of Islamic Civilization University of Cairo (Darul Kashshaf Beirut. Lebanon - 1954.)*

واپس نہ کرنے والوں پر لعنت و ملامت کی گئی ہے اور طنز کے باریک نشتروں سے ان کے دلوں کو زخمی کیا گیا ہے چنانچہ دسویں صدی ہجری کا ایک شاعر ابن السلام اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

"جو شخص میری کتاب لیکر واپس نہیں کرتا وہ شریف نہیں بلکہ ایک ذلیل اور دغاباز آدمی ہے"

عمارت کتب خانوں کی عمارت کی طرف بھی توجہ کی گئی اور قاہرہ شیراز و قرطبہ کے کتب خانوں کے لئے علیحدہ عمارتیں تعمیر کرائی گئیں۔ جو نہایت وسیع اور شاندار تھیں۔ قاہرہ میں خلیفہ العزیز کا کتب خانہ چالیس کمروں پر مشتمل تھا۔ شیراز میں عضد الدولہ کے کتب خانہ کی عمارت بقول علامہ بشاری بہشت کے نمونے کے موافق بنائی گئی تھی اور اندلس کے خلیفہ حکم کے کتب خانہ کی عمارت شان و شوکت میں کسی طرح قصر شاہی سے کم نہ تھی۔ کتب خانوں کے کمروں کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی۔ کتابیں رکھنے کے کمرے جنھیں آجکل اسٹیک روم (Stack Room) کہتے ہیں۔ دارالکتابت جہاں کاتب کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے۔ دارالمطالعہ جہاں شائقین فرش پر مشرقی طرز سے چار زانو بیٹھکر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے بعض کمرے مجالس علمیہ کے لئے مخصوص تھے۔ گیلریاں کتابیں رکھنے کے کام آتی تھیں۔ ان میں الماریوں کے اندر کتابیں تلے اوپر رکھی جاتی تھیں ان کی ترتیب فن وار ہوتی تھی۔ ہر الماری پر فن کا پرچہ چسپاں رہتا تھا جس پر مضمون کا نام اور مکمل و ناقص کتابوں کا حال بھی درج ہوتا تھا۔ کتب خانے کے کمرے قالین اور دریوں سے آراستہ ہوتے تھے۔ دروازوں اور

کھڑکیوں پر کھلنیں اور پڑے پڑے رہتے تھے۔

تجارت کتب جب کتابی ذوق عام ہوا اور کتابوں کی مانگیں بڑھنے لگیں تو تجارت کتب کی طرف بھی لوگوں کا میلان ہوا۔ بڑے بڑے شہروں میں کتابوں کے تجارتی مراکز قائم ہوئے اور کتابوں کی دلالی کا پیشہ رائج ہوگیا۔ اسلامی تمدن میں یہ پیشہ محترم سمجھا جاتا تھا اور کتب فروشوں کی فہرست میں ابو حاتم سجستانی اور یاقوت حموی جیسے اہل علم کے نام بھی شامل ہیں۔ کتابیں تجارتی مراکز میں نیلام کے ذریعہ فروخت کی جاتی تھیں اور کتب فروشوں اور دلالوں کے پاس زرِ ضمانت رکھ کر بھی انھیں حاصل کیا جاسکتا تھا کتب خانوں کی ترقی کے ساتھ کتابوں کی تجارت بڑھتی رہی چنانچہ تیسری صدی ہجری میں بغداد کے اندر کتب فروشوں کی سو دکانیں تھیں[1] اور چوتھی صدی ہجری میں قرطبہ میں بیس ہزار سے زیادہ تاجران کتب تھے[2]

کاغذسازی کتب خانوں کی توسیع میں کاغذسازی کی ترقی نے بڑی مدد دی۔ اسلام کے اولین دور میں مسلمان چمڑے پر لکھتے تھے آنحضرت صلعم نے کسریٰ کے نام خط چمڑے پر ہی لکھوا کر ارسال کیا تھا۔ مدینہ منورہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں

---

[1] دی گائیڈنس ص ۵۲، اخبار اندلس جلد سوم ص ۹۰ – ایس۔ پی۔ سکاٹ (S.P. Scott) کی ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ (History of the Moorish Empire in Europe) کا اردو ترجمہ مترجم منشی خلیل الرحمٰن — لاہور – ۱۹۲۴ء۔

قرآن شریف کا ایک نسخہ شتر مرغ کی کھال پر اور تفسیر ابن عباس کے اوراق ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے ہیں ان کھالوں کو اتنا پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ کاغذ معلوم ہوتا ہے۔

کاغذ چین میں سائی لون سلہ (Ts'ai LUN) نے ۱۰۵ء میں ایجاد کیا تھا مگر کاغذ کی قسمت مسلمانوں کے ہاتھ میں آکر جاگی انھوں نے اس صنعت کو ترقی دی اس پر کتابیں لکھیں کاغذ کے کارخانے قائم کئے ردی سے کاغذ بنایا اور کاغذ کی صنعت کو یورپ وغیرہ میں پھیلایا۔ اسلامی دنیا میں کاغذ کی صنعت کی بنیاد آٹھویں صدی عیسوی میں سمرقند[۵۲] میں رکھی گئی تھی جہاں سے یہ تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ ہارون رشید کے عہد میں کاغذ سازی کا کارخانہ بغداد میں قائم ہوا تھا جسے صناعۃ الوراقہ کہتے تھے مغرب میں قرطبہ اور شاطبہ کاغذ کی صنعت کے بہت بڑے مراکز تھے اور یہیں سے تمام[۵۳] یورپ میں کاغذ جاتا تھا۔

سلہ Encyclopedia Americana 1954 Edition V.21 P.258

کاغذ سازی کے متعلق ملاحظہ ہو Edwin Sutermeister, Story of Papermaking.

[۵۲] ۷۵۱ء میں زیاد بن صالح نے ترکوں اور ان کے حلیف چینیوں کی متفقہ افواج کو نہر طراز کے کنارے جولائی ۷۵۱ء میں شکست دی تھی۔ اس لڑائی میں بہت سے چینی قیدی آئے جن میں کچھ کاغذ بنانا جانتے تھے ان کی مدد سے عربوں نے سمرقند میں کاغذ کی صنعت کی بنیاد رکھی تھی۔ [۵۳] اس زمانہ میں اسلامی ملکوں سے جو کاغذ یورپ جاتا تھا اس کی نشانی اسکوریال کے کتب خانہ میں ایک کتاب ہے جو عربی کے کاغذ پر گیارھویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے۔

کتب خانوں کا عملہ

کتب خانوں کے عملہ میں سب سے اہم عہدہ مہتمم کا تھا اسے ناظم یا خازن بھی کہتے تھے موجودہ زمانہ میں لائبریرین کے جو فرائض ہیں تقریباً وہی کام اس زمانہ میں مہتمم کے ذمہ تھے۔ کتب خانے کے تمام عملے کی نگرانی، کتابوں کی فراہمی، کتابوں کی ترتیب و نگہداشت اور ان کی فہرست مرتب کرنا غرض جملہ امور کا انتظام مہتمم کے سپرد تھا علمی کاموں میں لوگوں کی رہنمائی کرنا بھی اسی کے فرائض میں شامل تھا ان سارے کاموں کی تکمیل کے لئے مہتمم کے ایک یا اس سے زیادہ مددگار ہوتے تھے جن کی تعداد کتب خانوں کی وسعت پر منحصر تھی چونکہ مہتمم کا عہدہ نہایت اہم تھا اس لئے اس عہدہ پر ان ہی اشخاص کو مقرر کیا جاتا تھا جو علمی و انتظامی قابلیت رکھنے کے ساتھ صحیح کتابی ذوق بھی رکھتے تھے اکثر کتب خانوں کے مہتمم بڑے صاحب علم و فضل تھے مثلاً بغداد کے کتب خانہ مستنصریہ کا ناظم مورخ ابن الساعی[1]، فاطمی خلیفہ العزیز کے کتب خانہ کا مہتمم مشہور مصنف علی بن محمد الشابشتی، قاہرہ میں مدرسہ محمودیہ کے کتب خانہ کا مہتمم ابن حجر عسقلانی بخارا میں نوح بن منصور کے کتب خانہ کا مہتمم بوعلی سینا، وزیر ابوالفضل ابن عمید کے کتب خانہ کا مہتمم مورخ ابن مسکویہ اور اندلس کے خلیفہ حکم ثانی کے کتب خانہ کا مہتمم اس کا بھائی عبدالعزیز[2] تھا۔

کاتب ہر کتب خانہ میں کاتب کا ہونا بھی لازمی تھا، بغداد، قاہرہ،

---

[1] اورنٹکا نیشو ص ۲۷ [2] اخبار الاندلس جلد سوم ص ۵۱۱

شیراز اور قرطبہ کے کتب خانوں میں بے شمار کاتب کام کرتے تھے صرف طرابلس
کے کتب خانہ میں ایک سو اسی[1] کاتب تھے جن میں سے تیس رات و دن لکھنے میں
مشغول رہتے تھے کتابوں کی نقل کے سلسلہ میں صحت کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا
چنانچہ کاتبوں کے تیار کئے ہوئے نسخوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقابلہ نویس
اور مصحح مقرر تھے جو نقل کردہ کتابوں کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک
نقطے کی پوری تصحیح کرتے تھے۔

فن کتابت کی ترویج و ترقی کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے سلاطین و امراء
کی سرپرستی اور قدردانی کی بدولت اسلامی دنیا میں بے شمار کاتب و خطاط پیدا
ہو گئے تھے انہیں نساخ اور وراق بھی کہتے تھے یعنی لفظ وراق کو کتب فروشوں
کاغذ بنانے اور بیچنے والوں اور کتابوں کی ورق گردانی کرنے والوں کے لئے بھی
استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ بغداد میں کتب فروشوں کے بازار کو سوق الوراقین
اور کاغذ کے کارخانہ کا نام صناعۃ الوراقۃ تھا۔

اس زمانہ میں وراقیت اور نساخیت کا نظام ایسا پھیلا ہوا تھا کہ کتب خانوں
کے علاوہ اکثر شائقین علم کے پاس بھی کاتب رہتے تھے کتابت اور خطاطی کا کام کچھ لوگ
اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر اعزازی طور پر کرتے بعض مذہبی کتابوں کی کتابت
کار خیر سمجھکر کرتے تھے اور بہت سے لوگوں نے اسے روزی کمانے کا ذریعہ بھی بنا لیا تھا ابوسعید[2]
سیرافی (متوفی ۳۶۸ھ) کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بیس صفحات کی اجرت دس درہم
یعنی چار روپے لیتے تھے یہ حوالی بغداد میں قاضی تھے کتابت کے پیشہ پر زندگی

۱؎ ادبی نگارشات ص ۲۶
۲؎ Studies Islamic & Oriental by Qazi Ahmad Mian Akhtar, p. 11 (Lahore, Mohd Ashraf, 1945)

بسر کیا کرتے اور قضاۃ کی خدمات اعزازی طور پر انجام دیتے تھے۔

خوشنویسی | کاتبوں کے ذکر کے ساتھ خوشنویسی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہیئے یہ فن مسلمانوں کے کتابی اور جمالیاتی ذوق کی وجہ سے خوب پھلا پھولا اور مسلم تمدن کا جزو بن گیا۔ کتابوں کے علاوہ شاہی مہروں، فرامین، مسجدوں، مقبروں اور دوسری عمارتوں پر کتابت کے لیئے خوشنویسی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تمام اسلامی ممالک میں یہ فن رائج ہو گیا مورخ اسکاٹ کا بیان ہے کہ خوش قلم ہونے میں مسلمانان اندلس تمام اسلامی ممالک سے بڑھے ہوئے تھے خط کی خوبی، وصل، فصل اور دوسری وصل اس درجہ کی تھی کہ آج کل کے نہایت لائق کمپوزیٹر بھی وہ لطافت پیدا نہیں کر سکتے" خوشنویسی کو تمام اسلامی ملکوں میں ایسا ہی عروج حاصل ہوا۔ خواص و عوام سب نے مل کر اس کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا دیا۔

خط کی قسمیں | ظہور اسلام کے وقت عرب میں خط کوفی رائج تھا۔ ابن مقلہ متوفی ۳۲۸ھ/۹۳۹ء نے چھ عربی خط: ثلث، نسخ، محقق، ریحان، رقاع، توقیع، ایجاد کیئے پھر خط تعلیق[1] ایجاد ہوا جو پیچ در پیچ تحریر کیا جاتا تھا اس کے بعد خواجہ علی تبریزی نے نسخ اور تعلیق کو ملا کر خط نستعلیق[2] ایجاد کیا جو اپنی خوبصورتی اور نفاست میں تمام خطوں پر سبقت لے گیا مگر اس کے لکھنے میں کافی وقت لگتا تھا اور بڑی محنت کرنی پڑتی تھی چنانچہ روزمرہ کے کاموں کے لئے خط شفیعا ایجاد ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں خط شکست رائج ہوا تھا۔ یہ دونوں خط

---

[1] خواجہ میر علی تبریزی امیر تیمور (متوفی ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) کا ہم عصر تھا۔

[2] تذکرہ خوشنویساں، از مولانا غلام محمد ہفت قلم ص ۲۴ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۱۰ء)

دفاتر، عدالتوں اور ذاتی خط وکتابت کے لئے استعمال کئے جانے لگے. فن خوشنویسی میں اکثر کاتبوں کا جذب وشوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ قلم سے بھی بے نیاز ہوگئے تھے اور ناخن سے قلم کا کام لینے لگے تھے اس طرح ایک خط ایجاد ہوا جو خط ناخن کہلاتا ہے

نقاشی و مصوری

مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق نے کتابت کے فن پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان سرحدوں سے گذر کر کتابت میں حسن وزیبائش پیدا کرنے کے طریقے بھی اختیار کئے جانے لگے بقول مولانا عبدالحلیم شرر "اب کتابت خطاطی کی حدود سے نکل کر نقاشی کی قلمرو میں داخل ہوگئی اور اس میں مصورانہ تزئین بھی شامل ہوگئیں" اس طرح ایک دبستان ظہور میں آیا جس میں خوشنویسی، نقاشی اور مصوری نے ساتھ ساتھ ترقی کے مدارج طے کئے۔

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اسلام نے تصویریں بنانے کو ممنوع قرار دیا ہے آنحضرت صلعم کا یہ فرمان کہ یُصوّرون وَلا یخلقون یعنی وہ تصویریں بناتے ہیں اگرچہ خالق بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کررہا ہے اسی لئے ایک عرصہ تک مسلمان کتابوں میں تصویریں بنانے کی طرف راغب نہ ہوئے اسلام کے ابتدائی دور میں خطاطی اور کتابت سے مصوری کا کام لیا جاتا تھا حسن اتفاق سے عربی حروف کی ساخت مصورانہ صنعتیں ظاہر کرنے کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی چنانچہ ان حروف کو سجا کر لکھنے کے وہ اسلوب اختیار کئے گئے جن سے کتابوں اور عمارتوں وغیرہ کی تزئین میں چار چاند لگ گئے خوشنما پھول بوٹوں کے درمیان اللہ محمد اور قرآنی آیات وغیرہ کو مختلف رنگوں میں اس طرح آراستہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق کا دنیا پر

سکہ بیٹھ گیا عربی حروف کی خوبصورتی اور دلکشی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے عیسائی صناعوں کو بھی اتنا مسحور کر لیا کہ وہ اپنی مذہبی چیزوں اور عمارتوں کی تزئین کے لئے انھیں استعمال کرنے لگے اور بقول مؤرخ اسکاٹ آیات قرآنی کلیساؤں میں داخل ہو گئیں۔ اے۔ ایچ کرسٹی نے نویں صدی کی ایک آئرستانی صلیب کی نسبت لکھا ہے کہ اس پر خط کوفی میں بسم اللہ تحریر تھا[1]

اسلامی دنیا میں کتابی تصویر کشی کا فن ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) سے شروع ہوتا ہے اس کا قدیم ترین نمونہ عربی ادب کی کتاب مقامات حریری کا وہ مصور نسخہ ہے جو پیرس کے بلیو تھک نیشنال[2] میں محفوظ ہے یہ ۱۲۵۷ء میں یحییٰ بن محمود واسطی نے تیار کیا تھا اور شیفر حریری[3] کے نام سے مشہور ہے اس وقت سے سولھویں صدی عیسوی تک یہ فن اسلامی ممالک میں عروج پاتا رہا تیمور اور اس کی اولاد کے عہد میں اس نے نمایاں ترقی کی اور ہرات بخارا سمرقند وغیرہ اس فن کے خاص مراکز بن گئے۔ ایران کے صفوی خاندان اور ہندوستان کے مغل خاندان کے بادشاہ مصوری کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے ان کے عہد میں "ایرانی مصوری" اور "مغل مصوری" کے مخصوص دبستان کھلے اور بے شمار مصور پیدا ہوئے جن کی تیار کی ہوئی کتابوں سے کتب خانوں کی زیب و زینت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس موقع پر کمال الدین بہزاد کا نام لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تیموری خاندان کے آخری مقتدر بادشاہ سلطان حسین مرزا

---

[1] ثقافت پاکستان مرتبہ شیخ محمد اکرام ص ۱۶۳ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی
[2] *Bibliothèque Nationale*
[3] *Sheffers Hariri*

متوفی ۵۰۶ (ء) کے دربار کا یہ گل سرسبد مختصر تصاویر کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ شبیہ عبازی کو ایک مستقل صنف کا رتبہ اسی مصور نے دیا تھا بہزاد کے فنی کمال کے بہترین نمونوں میں سعدی کی بوستان اور خمسۂ نظامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ دونوں علی الترتیب مصر کے شاہی کتب خانہ اور برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔

یہ باب تشنہ رہے گا اگر ابن بواب (متوفی ۴۱۳ھ/۱۰۲۲ء یا ۴۲۳ھ) اور یاقوت مستعصمی (متوفی ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء) کے نام نہ لئے جائیں جو عربی خوشنویسی کے اساتذہ کہے جاتے ہیں۔ خط نستعلیق کے استادوں میں شاہ عباس صفوی کا درباری خطاط میر عماد الحسینی اور اس کا شاگرد و بھانجا آقا عبد الرشید دیلمی نہایت ممتاز ہوئے میر علی تبریزی کے طرز پر لکھنے والوں میں محمد بن اسحاق شہابی نے خاص نام پیدا کیا اس کے قلم کی نفحات الانس (مولانا جامی) ایران میں اور دیوان شاہزادہ کامران ہندوستان (خدا بخش لائبریری بانکی پور) میں موجود ہیں۔

فن خوشنویسی کی مسلم فرماں رواؤں نے بڑی سرپرستی اور قدردانی کی اکثر بادشاہ خود اچھے خوشنویس تھے اس فن کے ماہرین میں مشائخ، اور

---

۱ میر عماد ۱۰۲۴/۱۶۱۵ء میں قتل کیا گیا اس کی لکھی ہوئی جامی کی تحفۃ الاحرار استنبول میں ہے اس کی تین وصلیاں کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہیں (ملاحظہ ہو فہرست نمائش گاہ مخطوطات و نوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مرتبہ مختار الدین احمد ۔ ۱۹۵۳ء)۔

صحاح جوہری
مکتوبہ ۶۴۸ھ

اور علماء و امراء کے نام بھی ملتے ہیں۔ محدث ابن جوزی اور جوہری مصنف صحاح خطاطی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے وزیر ابوجعفر ابن عباس (اندلسی) بڑے پایہ کا خوشنویس تھا۔ اشبیلہ (اندلس) کی ایک خاتون صفیہ خطاطی میں اپنا کوئی ہمسر نہ رکھتی تھی مسلمانوں کا سب سے بڑا ماہر طبیعیات ابن الہیثم[1] فاس کا مشہور ادیب ابن عبد اللہ معجم البلدان کا مصنف یاقوت نہایت باکمال کاتب تھے چھٹی صدی ہجری میں الجوینی ایسا بے نظیر کاتب گذرا ہے کہ اسے فخر الکتاب کا لقب حاصل تھا۔ ہندوستان کے مسلم عہد میں جو باکمال خطاط ہوئے ہیں ان کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا اس فن سے ہند کے مغل بادشاہوں کو جو ذاتی لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہجہاں کو ملک خطاطی کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

روشنائی | ظاہر ہے کہ خوشنویسی اور اس کا حسن بہت کچھ روشنائی پر موقوف ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے مختلف قسم کی روشنائی بنائی جاتی تھی اور اسے کیمیاوی ترکیب سے نہایت چمکدار اور پائدار کر دیا جاتا تھا مسلمانوں نے روشنائی کے عالم میں بھی بڑا تنوع دکھایا وہ مختلف چیزوں سے روشنائی کا کام لیا کرتے تھے کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری کی مشہور لغت کا نسخہ ۸۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے اس کی کتابت شیر خرما کی روشنائی سے کی گئی ہے۔

---

[1] جارج سارٹن (George Sarton) نے اپنی کتاب تاریخ سائنس جلد اول (Introduction to the history of Science) میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں ابن الہیثم سب سے بڑا ماہر طبیعیات تھا۔

حاشیہ نگار اور جلد ساز

کتب خانوں کے عملے میں مہتمم اور کاتبوں کے علاوہ حاشیہ نگار، جلد ساز اور دیگر ملازمین بھی ہوا کرتے تھے حاشیہ نگار کتابوں کے سرورق اور ان کے اندرونی صفحات کے حاشیے طرح طرح کے گل بوٹوں سے سجاتے، ان پر سونے کا کام کرتے اور رنگ برنگ کی میناکاری سے مزین کر کے انھیں نہایت دیدہ زیب بنا دیتے جلد ساز صرف پرانی اور نئی کتابوں کی مرمت اور جلد بندی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ انکی تزئین بھی کرتے تھے اس مد پر بھی بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا مذہبی اور نادر کتابوں کی ایک ایک جلد پر ہزاروں روپیہ تک صرف ہو جاتے تھے کتابوں کی آرائش میں موتی، ہاتھی دانت، سیپ، سونے چاندی کے اوراق اور مختلف قسم کے جواہرات کو کام میں لایا جاتا تھا۔

غرض کتابی فنون کی اسلامی ممالک میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوئی کہ جب کبھی اس عہد کی کوئی کتاب نظر سے گذرتی ہے تو اس کی آب و تاب دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت، نقاشی اور جلد بندی آج ہی کی گئی ہے۔
بقول شاعر۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے !
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی !

ایک کتب خانہ کی قلمی تصویر

مسلمانوں نے اپنے کتب خانہ کی عمارت، کتابوں کی نقاشی، نقل نویسی اور جلد بندی کا جو اہتمام کیا تھا اُس کا اندازہ لگانے کے لئے مورخ اسکاٹ کا بیان[1] ملاحظہ ہو۔

"اندلس کے خلیفہ حکم ثانی کے کتب خانہ کی عمارت شان و شوکت میں قصر شاہی سے کم نہ تھی اس کا فرش نہایت قیمتی سنگ مرمر کا تھا۔ دیواریں اور چھتیں بہترین سنگ خام کی جن پر سنگ سبز اور سرخ کی پچی کاری تھی۔ الماریاں نہایت قیمتی صاف شفاف لکڑیوں کی تھیں۔ ان میں بعض لکڑیوں کو اس لئے انتخاب کیا گیا تھا کہ وہ گل کی تھیں اور بعض کو اس لئے کہ ان سے نہایت لطیف خوشبو نکلتی تھی۔ ہر ایک الماری پر سونے کے پتروں سے لکھا ہوا تھا کہ اس الماری میں کس مضمون کی کتابیں ہیں۔ جگہ جگہ دیوار در پر مختلف لوگوں کے اقوال سنہرے حروف میں لکھے ہوئے تھے تاکہ اُن کو دیکھ کر لوگوں میں علم کا شوق اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کے قدم بقدم چلنے کا خیال پیدا ہو۔ دارالکتابت میں ایک فوج کی فوج کاتبوں اور جلد بندوں کی مقرر تھی۔ بہترین کتابوں پر سونا چڑھایا جاتا تھا اور انکو نقش و نگار سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس صنعت میں وہ لوگ ایسی کاریگری دکھاتے تھے کہ بیشک انکی نقل نہ ہو سکی اور نہ ہو سکے گی"

---

[1] اخبار الاندلس ج ۔ ا ص ۶۷۵

کتب خانوں کی بربادی!

لیکن یہ لاثانی کتب خانے زمانہ کی دست بُرد سے نہ بچ سکے اور رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو گئے لیکن آج بھی اُن کی شان یہ ہے کہ ان ذکر کے بغیر دنیا کے کتب خانوں کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی دراصل اسلامی کتب خانوں کی ترقی اور ان کا تنزل مسلمانوں کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ رہا جن کی بربادی کے خاص اسباب سلطنتوں کا انقلاب، خانہ جنگیاں اور فاتحین کی علم دشمنی و تعصب تھے۔

کہا جاتا ہے کہ کتابوں کے چار دشمن ہیں۔ آگ۔ پانی کیڑے اور انسان۔ ان میں سب سے بڑا دشمن انسان ہے اس لے اسلامی کتب خانوں کے قیمتی ذخیرے جس بے دردی کے ساتھ آگ اور پانی کی نذر کر دئے اس کی المناک داستان آئندہ صفحات میں پیش کی گئی ہے بہر حال بہت سے اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے اور ان کے نوادر اِدھر اُدھر بکھر گئے مگر ان کے علمی احسانات کی صدائے بازگشت آج تک آرہی ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ مشرق اور مغرب نے بغداد اور قرطبہ کے کتب خانوں اور درس گاہوں سے جو خوشہ چینی کی تھی اسی کی بدولت موجودہ علمی و تہذیبی ترقیوں کی بنیاد پڑی ہے۔

قاشی اور جلد سازی کا ایک نمونہ سرورق قرآن مجید مُطلّا و مُذہّب

حصۂ اول

ممالکِ اسلامیہ

کے

کتب خانے

مدینۂ منوّرہ

مسلمانوں نے بغداد، مصر، اندلس، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں جو مدرسے اور کتب خانے قائم کئے وہ اصلاً مدینہ ہی کے نورِ علم کی تجلیاں تھیں اس شہر کی آغوش میں نہ صرف اسلامی علوم نے پرورش پائی بلکہ یہاں کی سرزمین سے وہ تعلیمی اور تمدنی تحریک اٹھی جس نے دنیائے علم و تمدن میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ مدینہ میں مسجد نبوی صرف عبادت خانہ نہ تھی بلکہ ایک یونیورسٹی کا کام بھی انجام دیتی تھی۔ دنیا میں یہ پہلی عوامی درس گاہ ہے جس کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہاں عبادت کے ساتھ تعلیم و تدریس کا ہونا مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا وہ جہاں گئے انھوں نے مساجد کے پہلو میں مدارس قائم کئے عبادت اور علم کے اس امتزاج نے مسلم تہذیب کو نہایت جامع، مفید اور دلآویز بنا دیا۔

مدینہ کے معدنِ علم سے بڑے بڑے قاضی، مفتی، قاری، فقیہ اور محدث نکلے۔ اگر ان سب کے نام گنائے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے۔ عہدِ نبوت میں ہی یہ شہر علم کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اس زمانہ کے تیس ہزار صحابہ میں سے سو افراد مسجد نبوی کے صفہ (چبوترہ) پر شب و روز طلبِ علم میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے بعد بھی یہ علم کا مرکز رہا یہاں جو حلقہ ہا

سے حیات مالک از سید سلیمان ندوی ص ۳۳، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۲۰ھ

درس قائم ہوئے ان میں حضرت امام مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ) کی مجلس درس ایک خاص امتیاز رکھتی تھی جس میں بقول سید سلیمان ندوی تمام و خاص کی تمیز نہ تھی ہارون نے جب درس کی شرکت کا ارادہ کیا تو کہا کہ "عام لوگوں کو باہر کر دیجئے" امام نے فرمایا کہ "شخصی منفعت کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا"[1]

کتابوں کے اعتبار سے بھی مدینہ علمی دنیا میں بڑی فضیلت رکھتا ہے اسلام کی سب سے پہلی کتاب قرآن مدینہ میں مرتب ہوئی، احادیث نبوی اور علم فقہ کے مجموعے یہاں تدوین ہوئے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری یہیں لکھی اور امام مالک کی موطا یہیں مرتب ہوئی غرض تصنیف و تالیف اور دوسرے ذرائع سے علم کے اس مخزن میں نسلاً بعد نسلاً کتابیں جمع ہوتی رہیں اور آج بھی یہاں کے علمی خزانوں میں صدیوں پرانی کتابوں کے ایسے نادر نسخے موجود ہیں جن سے ارباب علم کی تشنگی دور ہوجاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ[2] میں مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ کی "کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی کے اچھل پڑا کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی وہ یہاں آج پوری ہوگئی۔" "آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوۃ امام بیہقی، معرفت اصول الحدیث امام حاکم، شرح سنن ابی داؤد ابن ارسلان، شرح بخاری للکرمانی

---

[1] حیات مالک: سید سلیمان ندوی ص ۴۳   [2] رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۸۔ ص ۱۰ ۴۱۔

شرح بخاری لابن بطال تمہید شرح موطا لابن عبد البر البیان لاحکام القرآن للموزعی الیمنی۔ زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی تفسیر ابن ابی حاتم نزہۃ الحکم شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں۔

مسلم سلاطین و امراء نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جو خدمتیں کیں اور جس طرح ان کا خادم کہلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھا[1] اسی کی یادگار کتب خانہ مدرسہ محمودیہ ہے جسے ترکی سلطان محمود نے قائم کیا تھا۔ آج سے سو برس پہلے ایک ترکی عالم شیخ الاسلام عارف حکمت بے نے بھی مدینہ میں ایک کتب خانہ کھولا تھا جو اب تک موجود ہے اس کے ذخائر میں ایک ہزار اکسٹھ سال پرانی کتاب تفسیر ابن عباس کے چند اوراق ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے ہیں جن کا سنہ کتابت ۳۱۹ھ ہے اس کے علاوہ ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل[2] مکتوبہ ۳۹۵ھ اور ابن ابی عون اسحاق بغدادی کی کتاب تشبیہات[3] (۳۲۲ھ) بھی کتب خانہ عارف حکمت بے کی نایاب کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال مصنفہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے صفحہ ۳۱۲ پر ترکی سلطان سلیم کی نسبت لکھا ہے کہ ایک بار جمعہ کی نماز کا خطبہ پڑھتے ہوئے خطیب نے سلیم کیلئے "مالک الحرمین الشریفین" کے الفاظ کہے تو سلیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور خطیب سے کہا میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حرمین شریفین کا مالک ہوں۔ میرے لئے یہی فخر کچھ کم نہیں ہے کہ میں "خادم الحرمین الشریفین" کہلاؤں۔ [2] کتاب الاوائل کے متعدد نسخے ہندوستان میں بھی ملتے ہیں۔ ٹونک کے کتب خانہ میں ایک قدیم نسخہ موجود ہے اس کی چند نقلیں علی گڑھ اور رامپور میں بھی ہیں۔ افسوس کہ اس اہم کتاب کی ترتیب و تصحیح کیطرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ [3] اس کتاب کی تصحیح و اشاعت کی سعادت ہندوستان کے ایک فرزند ڈاکٹر عبد المعید خاں اڈیٹر اسلامک کلچر کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے اسے متعدد نسخوں کی مدد سے مرتب کرکے جامعہ کیمبرج میں ڈاکٹریٹ کیلئے پیش کیا۔ یہ کتاب گب میموریل سیریز (لندن) کیطرف سے شائع ہو چکی ہے۔

بغداد

دنیائے اسلام میں بغداد وہ اولین مرکز ہے جہاں **پہلا عظیم الشان کتب خانہ** **بیت الحکمت** خلیفہ ہارون الرشید (متوفی ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) نے قائم کیا تھا جس کا فیض ہلاکو کے حملۂ بغداد (تیرھویں صدی عیسوی) تک جاری رہا کتب خانوں کی تاریخ میں بیت الحکمت ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب گھر نہ تھا بلکہ **پہلا پبلک کتب خانہ** تھا جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا گیا تھا اس بے نظیر کتب خانہ میں عربی، فارسی، سریانی، قبطی اور سنسکرت زبانوں کی دس لاکھ کتابیں تھیں۔[1]

ہارون رشید اپنے دادا ابو جعفر منصور[2] کی طرح عالم اور علم و فضل کا مربی تھا اس نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کیلئے بغداد میں بیت الحکمت کی بنا ڈالی تھی اس کے ایک حصہ میں لائبریری اور دوسرے میں ترجمہ[3] کا شعبہ تھا۔ ہارون نے بلا لحاظ مذہب و ملت بڑے بڑے ماہر فاضلوں کو ترجمہ کے کام پر مقرر کیا تھا ایسی ہی بے تعصبی اس نے کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی میں بھی دکھائی۔ کتابوں کے حصول میں کسی ملک اور کسی علم کی کوئی قید روا نہ رکھی۔ کتابیں جمع کرنے کے لئے اس نے مختلف ممالک میں اپنے قاصد بھیجے ہندوستان سے بھی طب اور ہیئت کی کتابیں منگوائیں جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ جو ملک فتح ہوتا تھا وہاں کا کتب خانہ جلایا نہیں جاتا تھا بلکہ وہ پایہ تخت میں منگوا لیا جاتا تھا اور ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم ص ۱۰۴۵ [2] علوم عرب مصنفہ جرجی زیدان ص ۲۳۶

[3] سب سے پہلے منصور نے قدیم کتابوں کے ترجمہ کی طرف توجہ کی۔ بقراط، جالینوس اور بطلیموس کی کتابیں عربی میں منتقل کرائیں اس کے عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ شروع ہوا منصور نے ۱۴۵ھ/۷۶۲ء میں بغداد کی بنیاد رکھی اور اسکی تعمیر میں تقریباً دو کروڑ دینار صرف کئے بیت الحکمت کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

چنانچہ بلادِ روم کے انقرہ اور عموریہ کی فتح کے موقع پر جب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ مالِ غنیمت میں ہارون کو دستیاب ہوا تو اس نے کتابوں کو حفاظت کے ساتھ بغداد بھیج دیا اور اپنے عیسائی معالج یوحنا کو اُن کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

جس طرح محنت اور توجہ سے ہارون رشید نے کتابیں جمع کی تھیں اسی طرح اس نے بقول مصنف الہارون جگہ جگہ رصد خانے، لائبریریاں، مدارس علمیہ اور سائنٹفک تحقیقات کے لئے تجربہ گاہیں قائم کیں جن میں دن رات مہندس اور سائنسدان کیمیا وغیرہ کے نئے نئے تجربات اور جدید تحقیقات میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور عہدِ ہارون کا بغداد علم و فضل کا ایسا منبع بن گیا تھا کہ ہر طرف سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے کشاں کشاں بغداد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، اس نے علوم دنیوی اور علوم دینی دونوں قسم کے علوم کی ایک زبردست یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر لی تھی یہاں بڑے بڑے محدثین، قرار، فقہا، لغت، آدابِ العرب اور صرف و نحو کے امام موجود تھے جنہوں نے بڑی بڑی مسجدوں میں درس کے سلسلے قائم کر رکھے تھے ان مدارس میں ہزاروں لوگ علم حاصل کرتے تھے جب تک کوئی شخص بغداد آکر علم حاصل نہ کرتا تھا اور یہاں کے علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرتا تھا اس وقت تک نہ اسے شہرت نصیب ہوتی تھی اور نہ ہی اسے علماء کے زمرے میں شمار کیا جاتا تھا۔

مامون رشید — بغداد کی یہ علمی سرگرمیاں مامون (متوفی ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کے عہد میں بہت بڑھ گئی تھیں خلفائے عباسیہ میں مامون سب سے زیادہ صاحبِ علم و فضل تھا اسی کے عہد میں بڑے بڑے کتب خانے اور مدرسے کھلے شماسیہ میں عظیم الشان رصد خانہ قائم ہوا فلسفہ، بیت

(بقیہ صفحہ ۷۰) دارالترجمہ میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کی مفصل فہرست حاجی خلیفہ نے کشف الظنون اور ابن ندیم نے فہرست میں دی ہے۔ ۱؎ مامون کے عہد میں بغداد کی کل آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی اور [illegible]

ریاضی اور ادب کی بڑی ترقی ہوئی گو مامون کا خاص میلان فلسفہ کی طرف تھا لیکن اس نے دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ کی۔ فرا نحوی[1] سے کتاب الحدود بڑے اہتمام سے لکھوائی اور اس کی بہت سی نقلیں کرا کے کتب خانوں میں بھیجیں

کتابوں کے تراجم کے سلسلہ میں مامون کے عظیم الشان کارنامے

کتب خانوں کی ترقی کا بہت بڑا سبب یہ ہے اس نے فارسی، قبطی، یونانی اور شامی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے قیصر روم سے ارسطو کی تصنیفات منگائیں اور ان کے ترجمے کا کام یعقوب بن اسحٰق کندی[2] کے سپرد کیا مامون نے بقول جرجی زیدان ترجمہ کرانے میں اتنی سخاوت دکھائی کہ جس قدر ترجمہ کیا جاتا اس کے ہم وزن وہ سونا دیتا اور ہر ایک کتاب پر جو ترجمہ کی جاتی تھی اپنی مہر و دستخط ثبت کر دیتا تھا۔

---

[1] فرا یحییٰ بن زیاد (متوفی ۲۰۷ھ) نحو و لغت اور فنون ادب کا امام تھا کہا جاتا ہے کہ اگر فرا نہ ہوتا تو لغت عرب بھی نہ ہوتی فرا کے کتاب الحدود لکھنے کا جو حال علامہ شبلی نے المامون میں لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے "اس کے لئے ایوانِ شاہی کا ایک کمرہ خالی کیا گیا اور خدام و ملازم مقرر کئے گئے کہ فرا کو کسی ضرورت کے لئے کچھ کہنا نہ پڑے صرف نماز کے وقت آدمی اطلاع کرتا تھا کہ وقت ہو گیا بہت کاتب اور ناقلین اس کام کے لئے معین ہوئے کہ جو کچھ فرا بتاتا جائے لکھتے جائیں دو برس کی محنت میں یک نہایت بسیط کتاب تیار ہوئی راوی کا بیان ہے کہ جو شائقین فن اس کے لکھنے کے لئے ہر روز فرا کی خدمت میں حاضر رہتے تھے میں نے ان کا شمار کرنا چاہا تو نہ کر سکا قاضیوں کو گنا تو اسی تھے"

[2] یعقوب بن اسحٰق کندی طب، حساب، منطق، موسیقی، فلسفہ میں اتنا ماہر تھا کہ ارسطو کا ہم پلہ کہا جاتا ہے اس کی کتابوں اور رسالوں کی تعداد دو سو بیاسی کے قریب ہے۔

مامون کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کرکے کتابیں فراہم کیں مصر، شام، ایران اور ہندوستان وغیرہ سے کتابیں منگوانے کا خاص بند و بست کیا بیت الحکمت کے مہتمم و افسر حجاج بن البطریق اور سلما وغیرہ کو خاص طور پر روم بھیجا کہ وہ اپنے پسند کی کتابیں انتخاب کرکے لائیں اس زمانہ میں کتابیں جمع کرنے کا شوق اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ ایک عیسائی فلاسفر قسطا بن لوقا خود اپنے شوق سے روم گیا اور وہاں سے کتابیں تلاش کرکے لایا حنین بن اسحاق نے کتابوں کی فراہمی میں جو دقتیں اٹھائیں ان کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ کتاب البرہان کی تلاش میں جزیرہ فلسطین، مصر، اسکندریہ اور تمام ممالک شام میں پھرا لیکن صرف نصف مقالہ دمشق میں دستیاب ہوا اس طرح مامون کے عہد میں ہر قسم کی نایاب کتابیں بغداد میں جمع ہوگئی تھیں اور یہاں کتابوں سے لدے ہوئے اونٹ برابر آتے رہتے تھے۔ بقول حالی:۔ حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر!

چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

بیت الحکمت کی توسیع

اس جانفشانی سے جو علمی سرمایہ مہیا کیا گیا اس سے بیت الحکمت کی بےحد توسیع ہوئی لاکھوں کتابیں تو اس میں پہلے سے ہی جمع تھیں اب قدیم علوم کا کوئی سرمایہ ایسا باقی نہ رہا جو اس کتب خانہ میں نہ ہو یہاں وہ تمام کتابیں موجود تھیں جو اس وقت تک اسلامی دنیا میں تصنیف و تالیف ہو چکی تھیں۔ زمانہ قدیم کے نوادر میں آنحضرت صلعم کے دادا عبد المطلب کا ایک رقعہ تھا جو چمڑے[1]

[1] رسائل شبلی ص ۳۲۔

پر لکھا ہوا تھا بطلیموس کی تصنیف مجسطی تھی جس کا ترجمہ عربی میں کرایا گیا تھا اور نوشیر وان کے وزیر کی ایک بے مثل تصنیف تھی جو ایران سے منگا لی گئی تھی۔[۱]

بیت الحکمت کا عملہ

بیت الحکمت کی نگہداشت اور نگرانی کے لئے مہتمم اور دیگر ملازمین مقرر تھے کتابوں کی نقلوں اور ترجموں کے لئے کاتب اور مترجمین ملازم تھے جلدبندی کے واسطے اس عہد کا مشہور جلدساز ابن ابی الحریش مامور تھا بیت الحکمت کے عملہ میں مسلمانوں کے علاوہ پارسی، عیسائی، یہودی اور ہندو بھی شامل تھے ان میں حنین بن اسحاق، حکیم دوبان، یوحنا بن ماسویہ، قسطا بن لوقا، سہل بن ہارون اور ابوجعفر یحییٰ بن عدی بہت مشہور ہیں اکثر عملہ کی تنخواہیں آج کل کے حساب سے ڈھائی ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار تک تھیں[۲] کہا جاتا ہے کہ بیت الحکمت کے قیّم کی حیثیت سے محمد بن موسیٰ[۳]

۱؎ اس تصنیف کا پتہ ماموں کو بقول مصنف المامون ہندوستان کے ایک حکیم دوبان نے بتایا تھا جسے ہندوستان کے ایک راجہ نے ماموں کی خدمت میں بھیجا تھا اس حکیم کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ایوان کسریٰ میں ایک صندوق مدفون ہے جس میں نوشیرواں کے وزیر کی ایک نہایت بے مثل تصنیف چھپا کر رکھی گئی ہے چنانچہ یہ صندوق منگایا گیا اس میں دیبا کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا تقریباً سو ورق کا ایک رسالہ ملا ماموں نے اس کا ترجمہ سنا تو نہایت متاثر ہوا۔ ۲؎ المامون از علامہ شبلی ص ۱۶۸ (دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۳۶ء) ۳؎ مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ برہان دہلی جلد ۵۴ ص ۱۷۴

خوارزمی نے بیش بہا خدمات انجام دیں یہ علم جبر کا موجد تھا اس نے پہلے پہل اس علم کو علم حساب سے نکال کر علیحدہ صورت میں وضع کیا اور مامون کی فرمائش پر کتاب الجبر والمقابلہ لکھی جو اس فن پر اسلام میں پہلی کتاب ہے۔

بغداد میں کتب خانوں کی کثرت ہارون رشید اور اس کا بیٹا مامون رشید کتب خانوں کی تاریخ میں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کی علم دوستی کے اثر سے کتابیں جمع کرنے کا شوق تحریک کا جامہ پہن کر عوام میں پھیل گیا تھا بغداد کے ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود تھا۔ امراء، وزراء اور اصحاب ذوق نے بیت الحکمت کے نمونہ پر کتب خانے قائم کرکے اس تحریک کو مزید تقویت پہونچائی تھی۔

امراء میں سب سے بڑا کتب خانہ یحییٰ بن خالد برمکی کا تھا اس میں عربی یونانی قبطی ہندی اور فارسی کتابیں جمع تھیں۔ ابوعثمان بن عمر یحییٰ الخطاط کا بیان[1] ہے کہ جس قدر کتابیں یحییٰ کے کتب خانہ میں تھیں کسی بادشاہ کے پاس اس قدر نہ ہوں گی۔ ہر کتاب کے تین تین نسخے موجود تھے نامی خوشنویسوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں تھیں اور اس وقت کی یہ مشہور بات ہے کہ اگر کوئی نایاب کتاب فروخت ہوتی تو اول یحییٰ کو دکھلائی جاتی تھی کیونکہ اس کے ایک کے ہزار درہم دینے والا صرف یحییٰ برمکی تھا خلیفہ ہارون رشید کی لائبریری میں اکثر مشہور کتابیں جو باعث زیب و زینت تھیں وہ یحییٰ کے کتب خانہ کی تھیں۔ یحییٰ ہارون رشید کا محبوب وزیر تھا اس کے بعد اس کا بیٹا جعفر برمکی وزارت کے عہدہ پر سرفراز ہوا۔ یہ دونوں انتہائی فہیم سخی

---

[1] برامکہ مولفہ محمد عبد الرزاق کانپوری ص ۴۲۔

اور بلند پایہ سیاست داں تھے مگر ان کا انجام یہ ہوا کہ ہارون نے یحییٰ کو قید میں ڈال دیا جہاں وہ ۱۹۰ھ میں مر گیا اور جعفر کو ۱۸۷ھ میں قتل کرا دیا اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال کی تھی اگر جعفر کو اجل مہلت دیتی تو وہ اپنے باپ کے کتب خانہ کو ایسا فروغ دیتا کہ اس کی بھی وہی شہرت ہوتی جو جعفر کے علم و فضل اور جود و سخا کی آج تک ہے۔

بہاء الدولہ دیلمی کے وزیر شاپور بن اردشیر کا کتب خانہ نہایت نفیس تھا جو اس نے ۳۸۱ھ میں بغداد کے محلہ کرخ میں قائم کیا تھا اس میں دس ہزار[1] سے زائد کتابیں تھیں جن میں سے اکثر مشہور علماء کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ شاپور کے کتب خانہ نے اتنی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ ہر ایک مصنف اپنی تصنیف کی ایک نقل اسے ضرور بھیجتا تھا مگر اس نفیس کتب خانہ کی عمر صرف ۶۶ برس کی ہوئی ۴۴۷ھ میں طغرل بیگ سلجوقی کے سپاہیوں نے اسے تباہ و برباد کر ڈالا۔

علی بن یحییٰ منجم کا کتب خانہ خزانۃ الحکمت تمام بلاد اسلامیہ میں مشہور تھا یاقوت کا بیان[2] ہے کہ "تمام ممالک سے لوگ مختلف علوم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لئے یہاں آتے تھے یہاں تمام کتابیں طالب علموں کی خواہش کے مطابق دیکھنے کو ملتی تھیں صرف یہی نہیں بلکہ علی بن یحییٰ کے خرچ سے ان کی مہمان نوازی بھی کی جاتی تھی" یہ ہی وہ کتب خانہ ہے جس کی بے بہا

---

[1] جرجی زیدان نے کتابوں کی تعداد ۱۰ ہزار بتائی ہے اور اونگانیو نے ایک لاکھ۔

[2] اونگانیو ص ۸

کتابوں نے منجم ابو معشر کو اتنا مخمور کر لیا تھا کہ وہ مکہ جانا بھول گیا تھا،
جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس نے خراسان سے مکہ جاتے ہوئے بغداد
میں قیام کیا اور اس کتب خانہ میں پہنچ کر مطالعہ میں اتنا محو ہوا کہ اپنی
منزل تک نہ پہونچ سکا۔ ابو معشر بلخ کا رہنے والا تھا اس نے علم نجوم میں
بڑا کمال پیدا کیا اور اس موضوع پر تقریباً چالیس کتابیں لکھیں ۲۷۲ھ میں انتقال ہوا

کتب خانہ محمد بن الحسین بغدادی ایک علمی عجائب خانہ تھا۔
جس میں نایاب کتابیں، نادر مخطوطات، پرانی دستاویزات اور تحریریں
جمع تھیں۔ اس علمی خزانے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علامہ
ابن الندیم بغدادی نے لکھا ہے کہ "میں[1] نے بڑی مشکلوں سے محمد بن الحسین
تک رسائی حاصل کی اور جب اس کو میری طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تو ایک
دن اس نے ایک بڑا تھیلا نکالا جس میں قدیم عرب کے اشعار و قصائد اور بہت سی
پرانی دستاویزات اور تحریریں تھیں۔ یہ قصائد اور تحریریں چمڑوں
پر اور خراسانی مصری چینی تہامی کاغذ پر تھیں۔ میں نے ان کو خوب الٹ پلٹ کر
دیکھا۔ کہنگی کی وجہ سے ان کی ہیئت بدل گئی تھی اور جا بجا سے حرف اڑ گئے
تھے۔ ان میں جو مجموعے اور اجزاء تھے ان پر اکثر علماء کے دستخط اور سندیں
تھیں۔ ان میں ایک قرآن مجید خالد بن ابی الہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جو
حضرت علیؓ کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کے ہاتھ
کی متعدد تحریریں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ والہ وسلم نے جو خطوط سلاطین و

---

[1] رسائل شبلی صفحہ ۳۹

سرداران قبائل کے نام لکھوائے تھے بجنسہ محفوظ تھے۔ نحو ولغت میں اصمعی، ابن الاعرابی، سیبویہ، فرّاء، کسائی وغیرہ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور رسالے تھے۔ اسی طرح حدیث میں سفیان بن عیینہ، ثوری، اوزاعی وغیرہ کے ہاتھ کی تحریریں تھیں۔ علامہ ابن الندیم کا بیان ہے کہ اسی کتب خانہ کی بدولت مجھ کو اس بات کا علم ہوا کہ فن نحو ابو الاسود دولی کی ایجاد ہے۔"

اسحاق موصلی کا کتب خانہ

موسیقی اور لغت کی اعلیٰ کتابوں سے معمور تھا لکھا ہے کہ ابو العباس ثعلب نے بغداد کے اس کتب خانہ میں کثیر رسالے فن لغت میں دیکھے جو اسحاق کے مطالعہ میں آچکے تھے۔ اسحاق کا شمار موسیقی کے مسلم الثبوت استادوں میں ہوتا ہے اس کے سوا وہ فن حدیث اور لغت میں بھی استاد تھا ۲۳۵ھ میں انتقال کیا۔

خانقاہی کتب خانوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی کا کتب خانہ

سب سے اہم مانا گیا ہے شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی (متوفی ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء) سلسلہ قادریہ کے بانی اور عربی کے زبردست عالم تھے آپ کی بکثرت تصانیف نے کتب خانوں کے لئے ایک مستقل سرمایہ فراہم کردیا تھا۔ ان میں غنیۃ الطالبین (فقہ) اور بہجۃ الاسرار (تصوف) بہت مشہور ہیں۔

صوفیائے کرام کے روحانی اور علمی مشاغل نے کتب خانوں کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ اصل میں ان بزرگوں کا نصب العین تو دنیا پرستوں کو اخلاقی قدروں سے آگاہ کرنا اور انھیں سچائی اور نیکی کی راہ دکھانا ہے مگر اس

---

۵ علمائے سلف از حبیب الرحمٰن خاں شروانی ص ۳۳

کام کے لیے علم کی روشنی اور کتابوں کی مدد درکار ہے چنانچہ مشائخ نے تصوف و معرفت کے موضوع پر کتابیں لکھ کر علم و ادب میں قابل قدر اضافے کیے۔ اور اشاعت علم کی خاطر اپنی خانقاہوں میں کتابیں جمع کیں۔

اگر مشائخ کے خانقاہی کتب خانوں کا مقابلہ قرون وسطیٰ کی مسیحی خانقاہوں کی لائبریریوں سے کیا جائے تو دونوں میں آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا۔ کتب خانوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قوم کے میلان اور مذاق معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مشائخ نے اخلاقی اور علمی قدروں کو پھیلانا اپنا نصب العین بنا لیا تھا برخلاف اس کے مسیحی رہنماؤں کی پالیسی اشاعت علم کے خلاف تھی یہی فرق ان دونوں کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ مشائخ کے خانقاہی کتب خانوں سے استفادہ کیا جا سکتا تھا اور مسیحی خانقاہوں کے کتب خانوں میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کتابیں بند پڑی رہتی تھیں۔

تعلیمی کتب خانوں میں مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ نہایت عظیم الشان تھا۔ بغداد کے اس مدرسے کی بنیاد سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ھ میں ڈالی ساٹھ ہزار درہم میں عمارت تیار ہوئی اس کا افتتاح ذلیقعدہ ۴۵۹ھ/ ستمبر ۱۰۶۷ء میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔ سب سے پہلے صدر مدرس یا پرنسپل شیخ ابو اسحاق شیرازی مقرر ہوئے ہر مضمون کے الگ الگ استاد رکھے گئے جو شیخ کہلاتے تھے ان شیوخ[1] کی فہرست میں امام غزالی[2]

---

[1] مدرسہ نظامیہ بغداد کے مشاہیر شیوخ و علماء کی فہرست محمد عبدالرزاق کی کتاب نظام الملک طوسی کے صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۶ پر درج ہے [2] امام غزالی کی مفصل سوانح عمری کیلئے دیکھو الغزالی از علامہ شبلی نعمانی

کا نام بھی درج ہے ان کو اپنے تبحر علمی کی وجہ سے چونتیس سال کی عمر میں بن اعظم کا اعلیٰ عہدہ مل گیا تھا اس مدرسہ نے تین سو اسی برس تک علمی فیض پہونچایا اور بڑے بڑے ذی علم پیدا کئے شیخ سعدی اسی کے مایہ ناز سپوت تھے اس مدرسہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی یہ سب سے پہلا مدرسہ کہا جاتا ہے جہاں طلبار کے لئے وظائف مقرر کئے گئے اور ان کے واسطے کتابوں وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ مدرسہ کا سالانہ خرچ چھ یا سات لاکھ دینار تھا۔

مدرسہ نظامیہ سے ملحق ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں خواجہ نظام الملک نے ہزاروں نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کردی تھیں لکھا ہے کہ "جب کوئی عالم خواجہ کو تحفہ دیتا تو وہ صرف کتابیں ہوا کرتی تھیں اور وہ یہ نادر کتابیں کتب خانہ میں داخل کردیتا تھا"۔ کتب خانہ کے مہتمم علامہ ابو ذکریا تبریزی تھے جن کو بیش بہا تنخواہ ملتی تھی اس کے بعد یعقوب بن سلیمان اسفرائنی مہتمم مقرر ہوئے خلیفہ ناصر لدین اللہ کی ذات سے بھی اس کتب خانہ کو بڑا فائدہ پہونچا اس نے شاہی کتب خانہ کی بہت سی نادر کتابیں اس مدرسہ کے کتب خانہ کو عنایت کردیں۔ خواجہ نظام الملک کو اپنے مدرسہ کے کتب خانہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ جب وہ بغداد آتا تو اس کتب خانہ میں آکر کتب بینی ضرور کرتا تھا خواجہ کا سب سے بڑا کارنامہ تو مدرسوں کا قیام ہے لیکن اس نے کتابیں بھی لکھیں "سیاست نامہ یا سیر الملوک" اس کی بہت مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک عرصہ تک لندن میں

سول سروس کے امتحان میں شامل رہی اس علم دوست وزیر کا ایک شخص نے ۵۸۴ھ ۱۰۹۲ء میں کام تمام کر دیا۔

مدرسہ مستنصریہ کا کتب خانہ جسے خلیفہ المستنصر باللہ عباسی نے قائم کیا تھا علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۷ء میں دجلہ کے کنارے اس کی بنیاد کا مبارک پتھر رکھا گیا جب عمارت تیار ہو گئی تو اس کی رسم افتتاح بڑی شان و شوکت سے منائی گئی بڑے بڑے فقہاء اور علماء درس کے لئے مقرر ہوئے اور عمدہ عمدہ کتابیں ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر کتب خانہ شاہی سے اس کتب خانہ میں داخل کی گئیں۔

ابن العلقمی کا کتب خانہ: بنو عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کے وزیر موید الدین محمد ابن العلقمی نے قائم کیا تھا۔ یہ کتب خانہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ عباسی دور کے آخری وقت پر بھی بغداد میں کتابوں کے بیش بہا خزانے موجود تھے اس کتب خانہ کی مورخین نے بڑی تعریف کی ہے اور اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار بتائی ہے حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اس میں نہایت مفید اور نفیس کتابیں جمع ہیں۔ ابن العلقمی کا سیاسی کردار تو بلند نہ تھا کہا جاتا ہے کہ اسی کے اشارے پر ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عالم تھا اور اشاعتِ علم کی خاطر اس نے

ل۵ رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۸ ص ۱۷۱۔

اپنے کتب خانہ کے دروازے شائقین علم کے لئے کھول دیئے تھے لکھا ہے کہ "۴۴۶ھ اس نے افادۂ عام کے خیال سے یہ بیش بہا ذخیرہ اپنے محل سے دارالوزارت میں منتقل کر دیا تھا"۔ یہ کتب خانہ بھی اب موجود نہیں ہے مگر اس کی کچھ کتابیں استنبول اور قاہرہ کے کتب خانوں میں محفوظ بتائی جاتی ہیں ابن العلقمی کے کتب خانہ کا ایک مخطوطہ "کتاب الموشح"[1] (مصنف ابو عبید اللہ محمد بن عمران بن موسیٰ المرزبانی متوفی ۳۸۴ھ) استنبول کے کتب خانہ سلیمانیہ میں ہے۔ یہ خوبصورت نسخہ محمد بن علی النقاش کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کے سرورق پر ابن العلقمی کے دستخط موجود ہیں۔

غرض بغداد میں کتب خانوں اور مدرسوں کی کثرت عباسی دور[2] میں شروع سے آخر تک رہی بارھویں صدی عیسوی میں ابن جُبیر اندلسی بغداد آیا تھا اُس نے لکھا[3] ہے کہ بغداد میں ۳۰ مدرسے ہیں ہر مدرسہ کی عمارت خوبصورتی میں نادر محلات سے بہتر ہے سب سے بڑا اور مشہور مدرسہ نظامیہ ہے تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کے کتب خانوں کی تعداد ۳۶[4] بتائی جاتی ہے ان

---

[1] ملاحظہ ہو "کتب خانہ ابن العلقمی کا ایک مخطوطہ" از ڈاکٹر مختار الدین احمد (مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ جون ۱۹۶۰ء۔ شائع کردہ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) [2] عباسی دور ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء تک رہا اس خاندان میں ۳۷ حکمراں ہوئے [3] اردو ترجمہ سفرنامہ محمد ابن جُبیر اندلسی ص ۲۰۵ (مترجم احمد علی خاں شوق، مطبع احمدی رام پور ۱۹۰۰ء) [4] اولکا ٹیوص ۱۸۔

میں کتابوں کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ جب ہلاکو نے تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کو تاخت وتاراج کرتے وقت ان کتابوں کو دریائے دجلہ میں ڈالا تو ان سے دریا پر ایک پل بندھ گیا اور اس کا پانی سات دن تک سیاہ رہا شیخ سعدی نے بغداد کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ اسی تباہی سے متعلق ہے اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

قاہرہ

مصر[1] کا دارالخلافہ قاہرہ کتب خانوں کی دنیا میں بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے جب فاطمی خلیفہ عزیز بدین اللہ ۳۶۵ھ / ۹۷۵ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے یہاں ایک بہت بڑا کتب خانہ خزائن القصور کے نام سے قائم کیا جو اپنے زمانہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ اس میں چالیس کمرے تھے جن میں فقہ، نحو، لغت، حدیث، تاریخ، ہیئت اور کیمیا وغیرہ کی سولہ لاکھ کتابیں بھری ہوئی تھیں اس تعداد میں کتابوں کے سارے مکررات بھی شامل ہیں جرجی زیدان لکھتا ہے کہ ان مکررات کو نکال لینے کے بعد بھی کتابوں کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی ان میں چھ ہزار کتابیں صرف ریاضی اور ہیئت کی تھیں۔ یہاں خلیل بن احمد کی کتاب العین کے تیس نسخے تھے جن میں سے ایک خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ تاریخ طبری کے بارہ سو نسخے اور قرآن مجید کے دو ہزار چار سو نسخے مشہور و معروف خطاطوں کے لکھے ہوئے تھے۔ کتب خانہ کی بیشتر کتابوں کا خط نہایت پاکیزہ اور ان کی جلدیں سونے چاندی کے نقش و نگار سے مزین تھیں۔ کتابوں کے علاوہ یہاں زمین کے دو کرے بھی محفوظ تھے۔ ایک چاندی کا تھا جس پر تین ہزار دینار صرف ہوئے تھے

---

[1] مصر ۱۸ھ / ۶۳۹ء یعنی خلیفہ ثانی کے عہد میں فتح ہوا اور دو سال کے اندر مصر اس کے ساتھ طرابلس فتح ہو گیا فاتح مصر عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ کے حکم سے شہر فسطاط آباد کیا اور ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی جو مسجد عمرو بن عاص کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرا مثیل کا جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنایا ہوا تھا۔

خزائن القصور قرون وسطیٰ کے کتب خانوں میں اس لحاظ سے ممتاز [illegible]
رکھتا تھا کہ اس سے استفادہ کرنے کی عام اجازت تھی بالخصوص قاہرہ کے
مدرسوں کے طالب علم یہاں کتابیں مستعار لے سکتے تھے۔ یہ کتب خانہ خلیفہ
عزیز کے بعد اس کے جانشین حاکم کے کتب خانہ میں منتقل ہو گیا۔

حاکم بامراللہ نے قاہرہ میں ایک عام کتب خانہ دارالعلم
۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں قائم کیا جو دنیا کے عظیم ترین کتب خانوں میں سے
تھا اس میں ہر علم و فن کی ایک لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ اس وقت کی اسلامی
دنیا میں کتابوں کو استعمال عام کرنے کا رجحان کس طرح بڑھ رہا تھا اس
کی ایک ٹھوس مثال حاکم کا یہ کتب خانہ بھی ہے جس میں لوگوں کو ہر قسم کی
کتابوں کے مطالعہ اور نقل و کتابت کی عام اجازت تھی اور ان کے
لئے کاغذ، دوات، قلم وغیرہ بھی کتب خانہ کی طرف سے مہیا رہتا تھا بہت
فقہا، علما، ادبا، قاضی، راوی اور نحوی مقرر کئے گئے تھے کہ ہمیشہ کتب خانہ
میں حاضر رہیں اور اپنی معلومات و ترقی دیں۔

فاطمی خلفا بھی صاحب علم اور علم دوستی کے قدردان تھے انہوں
نے بے شمار کتابیں جمع کیں اور بڑے بڑے کتب خانے اور مدرسے قائم
کئے ان میں جامع ازہر کا کتب خانہ اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت
رکھتا ہے کہ یہ اس وقت سے لے کر آج تک طالبان علم کو سیراب کر رہا
ہے جامع ازہر کی تعمیر خلیفہ معز لدین اللہ کے عہد[1] (۳۵۸ھ-۳۶۵ھ / ۹۶۸ء-۹۷۵ء)

[1] اسی عہد میں ۳۵۹ھ میں مصر کا دارالخلافہ قاہرہ تعمیر ہوا۔

میں ہوئی تھی اس کے بعد عزیز بدین اللہ کے زمانہ میں اس کی اتنی ترقی ہوئی کہ کتب خانہ میں جملہ علوم و فنون کی تقریباً دو لاکھ کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ فاطمین کی علم دوستی کی یہ عظیم یادگار آج تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب مدرسے اور کتب خانے نیست و نابود ہو گئے چھٹی صدی ہجری میں کردوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ فاطمین کی علمی دولت تباہ کر ڈالی ان وحشیوں نے کتابوں کی جلدوں کے چمڑوں سے اپنے جوتے بنوائے اور کتابوں کے اوراق جلا دئے۔ ہزاروں کتابیں دریائے نیل میں پھینک دیں سینکڑوں کھلے میدانوں میں کس میرسی کے عالم میں پڑی رہیں جن پر جھجی زیدان کے الفاظ میں ہواؤں نے ترس کھا کر خاک ڈالدی اور وہ ایک عرصے تک کتابوں کے ٹیلوں کے نام سے مشہور رہیں۔

اس تباہی و بربادی کے باوجود فاطمی کتب خانوں کی کئی لاکھ کتابیں صلاح الدین ایوبی کی فتح مصر (۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء) تک باقی تھیں ان میں سے ایک لاکھ بیس ہزار سلطان نے اپنے وزیر الفاضل کو عنایت کر دی تھیں جس نے ان کو کتب خانہ مدرسۂ فاضلیہ میں داخل کر کے اس کی رونق بڑھادی۔

قاہرہ میں مختلف زمانوں میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں کتب خانۂ محمودیہ نہایت قیمتی تھا اس میں کتابوں کی تعداد تو صرف چار ہزار تھی مگر ان میں بہت سی نامور علماء اور مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں قاضی

لے تاریخ الامت مصنفہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری ج ششم ص ۱۰۴ (مطبع جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۳۵ء)

برہان الدین ابن جماعہ کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ بھی اسی میں شامل ہو گیا نویں صدی ہجری تک کتب خانہ محمودیہ محفوظ رہا اس کے بعد برباد و منتشر ہونا شروع ہو گیا ترکی سلطان سلیم عثمانی کی فتح مصر کے بعد اس کی بہت سی کتابیں قسطنطنیہ منتقل کر دی گئیں اس کا اور کچھ حصہ ضائع بھی ہو گیا بچی کچھی کتابوں میں سے اٹھاون کتابیں کتب خانہ خدیو مصر میں اور چھ کتابیں کتب خانہ خدا بخش بانکی پور میں محفوظ ہیں۔ فقہ شافعی کی مشہور کتاب "الحاوی الکبیر" کی تیسری جلد جو کبھی کتب خانہ محمودیہ میں تھی اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

اس کتب خانہ کے ناظموں میں سراج الدین اور فخر الدین الطائی کے بعد ابن حجر عسقلانی جیسے عظیم مصنف کا نام آیا ہے ابن حجر نے کتب خانہ کی دو فہرستیں بنائی تھیں ایک کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے تھی اور دوسری فن کے حساب سے مرتب کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کے لئے وقف تھا اور واقف کی شرائط کی رو سے اس کی کتابیں کتب خانہ سے باہر نہیں جا سکتی تھیں اس کے باوجود ہر اہل علم اس سے استفادہ کر سکتا تھا

اس عظیم الشان کتب خانہ کا بانی ایک مصری مدبر اور سیاستداں جمال الدین محمود بن علی الاستادار الظاہری تھا جو اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر مختار الدین احمد کا مضمون "محمود بن علی الاستادار الظاہری" (مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ جون ۱۹۶۰ء) اس مضمون میں اس کتب خانے اور اس کے بانی کی زندگی کے متعلق بہت قیمتی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ ان چند کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اب تک مصر اور ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں ہیں۔

محمودیہ کے ایک گوشے میں آرام کی نیند سو رہا ہے محمود نے اپنی طباعی اور
ذہانت سے سلطان ملک ظاہر برقوق کے عہد میں اتنا اعزاز پایا کہ
سلطان کا مشیر خاص بن گیا ۔ آخر عمر میں اس نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں ۔
سلطان برقوق کے حکم سے اسے قید کر دیا گیا ۔ اور زندگی کے آخری
لمحوں (۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء) تک وہ قاہرہ میں قید رہا ۔ اسی طرح
راحت اور مصیبت کے دن لوگوں کے درمیان گردش کرتے رہتے ہیں ۔

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

کوفہ اور بصرہ

کوفہ اور بصرہ کو حضرت عمرؓ نے آباد کیا تھا آپ ہی کی بابرکت شخصیت کا اثر تھا کہ یہ دونوں شہر جو ابتدا میں فوجی چھاؤنیاں تھیں علم کے مراکز بن گئے بیشتر ائمہ حدیث فقہ اور صرف و نحو ان ہی مقامات سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان اکابر کے کتب خانوں کا مورخین نے صریح طور پر ذکر نہیں کیا تاہم ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کوفہ و بصرہ کے ساتھ دمشق، حلب، ہرات، بخارا، نیشاپور، اور شیراز کو بھی یاد رکھنا چاہیے جہاں کے ارباب علم اسلامی کتب خانوں کے اولین معمار تھے اشاعت علم کے سلسلہ میں ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ کتابیں جمع کرنے اور ان کے مطالعہ کو عام کرنے کی اہم محرک ہیں۔

کوفہ حضرت علیؓ کے عہد (۳۵ھ ـــ ۴۰ھ) میں اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت ہو جانے کی وجہ سے علم و فضل کا گہوارہ بن گیا تھا خود حضرت علیؓ کی حیثیت ایک درس گاہ اور ایک کتب خانہ سے بڑھ کر تھی آپ ہی کی رہنمائی میں ابوالاسود دؤلی نے فن نحو کی بنیاد رکھی تھی حضرت علی ہی کی دعا کے اثر سے علم فقہ

---

[1] امام ابوحنیفہ کے دادا زوطی ابن ماہ مشرف بہ اسلام ہو کر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے زوطی کے فرزند ثابت جب پیدا ہوئے تو حضرت علیؓ نے انہیں سواد دارین حاصل کرنے کی دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ خدا کرے تیری نسل سے اسلام کے زبردست مددگار اٹھیں چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی اور ۸۰ھ میں ثابت کے فرزند امام ابوحنیفہ پیدا ہوئے جنہوں نے وہ مرتبہ پایا کہ بقول امام شافعیؒ "فقہ میں سب لوگ امام ابوحنیفہ کے دست نگر ہیں"۔ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کی مکمل سوانح عمری کے لئے دیکھو سیرۃ النعمان از علامہ شبلی

کے امام ابوحنیفہ کوفہ کی سرزمین سے اٹھے تھے ان کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف[1] (متوفی ۱۸۲ھ) کا مولد و منشا یہی شہر ہے۔ جامع علم و تقویٰ سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) نے حدیث و تفسیر کی کتابیں کوفہ میں لکھی تھیں۔ حدیث، لغت، اور تاریخ کا عالم ابن قتیبہ دینوری ۲۱۳ھ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ لغت اور ادب کے فاضل ابوعمر ابن العلاء نے ۱۵۴ھ میں اسی جگہ وفات پائی لکھا ہے کہ انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کے اتنے اقوال جمع کئے تھے کہ ان کے مجموعوں سے ان کا مکان چھت تک بھر گیا تھا اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جو کچھ میں نے جمع کیا ہے وہ کلام عرب کا ایک ادنیٰ حصہ ہے اگر ان کے تمام اقوال ملتے تو علم و شعر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آجاتا۔

بصرہ کے صرف دو کتب خانوں کا ڈاکٹر اولگا پنٹو نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک کتب خانہ ابن السوار کا تھا جو اس نے عوام کے لئے قائم کیا تھا یہ پانچویں صدی ہجری تک باقی رہا مگر یہاں اور بھی کتب خانے تھے مثلاً کتب خانہ مدرسہ نظامیہ اور ارباب علم کے کتب خانے جن کی تعداد کا اندازہ تین ہزار تک لگایا جاتا ہے بصرہ میں مشائخ اور علماء و فضلا کی اتنی کثیر تعداد تھی کہ جب امام ادب نضر بن شمیل بصرہ سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار آدمی شہر سے ان کی مشایعت کو ایسے

---

[1] امام یوسف علم فقہ کے علاوہ تفسیر مغازی اور ایام العرب کے عالم تھے ہارون رشید کے زمانہ میں تمام ممالک اسلامیہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے کہا جاتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے ان ہی کو قاضی القضاۃ کہا گیا تھا ان کی تصنیفات میں کتاب الخراج بہت مشہور ہے

نکلے جو یا نحوی تھے یا لغوی عروضی تھے یا محدث یا اخباری[۱]۔ بصرہ کے شیوخ میں امام حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) وہ ممتاز تابعی تھے جن کے متعلق لکھا ہے کہ حجاج جیسے ظالم حاکم سے بھی کبھی مرعوب نہیں ہوئے قتادہ بن دعامہ (متوفی ۱۱۸ھ) بقول امام حنبل بصرہ میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ علامہ اصمعی بصری (متوفی ۲۱۳ھ) لغت و ادب عربی کے امام تھے اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ صرف رجز کے بارہ ہزار اشعار یاد تھے۔ بصری علماء میں جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) اتنا بڑا عالم اور ادیب تھا کہ اس کی تصانیف البیان والتبیین اور کتاب الحیوان پر بصرہ والے فخر کیا کرتے تھے اسی شہر میں علوم ریاضی اور طبیعیات کا بے نظیر عالم ابن الہیثم ۹۶۵ء میں پیدا ہوا تھا اس کی کتاب المناظر طبیعیات میں بڑی اہم کتاب ہے کہتے ہیں کہ بصرہ کو ابن الہیثم پر اسی طرح ناز ہے جس طرح کہ خاک اسکندریہ کو بطلیموس پر اور انگلستان کو گلبرٹ اور نیوٹن پر۔

---

[۱] علمائے سلف از حبیب الرحمن شروانی ص ۵۶

دمشق

دمشق اسلامی سلطنت میں شامل ہونے کے بعد سیکڑوں برس علم و ادب کا مرکز اور علماء و فضلاء کا منبع رہا یہ شہر حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہوا تھا فتوحاتِ شام میں یہ اتنی بڑی فتح تھی کہ جب اس کی اطلاع رومی شہنشاہ ہرقل کو ملی تو وہ چلا اٹھا[۱] الوداع۔ اے شام الوداع"

دمشق بنی امیہ کے عہد میں اسلامی سلطنت کا پایہ تخت رہا اس زمانہ میں تصنیف و تالیف اور اشاعت علم کی طرف جو توجہ کی گئی اس کے اثر سے یہاں کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا اور بڑے بڑے کتب خانے اور مدرسے قائم ہو گئے مولانا اسلم جیراجپوری کے الفاظ میں "اسلامی علوم کا وہ چمن جو خلافتِ عباسیہ میں برگ و بار لایا عہد بنی امیہ میں لگایا جا چکا تھا"[۲]

خلفائے بنو امیہ میں عبد الملک بن مروان، حضرت عمر بن عبد العزیز اور ولید بن یزید کے کتب خانوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان کے علاوہ **کتب خانہ جامع دمشق** بھی ہر اعتبار سے نایاب خیال کیا جاتا ہے یہ مسجد ولید اول (متوفی ۹۶ھ/۷۱۵ء) نے گرانقدر مصارف کر کے اتنی خوبصورت اور عظیم الشان بنوائی تھی کہ بقول یاقوت حموی[۳] "اگر انسان سو سال زندہ رہے اور ہر روز اس کی بناوٹ و سجاوٹ کو غور سے دیکھے تو یقیناً وہ روز ایسی چیزیں دیکھے گا جو تمام دنوں میں نہیں دیکھی تھیں"

---

[۱] تمدن عرب ترجمہ شبلی بلگرامی ص ۷۴ [۲] مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد کی دیواروں میں بیش قیمت سنگ مرمر لگا تھا۔ نماز کے مصلوں پر بیش بہا پتھر جڑے ہوئے تھے اور چھت میں چھ سو طلائی چراغ آویزاں تھے۔

خیال ہے کہ اس کا مدرسہ اور کتب خانہ مسجد کی شان کے مطابق ہوگا اس میں عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (متوفی ١٢١ھ) کا درس دینا اور یہاں کے کتب خانہ میں مصحف عثمانی کا موجود ہونا ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے. اموی عہد کے بعد بھی جامع دمشق کی علمی مرکزیت مدتوں قائم رہی آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ[1] نے یہاں تدریس کے بہت سے حلقے دیکھے تھے اور مسجد میں قرآن کے اس نسخہ کی بھی زیارت کی تھی جو حضرت عثمانؓ نے شام کو بھیجا تھا۔ اسی مسجد کے غربی منارہ کے اندر امام غزالی نے ایک مدت تک مراقبہ و مجاہدہ کیا اور عبادت و ریاضت کرتے رہے مسجد کے ایک منارہ عیسیٰ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ اسی سے نازل ہوں گے۔

دمشق میں مدرسوں اور کتب خانوں کی کثرت دسویں صدی ہجری تک پائی جاتی ہے۔ ٩٢٧ھ میں یہاں **تین سو بیس کتب خانے** تھے اس سرزمین کو سلطان نورالدین محمود زنگی (متوفی ٥٦٩ھ/١١٧٣ء) اور سلطان صلاح الدین ایوبی (متوفی ٥٨٩ھ/١١٩٣ء) نے بھی علم کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ ابن جبیر اندلسی نے اپنے سفرنامہ[2] میں لکھا ہے کہ دمشق کے مدرسوں میں سب سے خوش قطع اور نفیس عمارت نورالدین زنگی کے مدرسہ کی ہے اسی مدرسہ میں ان کی قبر ہے یہ عمارت قصر کی طرح نہایت خوش منظر اور بارونق ہے۔ غرض ہر زمانہ میں یہاں مدرسوں کی تعداد بڑھتی رہی یہ تک

---

[1] دیکھو عجائب الاسفار۔ (سفرنامہ شیخ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ) جلد اول ص ١٢٦۔

[2] سفرنامہ محمد بن جبیر اندلسی اردو ترجمہ ص ٢٦٤

کہ ۹۲۷ھ / ۱۵۲۰ء میں ان کی تعداد تین سو بیس تھی کتاب المدارس من المدارس میں ہے۔[۱]

"ان مدرسوں میں علوم دینیہ کے ساتھ طبیعیات، ریاضیات، علم ہیئت اور ادب وغیرہ کی تعلیم دیجاتی تھی ان کے علاوہ چار مدرسے ایسے تھے جن میں خاص فن طب کی تعلیم دیجاتی تھی اور ایک مدرسہ فن انجینیری کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا یہ وہ مدارس ہیں جن میں طلبہ کو اعلیٰ تعلیم دیجاتی تھی ورنہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ابتدائی مدرسے ان میں ہر ایک مدرسے کی ماتحتی میں قائم تھے اور ان مدارس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ہر ایک کے پاس اس کا ذاتی کتبخانہ موجود تھا جس سے طلبہ ہر وقت مستفید ہوتے رہتے تھے۔"

طرابلس

شام کا شہر طرابلس بنو عمار کے عہد میں علم و فضل کا گھر بن گیا تھا جہاں دور و دراز ممالک سے اہل علم آتے تھے اسی زمانہ میں یہاں **ایک عظیم الشان کتب خانہ** قائم ہوا جس میں تیس لاکھ[۱] کتابیں تھیں ان میں پچاس ہزار نسخے قرآن شریف کے اور بیس ہزار جلدیں تفاسیر کی تھیں ۔ اس کتب خانہ میں کتابت کے کام پر ۱۸۰ کاتب مامور تھے جن میں سے ۳۰ شب و روز کام میں مشغول رہتے تھے ۔ بنو عمار کے عہد میں طرابلس کے اندر تمام علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی ۔ انھوں نے کتابیں جمع کرنے میں بھی بڑے شغف سے کام لیا اپنے گماشتے بھیج کر بڑے بڑے شہروں سے کتابیں فراہم کیں اور کتب خانہ کو اتنی ترقی دی کہ وہ اس زمانہ کے عجائبات میں سے شمار کیا جانے لگا۔

---

[۱] رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۸ ص ۴۰۵ ۔ لکھا اور لکھا ۔ تا کی ص ۳۱ - ۳۲

یہ عظیم الشان کتب خانہ صلیبی جنگ کے موقع پر عیسائی سپاہیوں کے ہاتھ سے برباد ہو گیا۔ جب انھوں نے طرابلس کو فتح کیا تو اس کتب خانہ کو بھی آگ لگا دی طرابلس کے ایک بزرگ نے بیان کیا ہے کہ "میں فخرالملک ابن عمار والی طرابلس کے ساتھ قلعہ شیزر میں تھا جب کہ اسے فرنگیوں کے ہاتھ سے فتح ہو جانے کی اطلاع ملی تو اس پر غشی طاری ہو گئی اور جب افاقہ ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس نے مجھ سے کہا بخدا مجھے کسی چیز کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ اس دارالعلم (کتب خانہ) کی تباہی کا۔"

حلب

ملک شام کے شہر حلب میں بھی کتب خانے اور مدرسے بکثرت تھے مگر ان کے قیام سے سیکڑوں برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اپنا مسکن بنا لیا تھا آپ کے پاس بہت سی بکریاں تھیں جن کا دودھ آپ لوگوں کو مفت پلایا کرتے تھے اہل عرب دودھ دوہنے کو حلب کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس کا نام حلب ہوا یہ شہر مختلف حکمران خاندانوں کے قبضہ میں رہا جن میں خاندان بنو حمدان کا فرماں روا سیف الدولہ (۳۳۳ھ - ۳۵۶ھ / ۹۴۴ء - ۹۶۷ء) اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ حلب میں سیف الدولہ کا کتب خانہ ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا تھا علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ فن ادب کا ذخیرہ جس قدر اس کتبخانہ

میں مہیا ہوا اور کہیں نہ ہوگا" اس کتب خانہ کے مہتمم وافسر دو ممتاز شاعر محمد بن ہاشم اور اس کا بھائی تھے۔

ایوبی خاندان کے عہد میں جو ادارے یہاں قائم ہوئے ان میں قاضی اکرم کا کتب خانہ بہت قیمتی تھا اس کے ذخیرے کی قیمت پچاس ہزار[1] دینار بتائی جاتی ہے ابوالحسن علی بن القفطی مشہور بہ قاضی اکرم تاریخ الحکمار کا مصنف تھا۔

ان کے علاوہ تقریباً اسی[2] تعلیمی کتب خانے حلب میں تھے مثلاً مدرسہ خلیفہ کا کتب خانہ جس کے متعلق ابن جبیر اندلسی نے لکھا ہے کہ اس مدرسہ کی عمارت جامع مسجد حلب کے مانند خوبصورت اور شاندار تھی بلکہ اسے گلستاں کا ایک نمونہ کہنا چاہئے اس لئے کہ مدرسہ میں ہر طرف انگور کی سرسبز و شاداب بیلیں لگی ہوئی تھیں مدرسہ کی کھڑکیوں میں انگور کے تر و تازہ خوشے اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ طالب علم اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے انھیں توڑ سکتے تھے۔ حلب میں ایک مدرسہ زجاجیہ تھا جس کی صدر معلمہ فاطمہ بنت قرمیزال تھی یہاں کے مدارس کی مجموعی تعداد اسی[2] کے لگ بھگ تھی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں مدرستہ الفردوس، مدرسہ نوریہ، عصرونیہ، صاحبیہ، ظاہریہ، اسدیہ، شعیبیہ، شرفیہ، بدریہ، زیدیہ، قواسیہ، رواحیہ، اور شادبختیہ۔

---

[1] اولگا نیجوس ۹ [2] تفصیل کے لئے دیکھو رسالہ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۸ ص ۵۹

حلب کی اس علمی فضا میں بڑی نایاب کتابیں جمع ہو گئی تھیں ان میں "مجمل اللغۃ لابن فارس" بھی شامل تھی جس کا تعارف ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے ایک مضمون[1] میں کرایا ہے ان کی تحقیق کے مطابق اس نادر نسخہ کی کتابت ابن میمون البغدادی نے ۵۴۹ھ میں بمقام بغداد کی تھی وہاں سے یہ نسخہ عزالاسلام ابوعلی الحسن عادلی کے پاس حلب پہونچا پھر شیزر کے مشہور شاعر اسامہ بن منقذ کے بیٹے مرهف کو ملا اس کے بعد یمن کے مشہور رسولی فرماں روا الملک المؤید داؤد بن یوسف (متوفی ۷۲۱ھ ۱۳۲۲ء) کے پاس آیا اس بادشاہ نے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں ایک لاکھ کتابیں تھیں۔

غرض حلب کی طرح ملک شام کے ہر حصے میں مدرسے اور کتب خانے پھیلے ہوئے تھے یہ ملک سات سو برس تک رومیوں کے قبضہ میں رہا مگر مسلم عہد میں یہاں جو علمی و تمدنی ترقیاں ہوئیں وہ اس وقت تک اسے نصیب نہ ہوئی تھیں اس زمانہ میں علوم اور صنعت و حرفت کی غیر معمولی ترقیوں کے ساتھ اس نے اتنی زرخیزی و شادابی حاصل کر لی اور یہاں اسقدر عجائب جمع ہوئے کہ یہ خطہ جنت کا نمونہ بن گیا بقول موسیولیبان خلفائے بنی امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں شام کا تمدن ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا تھا جرجی زیدان نے لکھا ہے :-

"اہل شام کا اشاعت علوم میں بہت زیادہ حصہ ہے انہیں لوگوں

---

[1] مجمل اللغۃ لابن فارس کا ایک قیمتی نسخہ" ملاحظہ ہو مجلہ علوم اسلامیہ جلد ا ص؟" (شائع کردہ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

نے قدیم علوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا اور دنیا کی تمام قوموں میں پھیلایا کیونکہ یہ لوگ ذکاوت اور ذہانت میں بے مثل ہیں اور ملک کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے ان کی طبیعتیں ہمیشہ پُرنشاط رہتی ہیں"۔

سمرقند

کتب خانوں کی توسیع و ترقی کے سلسلہ میں سمرقند کو خاص اہمیت حاصل ہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے یہاں دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں کاغذ کی صنعت کی بنیاد رکھی گئی تھی جس نے عالم اسلامی میں تحریری سرمایہ کی ترقی اور کتب خانوں کی توسیع کے لئے دروازے کھول دئے اور سمرقند کا نام تمام دیار و امصار میں کاغذ کے لئے مشہور ہوگیا یہ شہر بھی مدتوں علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ سامانیوں اور خوارزم شاہیوں کے عہد میں اس نے علم و ادب میں خاص شہرت حاصل کی اس شہر میں بہت سے ارباب علم پیدا ہوئے مثلاً چہار مقالہ کا مصنف نظامی عروضی اور تذکرۃ الشعراء کا مصنف دولت شاہ جنہوں نے یہ کتابیں علی الترتیب ۵۵۰ھ (۱۱۵۵ء) اور ۸۹۲ھ (۱۴۸۶ء) میں لکھی تھیں۔

سمرقند علم ہیئت کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اس کا نام ہیئت کے بڑے بڑے مراکز بغداد، دمشق، قرطبہ، طلیطلہ اور فاس کے ساتھ آتا ہے تیمور نے سمرقند میں ایک رصدگاہ تعمیر کی تھی اور اسے اپنی عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت بنایا تھا اس کے پوتے الغ بیگ نے یہاں ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں ایک رصدگاہ بنوائی اور چار علماء صلاح الدین موسیٰ المعروف بہ قاضی زادہ رومی، علاؤ الدین علی قوشجی، غیاث الدین جمشید اور معین الدین کاشانی کی مدد سے زیج الغ بیگ تیار کی اور ایسے آلات رصد بنوائے جو اس وقت

تک نہیں بنے تھے ان رصدگاہوں کے ملحقہ کتب خانوں کا ذکر نہیں ملتا مگر مراغہ کا کتب خانہ بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں رصدگاہوں کے ساتھ بھی کتبخانے ہوا کرتے تھے جنہیں علم ہیئت کے مخصوص کتب خانے کہہ سکتے ہیں

مراغہ کا کتب خانہ تیمور کے انتقال سے ایک سو پچاس سال پہلے قائم ہوا تھا جب ہلاکو نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی تحریک پر ۶۵۷ھ/ ۱۲۵۸ء میں ایک رصدگاہ مراغہ میں تعمیر کی تو اس کے ساتھ کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں چار لاکھ کتابیں[1] تھیں اس میں بغداد، شام وغیرہ کے تباہ شدہ کتب خانوں کی بچی کھچی کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ شامل تھا کہا جاتا ہے کہ ہلاکو کو بغداد کی تباہی پر نصیر الدین طوسی نے آمادہ کیا تھا اور یہ ان کی گہری علمیت اور دانش کا اثر تھا کہ ہلاکو رصدگاہ بنوانے پر راضی ہو گیا اس رصدگاہ کی تعمیر کے

---

[1] علوم عرب (جرجی زیدان) ص ۲۲۷ [2] نصیر الدین نے جس طرح ہلاکو کو رصدگاہ بنوانے پر راضی کیا تھا اس کے متعلق صاحب فوات الوفیات کا بیان ہے کہ جب ہلاکو رصدگاہ بنوانے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا تو طوسی نے عرض کیا کہ کسی کو چھت پر ایک طشت لے کر بھیجئے اور اسے یہ ہدایت کر دیجئے کہ جب آپ صحن میں اپنے درباریوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اس وقت وہ طشت زور سے نیچے پھینک دے جب ایسا کیا گیا تو طشت کے اچانک گرنے سے سارے دربار میں ہلچل مچ گئی لوگ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے لیکن ہلاکو اور طوسی اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے رہے اس پر طوسی نے کہا یہ سچ ہے کہ نجوم سے آئندہ پیش آنے والے واقعات تو نہیں ٹل سکتے۔ مگر واقعات کا پہلے سے علم ہو جانے کے باعث مصیبت کے وقت سراسیمگی پیدا نہیں ہوتی اور وہ سکون وہ اطمینان قائم رہتا ہے جو طشت گرتے وقت ہم دونوں کو حاصل تھا یہ بات ہلاکو کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے رصدگاہ بنوانے کی منظوری دیدی۔

علاوہ ہلاکو نے اہلِ علم کی بھی سرپرستی کی اس نے نصیر الدین طوسی اور علاء الدین عطا ملک جوینی جیسے ذی علم حضرات کو اپنا وزیر و مشیر بنایا اور اس کے پڑپوتے غازان نے رشید الدین فضل اللہ ہمدانی کو عہدہ وزارت پر سرفراز کیا تھا چنانچہ اس دور کی فتنہ سامانی اور قتل و غارت گری کے باوجود فارسی میں تصنیف و تالیف کا بہت کام ہوا خواجہ نصیر الدین طوسی نے تذکرہ نصریہ (ہیئت) رسالہ اوصاف الاشراف (تصوف)، سی فصل (نجوم) جیسی کتابیں لکھیں اور ابن مسکویہ کی طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق کا فارسی میں ترجمہ کیا جو اخلاق ناصری کے نام سے مشہور ہے علاء الدین عطا ملک جوینی کی یادگار تاریخ جہاں گشائی تین جلدیں ہیں رشید الدین[1] فضل اللہ نے جامع التواریخ لکھی اس کے ہم عصر شہاب الدین عبد اللہ شیرازی ملقب بہ وصاف نے تاریخ وصاف تصنیف کی اس عہد کا ایک مصنف قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی ہے جس کی شرح قانون ابن سینا، شرح حکمت الاشراق اور درج التاج اہم کتابیں شمار کی جاتی ہیں قطب الدین کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے خواجہ نصیر الدین کی مجالس درس سے استفادہ کیا اور مراغہ کی رصدگاہ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔

---

[1] رشید الدین فضل اللہ ہمدانی کی ایک کتاب اسولہ واجوبہ رشیدیہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ (مکتوبہ ۹ھ) جواہر میوزیم شاہ دہ میں ہے۔ تذکرہ جواہر زواہر کے مرتب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب کا نسخہ اور کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔

بخارا

اسلام کے ابتدائی دور کی علمی بستیوں میں بخارا کو بڑی فضیلت حاصل تھی اس زمانہ میں یہاں کتنے کتب خانے تھے اس کا اندازہ علمائے بخارا کے مزارات کی زیارت کرنے کے بعد ہو سکتا ہے ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ تمام علمائے بخارا کے مزارات پر ان کے نام اور ان کی تصنیفات کے نام لکھے ہوئے ہیں ان ہی میں ایک مزار محمد بن اسمٰعیل بخاری (متوفی ۲۵۶ھ/۸۶۹ء) کا بھی ہے جو ایک جلیل القدر محدث تھے انھیں چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد احادیث کا ایک مجموعہ انھوں نے تیار کیا جو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے۔

بخارا سامانیوں کا پایہ تخت اور بڑے بڑے علماء و مصنفین کا مرکز تھا اس زمانہ میں یہاں کی علمی رونقیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ شیخ بوعلی ابن سینا نے بلخ چھوڑ کر بخارا میں بود و باش اختیار کر لی تھی جہاں **نوح بن منصور کا کتب خانہ** اہل علم کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا خاندان سامانی کے اس فرماں روا نے ۳۶۶ھ (۹۷۶ء) سے ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اور کتابیں جمع کرنے میں غیر معمولی انہماک دکھایا اس کے کتب خانہ کو علامہ ابن خلکان نے عدیم المثال بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں ہر علم و فن کی کتابیں تھیں اور ان میں بہت سی ایسی تھیں جن کا پتہ اس کتب خانہ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا تھا اس بے نظیر کتب خانہ سے

شیخ بوعلی سینا نے استفادہ کیا تھا اور وہ اس کا مہتمم بھی رہا تھا اس کا بیان ہے کہ فلسفہ کی جو کتابیں میں نے یہاں دیکھیں کہیں نہیں دیکھی تھیں اور نہ اور دوں نے ان کو دیکھا ہوگا نوح بن منصور کے کتب خانہ کی عمارت حسب بیان بوعلی سینا بہت سے کمروں پر مشتمل تھی ہر فن کے لئے جدا کمرہ تھا اور ہر کمرے میں صندوق کے اندر کتابیں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں[1]

سامانی حکمراں فارسی اور عربی ادبیات کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں ان کے عہد میں فارسی ادبیات کی خاص طور پر ترقی ہوئی متعدد کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے جن میں تفسیر طبری اور تاریخ طبری کے ترجمے قابل ذکر ہیں موخر الذکر کا مترجم سامانیوں کا مشہور وزیر ابوعلی محمد بلعمی ہے اس دور کے شعراء میں رودکی سمرقندی (متوفی ۳۲۹ھ/۹۴۰ء) کو ایران کا سب سے پہلا بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔

---

[1] بحوالہ رسائل شبلی ص ۴۵

غزنی

غزنی سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے عہد میں غزنی کا کتب خانہ دنیا کے نفیس کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا اس بادشاہ کی معارف پروری اور علمی قدر دانی کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ مورخ ایشوری پرشاد نے اسے بہت بڑا فاتح اور مصنفین کا فیاض سرپرست کہا ہے اس کی قدر دانی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں کمال رکھنے والے البیرونی، فارابی، بیہقی[1]، طوسی، عنصری، فردوسی اور عتبی[2] اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے محمود کے عہد میں غزنی کی کیا حالت تھی یہ بھی ایشوری پرشاد کی زبان سے سنیے۔

> "محمود نے غزنی میں ایک یونیورسٹی قائم کی ایک کتب خانہ فراہم کیا اور ایک عجائب خانہ کھولا جس میں جنگ کے ہدایا و تحائف جمع کیے یہ اسی کی دریا دلی کا نتیجہ تھا کہ غزنی میں ایسی خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں جن کی وجہ سے یہ شہر مشرق کے بہترین شہروں میں شمار ہونے لگا"

لیکن محمود غزنوی سے کوئی دو سو سال قبل غزنی میں **ایک قیمتی کتب خانہ**[3] تھا جس میں دوسری اہم کتابوں کے علاوہ عیسائیوں کی مقدس کتاب جس پر

---

[1] ابو الفضل بیہقی کی تصنیف تاریخ بیہقی غزنوی خاندان کی تاریخ اور فارسی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ [2] ابو نصر عتبی نے عربی میں تاریخ یمینی لکھی جس میں سلطان محمود اور اس کے باپ سبکتگین کے حالات درج ہیں اس کا فارسی میں ترجمہ ابو شرف ناصح گلپایگانی نے کیا۔
[3] ملاحظہ ہو "نخستین کتب خانۂ غزنہ در عصر اسلامی" در ماہنامہ سروش کراچی جلد ۳ شمارہ ۱۰ (۲۱)

کے تھی، ۲ مجلدات محفوظ تھے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں کنٹربری کا
پادری فیلیکس ایبی نس الکوئین کتاب جبشیر کی تلاش میں نکلا اور سفر کی صعوبتیں اٹھاتا
ہوا انگلستان سے غزنی پہونچا جو اس وقت اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا
تھا اس سفر کی پوری کیفیت "گذارش سفر الکوئین بہ کتب خانہ غزنہ" میں بیان
کی گئی ہے خاص مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق یہ کتب خانہ ایک پبلک لائبریری
کی حیثیت رکھتا تھا جس کی نگرانی اور حفاظت کے لیے ناظم یا کتاب دار مقرر
تھا۔ کتب خانہ کا ایک کیٹلاگ (فہرست کتب) بھی تھا جس میں کتابیں اپنے
عنوانات کے تحت درج کی جاتی تھیں یہاں کتاب جبشیر جیسی قدیم اور اہم کتابیں
مقفل الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں جس کی چابیاں احتیاط کے خیال سے ناظم
کتب خانہ کے بجائے شہر کے حاکم اعلیٰ کے پاس رہتی تھیں اور ان کے مطالعہ کی
اجازت بھی سے حاصل کرنی پڑتی تھی پادری الکوئین کو کتاب جبشیر کے مطالعہ
اور ترجمہ کی اجازت لینے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر
اس کا جذبۂ شوق کام آ ہی گیا اور اسے ترجمہ کرنے کی اجازت مل
گئی جس کو اس نے دو سال میں مکمل کر دیا اس علم دوست پادری کے بیانات
کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزنی کا یہ کتب خانہ ایک قدیم ترین عوامی
کتب خانہ تھا۔

سلہ رسالہ سرگزشت کراچی جلد ۳ شمارہ ۲۲

ہرات

ہرات کے آثار قدیمہ یہاں کے کتب خانوں اور مدرسوں کی نشان دہی کر رہے ہیں یہ شہر بڑے بڑے مشائخ علماء اور بادشاہوں کا ابدی مسکن ہے جن کی بدولت یہ علم وفضل کا گہوارہ بن گیا تھا یہاں خواجہ عبد اللہ انصاری[1]، خواجہ ابو الولید[2] احمد اور مولانا نور الدین جامی جیسے بزرگوں کے مزارات دیکھ کر علمی روح بیدار ہو جاتی ہے۔

ہرات ۳۱ھ (۶۵۱ء) میں مسلمانوں کی حکومت میں شامل ہوا اسوقت سے یہ مختلف بادشاہوں کے قبضہ میں رہا سلاطین سلجوقیہ اور سلاطین کرت یہاں حکمراں رہے۔ ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) میں تیمور نے اسے فتح کیا اگرچہ اس نے ہرات کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ خود اس کے بیٹے شاہ رخ مرزا اور اس کے پوتے الغ بیگ نے اسے علم و ہنر کا مرکز بنا دیا تھا تیموری سلاطین میں یہ دونوں اور بایسنقر و سلطان حسین مرزا بایقرہ کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق رکھتے تھے اور اس معاملہ میں یہ حضرات بقول براؤن

---

[1] عہد سلجوقی کے صوفیا اور محدثین میں عبد اللہ انصاری (متوفی ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء) نہایت ممتاز ہیں۔ آپ کی تصانیف میں منازل السائرین (عربی) اور زاد العارفین (فارسی) بہت مشہور ہیں [2] خواجہ ابو الولید (متوفی ۲۳۲ھ ۸۴۶ء) اپنے زمانہ کے بڑے صاحب علم بزرگ تھے ظاہری و باطنی علوم امام احمد بن حنبلؒ سے حاصل کئے یہ نہایت امیر آدمی تھے مگر اپنی تمام دولت تحصیل علم میں صرف کر دی تھی۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے فرانسیسی اور اطالوی شائقین کتب سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے تھے شاہ رخ کے دوسرے بیٹے بائسینغر کا تو یہ حال تھا کہ اس کی سرپرستی میں چالیس خطاط زیر نگرانی مولانا جعفر تبریزی کتابیں نقل کرنے پر مقرر تھے اس سے اُن کتب خانوں کا سراغ ملتا ہے جو ان سلاطین نے اپنی سلطنت کے مختلف شہروں ہرات اور سمرقند وغیرہ میں قائم کئے تھے اسی زمانہ کی یادگار کتب خانہ مدرسہ گوہر شاد بیگم ہے یہ سلطان شاہ رخ کی ملکہ گوہر شاہ بیگم نے قائم کیا تھا اور اُسی کے قریب وہ ابدی نیند سو رہی ہے ایک کتب خانہ مدرسہ مرزا کا تھا جس کے عظیم الشان ہونے کا پتہ مدرسہ کی شان و شوکت سے چلتا ہے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تمام ایران و توران میں اس کی شان و شوکت کا کوئی مدرسہ موجود نہ تھا اسی کے ایک گوشہ میں بانی مدرسہ سلطان حسین مرزا بالیقرہ کی قبر ہے۔

ہرات میں جو ارباب کمال جمع تھے ان میں زبدۃ التواریخ کا مصنف نور الدین لطف اللہ معروف بہ حافظ ابرو بھی شامل ہے جس نے یہ کتاب ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) میں لکھی تھی اُس عہد کا نامور ترین خوش نویس میر علی الحسینی سلطان حسین مرزا کے دربار سے منسلک تھا اس کی لکھی ہوئی کتابیں مختلف کتب[1] خانوں میں پائی جاتی ہیں ان میں کی ایک کتاب عارفی کی مثنوی گوئے چوگان کتب خانہ مسلم یونیورسٹی

---

[1] ملاحظہ ہو مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱ ص ۱۳۱ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

علی گڑھ میں ہے جسے میر علی نے ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء میں بمقام ہرات لکھا تھا اس میں بہزاد کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر ہیں جو ایشیا کا بہترین کلاسیکی مصور مانا گیا ہے اس کے قدر دانوں اور مربیوں میں سلطان حسین مرزا اور اس کے وزیر میر علی شیر نوائی[1] کے نام آتے ہیں براؤن نے تو یہ کہا ہے کہ بہزاد کی شہرت بڑی حد تک علی شیر نوائی کی ہمت افزائی کا نتیجہ تھی یہ وزیر علم و ہنر کا بہت بڑا مربی تھا اس کے علمی کاموں کی یادگار **کتب خانہ جامع علی شیر** اور **کتب خانہ مدرسہ اخلاصیہ** ہیں ان علمی مراکز کی نسبت لکھا ہے کہ یہاں بڑے بڑے فضلا، مذہبی مسائل اور عقلی علوم کی تحقیق و تفتیش میں مصروف رہتے تھے خود **میر علی شیر کا کتب خانہ** تاریخ کی اعلیٰ کتابوں سے معمور تھا اور ان سے استفادہ کرنے کی اجازت اس نے اہل علم کو دے رکھی تھی انھیں کتابوں کے مطالعہ کے بعد شیخ غیاث الدین ابن ہمام الدین خواندمیر[2] کو تاریخ اسلام کا ایک جامع مجلد مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار[3] لکھی اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"تا در سال نہصد و چار از ہجرت نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم ہر کتابے کہ مشتمل بر فن تاریخ و اخبار در ......

---

[1] میر علی شیر نوائی کا ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء میں انتقال ہوا [2] خواندمیر کی ایک اہم تصنیف حبیب السیر بھی ہے جو اس نے ۹۲۹ھ میں لکھی اس کا ایک قلمی نسخہ مرطلا مذہب اور بہت اچھا لکھا ہوا مشہد مقدس کے کتب خانہ میں ہے [3] اس کا ایک قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے جس کی فہرست ص ۱۰۴ و ۱۰۵ پر درج ہے کہ اپنے مصنف کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور اس سے قدیم مکتوبہ نسخہ کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔

کتب خانۂ معمورۂ آں بزرگوار موجود بود تسلیم این بے بضاعت
نمودند وبمطالعۂ آنہا ترغیب وتحریص فرمودند"

ہرات میں بھی بہت سے مدارس تھے۔ ان میں مدرسۂ نظامیہ کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جس سے مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) نے فیض حاصل کیا تھا۔ لکھا[۱] ہے کہ "جامی اپنے والد نظام الدین دشتی کے ساتھ ہرات میں وارد ہوکر مدرسہ نظامیہ میں سکونت پذیر ہوئے اور فضلائے زمانہ مثلاً جنید اصولی اور مولانا خواجہ علی سمرقندی وغیرہ سے تحصیل علوم کی اور بلند پایہ علامہ بن گئے جامی لڑکپن میں ذہین اور محنتی جوانی میں عالم باعمل اور پیری میں مولانا اور پیر تھے"۔ پچاس سے زائد کتابیں لکھیں جن میں شرح ملا جامی، بہارستان، نفحات الانس، مثنوی یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور لوائح جامی بہت مشہور ہیں۔

جامع مسجد ہرات کے مدرسہ جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ جامع مسجد کی طرح عظیم الشان تھا اس مسجد کے متعلق لکھا[۲] ہے کہ اس میں ۲ عظیم الشان ایوان ۶ دروازے، ۷۰۴ گنبد، ۱۸۰ رواق اور ۸۰۴ ستون تھے اس سے ملحق ایک مدرسہ اور کتب خانہ تھا۔ یہ مسجد سلطان غیاث الدین غوری نے ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء میں نئے سرے سے تعمیر کرائی تھی اور اسی وقت یہ مدرسہ بھی بنوایا تھا کہا جاتا ہے کہ یہ امام فخرالدین رازی کے درس و تدریس کی غرض سے بنوائی گئی تھی اور آپ ہی کی وجہ سے اس مسجد نے ایک جامعہ کی شکل اختیار کرلی تھی دنیا

ا-۲ھ رسالہ برہان دہلی جلد ۶ ص ۲۰۴ و ۲۵۹ھ

کے ہر گوشہ سے طالبانِ علم آپ سے استفادہ کرنے آتے تھے آخر فلسفہ و حکمت کا یہ جید عالم اور انتہی کتابوں کا مصنف ۶۰۶ھ میں یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہرگز دلِ من ز علم محروم نہ شد	کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال درس گفتم شب و [روز]	معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

نیشاپور

قرونِ وسطیٰ میں اسلامی علوم کے اہلِ کمال زیادہ تر صوبہ خراسان کے شہروں نیشاپور، مرو، بلخ اور طوس وغیرہ میں پیدا ہوئے۔ عمر خیامؔ شیخ فریدؔ الدین عطار جیسے عالم اور صوفی نیشاپور کی خاک سے اٹھے نواح طوس کا ایک قصبہ طاہران امام غزالی کا مولد ہے انھوں نے ابتدائی تعلیم طوس میں پائی اور یہیں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نیشاپور گئے جو اس وقت اعلیٰ درجے کے مدرسوں اور کتب خانوں سے معمور تھا۔ یہاں پہلا مدرسہ امام ابو محمد بن حسن بن فورک (متوفی ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء) کے لئے تعمیر ہوا تھا دوسرا مدرسہ بیہقیہ تھا جس میں امام غزالی کے استاد امام الحرمین نے تعلیم پائی تھی اس وقت امام ابو القاسم اسکافی اس کے صدر مدرس تھے ان مدرسوں کے سوا مدرسہ سعدیہ اور نصریہ بھی تھے اسی شہر میں امام موفق جیسے جید عالم کی درس گاہ تھی جس میں عمر خیام، نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح نے تعلیم حاصل کی۔

امام موفق کے یہ تینوں شاگرد بڑے مرتبہ پر پہونچے نظام الملک طوسی

۱؎ عمر خیام نیشاپور میں ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء میں پیدا ہوا اور یہیں ۵۲۶ھ میں وفات پائی اسکی مفصل سوانح کے لئے ملاحظہ ہو "خیام" از سید سلیمان ندوی (مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۳ء)

۲؎ عطار (متوفی ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء) صوفی شعرا میں اتنا اونچا درجہ رکھتے تھے کہ جلال الدین رومی نے ان کو اپنا پیشوا اور بزرگ کہا ہے ان کی معرفت اور تصوف میں بہت سی تصانیف ہیں مثنویوں میں مصیبت نامہ، الٰہی نامہ، خسرو نامہ، پند نامہ، اسرار نامہ، جواہر نامہ، مختار نامہ اور منطق الطیر مشہور ہیں غزلیات اور قصائد کا ایک دیوان بھی ہے۔

نہایت نامور وزیر اور مدارس نظامیہ کا بانی ہوا عمر خیام ایک بلند پایہ حکیم شاعر اور زبردست ماہر نجوم تھا لیکن ان میں حسن بن صباح[1] وہ گمراہ عالم ہوا جس کی تخریبی سرگرمیاں اُمت اسلامیہ کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھیں وہ فرقہ باطنیہ کا بانی تھا اس نے نہایت چالاکی اور ہمت سے خراسان کے پہاڑی قلعہ الموت پر قبضہ کر لیا یہ قلعہ جہاں بادشاہوں، وزیروں اور علماء کو قتل کرنے کے لئے منصوبے بنائے جاتے تھے کتابوں کے ذخیرے بھی رکھتا تھا **قلعہ الموت کا کتب خانہ** حسن بن صباح کی موت کے ایک سو چھتیس برس بعد ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں ہلاکو نے جلوا دیا تھا لیکن ایک کتاب "سرگذشت سیدنا"[2] جلنے سے بچ گئی یہ حسن بن صباح کی وہ سوانح ہے جسے فرقہ اسماعیلیہ کی تاریخ کا اصلی سرمایہ کہا جاتا ہے اس کا مصنف حسن بن صباح کا شیخ واستاد عبدالملک ابن عطاش[2] تھا۔

نیشاپور میں شاہی، تعلیمی اور ذاتی کتب خانے موجود تھے آل بویہ کے ایک حکمران **عضدالدولہ کا کتب خانہ** یہاں تھا اس بادشاہ نے شیراز میں بھی ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس شہر میں **ابونصر سہل بن مرزبان کا کتب خانہ** بھی نہایت مشہور تھا۔ ابونصر کی نسبت شبلی نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی تمام دولت کتابیں جمع کرنے میں صرف کر دی اور صرف کتابوں کی

---

[1] حسن بن صباح کی سوانح نظام الملک طوسی (عبدالرزاق) کے ص ۹۰۵ پر دیکھئے اسی کتاب کے صفحہ ۵۶۰ پر اُن مشاہیر اسلام کی فہرست درج ہے جو حسن صباح اور اس کے جانشینوں کے عہد میں فدائیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "خیام" از سید سلیمان ندوی ص ۱۴

تلاش و جستجو میں اکثر بغداد کا سفر کیا اور نادر کتابیں بہم پہنچائیں۔

تعلیمی کتب خانوں میں مدرسہ نظامیہ کا کتب خانہ بہت بڑا تھا یہ مدرسہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۶ھ (۱۰۶۳ء) میں امام الحرمین کے لئے بنوایا تھا جن کے درس میں روزانہ تین سو طلباء اور علماء شریک ہوتے تھے۔ امام غزالی بھی اسی مدرسہ کے طالب علم تھے سلجوقیوں کے عہد میں نیشاپور کی سیاسی اور علمی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اس لئے کہ یہ طغرل بیگ اور الپ ارسلان سلجوقی کا پایہ تخت تھا اور یہ سلاطین بڑے علم دوست تھے ان کے عہد میں بہت سے مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے ان میں طغرل کے وزیر عبدالملک کندری کا کتب خانہ اس لئے مشہور ہے کہ یہ شخص علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ کندری کی طرح اور بہت سے اہل علم بالخصوص مشائخ و صوفی شعراء سلجوقی دور میں پیدا ہوئے اور تصوف و تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں جن میں فریدالدین عطار کی تذکرہ الاولیاء اور ابوبکر محمد راوندی کی راحت الصدور (سلجوقیوں کی تاریخ) اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

غرض نیشاپور میں عہد بہ عہد جو کتب خانے اور مدرسے قائم ہوئے ان کی تعداد کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ ۵۵۶ھ (۱۱۶۰ء) میں یہاں کے فسادات کے موقع پر چھبیس مدرسے اور بارہ کتب خانے[1] برباد ہوئے۔

---

[1] رسائل شبلی ص ۴۵۔

مرو

یہ شہر بھی بے نظیر اہل علم اور کتابوں سے بھرا ہوا تھا ایک مشہور صوفی بزرگ ابوسعید ابی الخیر[1] (متوفی ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں ابوعبداللہ الحصری کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جو اس زمانہ کے مشہور فقیہ اور علم طریقت کے عالم تھے یاقوت حموی نے اپنی کتاب معجم البلدان مرتب کرتے وقت مرو کے کتب خانوں سے استفادہ کیا تھا اس کتاب میں اس نے اُن دس عظیم الشان کتب خانوں کا ذکر کیا ہے جو مرو کی جامع مسجد اور مدرسوں میں موجود تھے ان میں یہ تین خاص اہمیت کے حامل تھے۔ کتب خانہ نظامیہ، کتب خانہ عزیزیہ اور کتب خانہ الدمریہ۔

مرو کے کتب خانوں سے اہل علم بہ آسانی استفادہ کر سکتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یاقوت حموی کو الدمریہ کے کتب خانہ سے تقریباً دوسو کتابیں بلا ضمانت اشیہ کردی گئی تھیں یاقوت ۵۷۵ھ/ ۱۱۷۹ء میں بمقام بغداد پیدا ہوا اور ۶۲۶ھ میں حلب میں انتقال کیا اس نے تاجر کا سیاح اور جغرافیہ داں کی حیثیت سے بڑا نام پایا جغرافیہ پر عربی میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یاقوت کی معجم البلدان نہایت جامع اور مستند کتاب ہے اس کے علاوہ اس نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں معجم الادبا مشہور ہے۔

---

[1] ابوسعید کے حالات اور کرامات وغیرہ پر ایک کتاب اسرار التوحید مولفہ محمد ابن منور ہے

بلخ

بلخ اسلام سے پہلے اپنے آتشکدۂ نوبہار کی وجہ سے مشہور تھا جس کے متولی برامکہ تھے جب یہ شہر اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تو اس وقت اس کا آتشکدہ سرد ہو گیا اور علم کی شمعیں روشن ہو گئیں مدرسے اور کتبخانے قائم ہوئے جن میں مدرسہ نظامیہ کا کتبخانہ صدیوں تک باقی رہا اس مدرسے میں رشید الدین وطواط بلخی نے کچھ عرصہ تعلیم پائی تھی اس نے حدائق السحر فی دقائق الشعر لکھی جو فارسی میں صنائع شعری پر قدیم ترین کتاب کہی جاتی ہے رشید کے علاوہ بلخ میں اور بھی ممتاز شاعر اور ابو معشر منجم جیسے اہل کمال پیدا ہوئے نواحی بلخ میں ایک مقام قبادیان حکیم ناصر خسرو کا مولد ہے اس نے ۴۸۱ھ میں وفات پائی اور بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں زاد المسافرین سفرنامہ روشنائی نامہ سعادت نامہ مشہور ہیں۔ بلخ کے ایک قصبہ فاریاب میں ظہیر فاریابی پیدا ہوا جو چھٹی صدی ہجری کا مشہور شاعر ہے۔ مقامات حمیدی کا مصنف حمید الدین ابو بکر بن محمود (متوفی ۵۵۹ھ) بلخ کا قاضی تھا مگر یہ سرزمین مولانا جلال الدین رومی جیسے فخر روزگار صوفی شاعر اور عالم پر ہمیشہ ناز کرے گی جن کی تصانیف آج تک مشرق و مغرب کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں مولانا ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے سلطان علاء الدین کیقباد کی دعوت پر اس کے پایہ تخت قونیہ گئے اور وہیں ۶۷۲ھ / ۱۲۷۲ء میں انتقال ہوا مولانا کی تصانیف میں ایک ضخیم مجموعۂ غزلیات ہے جو دیوان شمس تبریز کے نام سے جمع کیا گیا ہے نثر میں ان کے ملفوظات (فیہ ما فیہ)

شائع ہو چکے ہیں لیکن مولانا کا شاہکار مثنوی معنوی ہے اس کی جس قدر شرحیں مختلف زبانوں میں لکھی گئیں اتنی غالباً کسی دوسری فارسی کتاب کی نہیں لکھی گئیں مثنوی معنوی فارسی زبان میں صوفیانہ شاعری کی بے بہا کتاب ہے جن میں اشعار کی تعداد ۲۶ ہزار سے زاید ہے اور جو سوزِ عشق، عرفانی افکار اور صوفیانہ نکات سے لبریز ہیں اس میں توکل کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر بآواز بلند ۔۔۔ با توکل زانوی اشتر ببند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو ۔۔۔ از توکل در سبب کاہل مشو

گر توکل می‌کنی در کار کن ۔۔۔ کسب کن پس تکیہ بر جبار کن
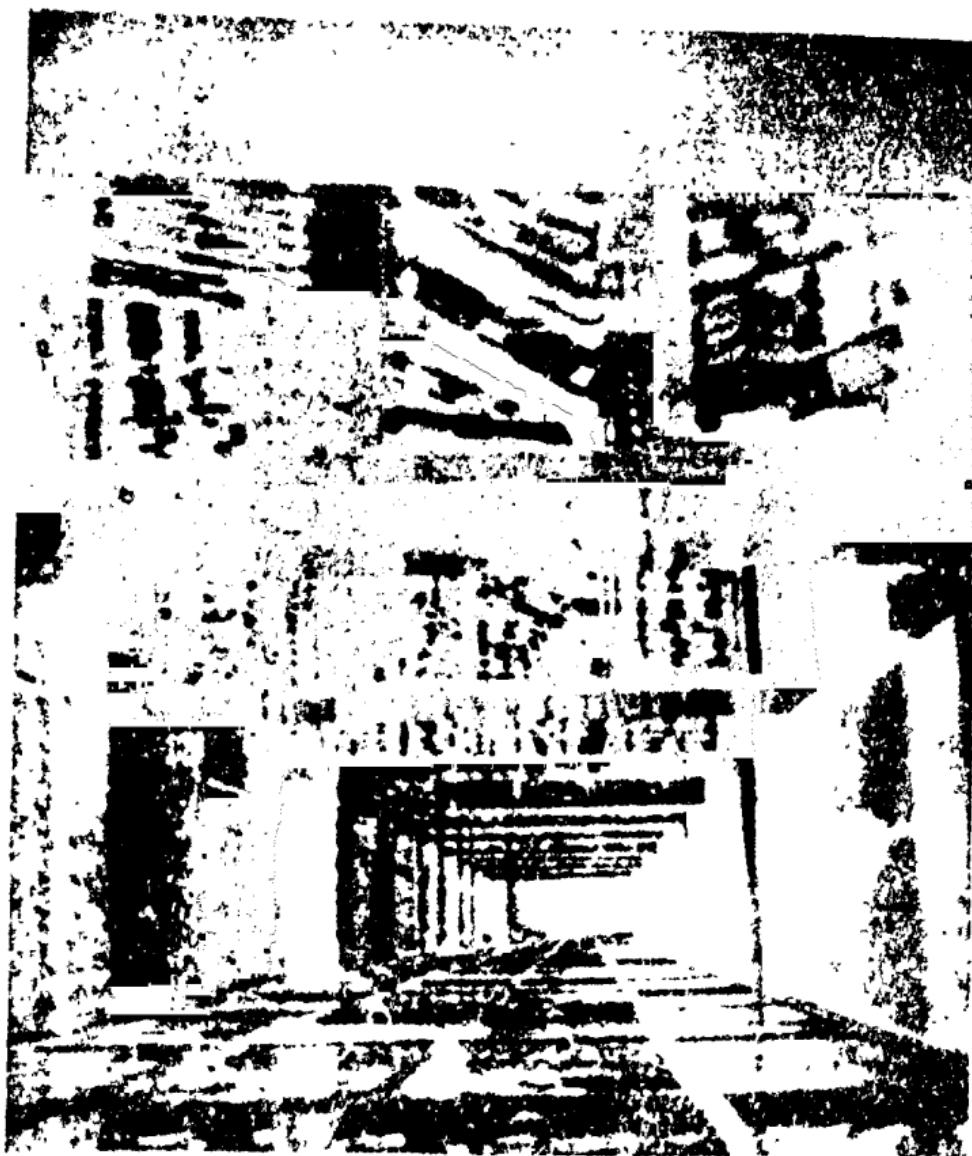
کتب خانۂ مشہدِ مقدس کا شعبۂ مخطوطات

طوس

طوس ایک نہایت قدیم شہر ہے جو خلیفہ سوم کے عہد میں اسلامی سلطنت میں شامل ہوا اور پھر اہل علم کا مسکن بن گیا۔ یہ ہی شہر شیخ الطائفہ ابو جعفر طاؤس الفقرا ابونصر سراج، وزیر نظام الملک، نصیر الدین طوسی، فردوسی اسدی کا وطن اور امام غزالی و خلیفہ ہارون رشید کا مدفن ہے لکھا ہے کہ خواجہ نظام الملک طوسی نے مدارس کے قیام کا جو سلسلہ جاری کیا تھا اس کی ابتدا طوس ہی سے ہوئی تھی اس نے سب سے پہلے یہیں ایک مدرسہ قائم کیا اس کے بعد مدرسہ نظامیہ بغداد قائم ہوا تھا۔

طوس میں عہد بہ عہد جو کتب خانے قائم ہوئے ان سب کا سرتاج کتب خانۂ مشہد مقدس ہے جو امام علی رضاؒ کے مزار سے وابستہ ہے آپ ۱۴۸ھ میں بمقام مدینہ پیدا ہوئے اور ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں طوس میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے اس وقت سے یہ شہر مشہد مقدس کہلایا جانے لگا۔ امام ممدوح فرقہ امامیہ کے آٹھویں امام ہیں آپ کے دادا امام جعفر صادق علیہ السلام (متوفی ۱۴۸ھ) جلیل القدر تابعی اور بہت بڑے عالم تھے آپ کی مسند امامت پر امام موسیٰ کاظمؒ متمکن ہوئے اور ۱۸۳ھ میں رحلت فرمائی آپ کے بیٹے امام علی رضاؒ میں علم اور زہد تقویٰ جمع تھے صحیفۃ الرضا، طب الرضا اور مسند امام رضا آپ کی مشہور تصانیف ہیں مسند امام رضا کا

ل مشاہیر طوس کی فہرست نظام الملک طوسی از عبدالرزاق کے ص ۲۵ پر دیکھیے۔

ایک قلمی نسخہ کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ حبیب گنج لائبریری میں محفوظ ہے
یہ ۱۱۱۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۹۵ حدیثیں ہیں۔

ایطوس کی ساری عظمت و شان مزار امام علی رضاؑ اور اس کے کتب خانہ
کی وجہ سے ہے یہ کتب خانہ صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ تمام علمی دنیا میں قدر و منزلت
کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اب تک دستِ فنا
کی زد سے محفوظ رہا اور تقریباً ایک ہزار برس سے اس کا علمی فیض جاری ہے اس
کے قیام کی صحیح تاریخ تو نہیں ملتی لیکن ایک بزرگ ابوالبرکات علی ابن حسین نے
اپنی جو کتابیں اس کو وقف کی ہیں ان پر وقف کرنے کی تاریخ ۴۲۱ ہجری
درج ہے اس حساب سے اس کتب خانہ کی عمر ۹۶۱ سال سے زیادہ ہوئی۔

مشہد مقدس کا کتب خانہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مذہبی کتب خانہ
ہے جس کا آغاز مذہبی کتابوں سے ہوا تھا مگر اب اس میں قرآن اور حدیث کے
علاوہ حکمت و فلسفہ منطق اور فقہ وغیرہ کی بھی کئی ہزار کتابیں موجود ہیں جن
کا کٹلاگ "فہرست کتب خانہ آستانہ قدس رضوی" کے نام سے کئی جلدوں
میں ایران سے شائع ہوا ہے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس
میں نفیس مخطوطات کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جو دنیا کے کسی دوسرے
کتب خانہ میں نہیں ہے آئمہ اہلبیتؑ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے اس
کتب خانہ کے بہت قیمتی نوادر ہیں۔

شیراز

ایران کے مرکزی شہر شیراز کا علمی وقار ظاہر کرنے کے لئے صرف سعدی
اور حافظ کا نام لینا کافی ہے جنہوں نے فارسی ادبیات کا چہرہ روشن اور منور
کر دیا ہے مگر ان حضرات سے کئی سو برس پہلے شیراز کی سرزمین علمی چرچوں سے
گونج رہی تھی جس کی نشانی **عضد الدولہ کا کتب خانہ** تھا اس بے نظیر
کتب خانہ میں عضد الدولہ نے وہ ساری کتابیں فراہم کیں جو ابتدائے اسلام
سے اس کے عہد تک تصنیف ہوئی تھیں بادشاہ کے جس محل میں یہ کتب خانہ
تھا اس کے متعلق علامہ بشاری[1] کا بیان ہے کہ میں نے تمام ممالک اسلامیہ میں
ایسی عمارت نہیں دیکھی اور میں قیاس کرتا ہوں کہ وہ بہشت کے نمونے کے موافق
بنائی گئی ہے علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ ایک نہایت لمبا مکان ہے اور
اس میں ہر طرف متعدد کمرے ہیں جن میں بہت سی الماریاں دیوار سے
لگی کھڑی ہیں یہ الماریاں تین تین گز چوڑی اور قد آدم اونچی ہیں لکڑی عموماً
منقش اور مذہب ہے ہر فن کے لئے جدا کمرہ ہے اور اس کی جداگانہ فہرست
ہے کتب خانہ کے اہتمام اور نگرانی کے لئے وکیل اور خزانچی اور محاسب مقرر
ہیں اور بجز مقررہ آدمیوں کے کسی شخص کا وہاں گذر نہیں ہو سکتا۔[2]

عضد الدولہ (۳۲۸ھ / ۹۴۹ء - ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء) خاندان

---

[1] شمس الدین ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البنا الشامی المقدسی المعروف بالبشاری مصنف "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" (مطبوعہ برل لیڈن ۱۹۰۶) [2] رسائل شبلی ص ۳۶

بویہ میں نہایت مقتدر اور ہرد لعزیز بادشاہ گذرا ہے جس کے دربار میں ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ ھ) کو بڑا تقرب حاصل تھا اس بلند پایہ عالم اور مورخ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں "تجارب الامم و تعاقب الہمم" نہایت مشہور ہے یہ حسب بیان ادگا نیوڈ کتب خانہ ابن العمید کا مہتمم بھی تھا ابوالفضل ابن العمید (متوفی ۳۶۰ھ/۹۷۰ء) بڑا صاحب علم و فضل تھا اس کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں سو اونٹوں کے بوجھ کی برابر تھیں جنہیں وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ابن مسکویہ نے لکھا ہے۔

"اس وزیر کے مکان کو ڈاکوؤں نے اس قدر لوٹا تھا کہ پانی پینے کا ایک پیالہ اور بیٹھنے کو چٹائی تک باقی نہ رہنے دی لیکن اسے اس کی کچھ پرواہ نہ تھی اس کا دل تو اپنے کتب خانہ میں لگا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کتب خانہ کی نسبت دریافت کیا میں نے عرض کی کتابیں سب کی سب بچ گئی ہیں اور ایک بھی گم نہیں ہوئی اس پر اس نے کہا واقعی تم بڑے نیک فال ہو ہمیں ہر چیز مل سکتی ہے مگر یہ کتابیں کہاں سے ملتیں میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر بشاشت نمودار ہوگئی"۔

خاندان بویہ کے وزرا میں صاحب ابن عباد کا کتب خانہ بھی اتنا بڑا تھا کہ اس میں صرف دینیات کی کتابیں چار سو اونٹوں کا بوجھ تھیں

---

[۱] ادگا نیوڈ ص ۱۰

اس وزیر کا نام ابوالقاسم اسمٰعیل بن ابوالحسن عباد اور لقب صاحب تھا۔ وزرا میں یہ پہلا شخص ہے جسے صاحب کا لقب ملا۔ یہ عضدالدولہ کے بھائی مویدالدولہ کا وزیر تھا اس کے انتقال کے بعد فخرالدولہ کا وزیر ہوا صاحب ابن عباد (متوفی ۳۸۵ھ/۹۹۵ء) اپنے زمانہ کا علامہ تھا۔ اس کی تصنیف میں المحیط (لغت) مشہور ہے۔ اس وزیر کو اپنے کتب خانہ سے اتنی محبت تھی کہ جب سامانی خاندان کے فرماں روا نوح بن منصور نے اسے وزارت کے لئے بخارا بلایا تو اس نے یہ عہدہ قبول کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ اسے اپنا کتب خانہ لے جانے میں بڑی دشواری ہوگی۔ ابن عباد کتب بینی کا بھی اتنا شائق تھا کہ سفر میں تیس اونٹوں پر کتابیں ساتھ رہتی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ ابتدائی ممالک عراق، شام، ایران، خراسان، ترکستان اور افغانستان اسلام کے زیر نگیں آ کر علم و فن کے مخزن بن گئے تھے ان علاقوں پر مختلف حکمراں[1] خاندان اموی، عباسی، سامانی، غزنوی، بویہ، سلجوقی، زنگی، ایوبی، خوارزم شاہی، تیموری، صفوی اور قاچاری وغیرہ اپنے اپنے زمانوں میں حکومت کرتے رہے مگر اس دور کی تاریخ کا روشن پہلو یہ ہے کہ ہر عہد میں بکثرت کتب خانے اور مدرسے وجود میں آئے بے شمار محدث، فقیہ، صوفیا، اولیا، شاعر، ادیب، مورخ، فلسفی، منجم و خطاط پیدا ہوئے جن کے نام رہتی دنیا تک تاریخ میں باقی رہیں گے۔

---

[1] تمام مسلم حکومتوں کی مختصر داستان سالنامہ نگار ۱۹۶۵ء (فرمانروایان اسلام نمبر) میں دیکھئے

صرف ایران کو لیجیے جہاں ظہور اسلام کے وقت ساسانی حکومت کر رہے تھے
اگرچہ انھوں نے یہاں چار سو برس تک حکمرانی کی اور ان کو اپنی دولت و حشمت اور
تہذیب و تمدن پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے آپ کو خداؤں کا خدا سمجھتے تھے مگر
ان کی خدائی میں علم کا کچھ بھی بھلا نہ ہوا اور وہ بقول مورخین صرف درباریں
اور مذہبی پیشواؤں تک محدود رہا جب عرب ایران آئے اور انہوں نے نہاوند[1]
کی جنگ میں ساسانی سلطنت کا چراغ گل کر دیا اس وقت ایران میں علم وادب
اور ترقی کا آفتاب طلوع ہوا اسلامی ایران میں وہاں کے قدیم علوم کو جو عروج ملا
انھیں عربی قالب میں ڈھال کر جس طرح سر بلند کیا گیا اس کی تفصیلات براؤن[2]
اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق[3] کی کتابیں واضح اور جامع طور پر پیش کر رہی ہیں مثال
کے طور پر یہاں قاآنی کے صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے یہ اگرچہ شیراز کے
متعلق ہے مگر حقیقت میں ایران کے دوسرے شہروں اصفہان اور تبریز وغیرہ بلکہ اس
زمانہ کی اسلامی دنیا کے ہر شہر کی تصویر اس میں نظر آتی ہے۔[4]

ہزار محفل و در ہر یکے ہزار ادیب ٭ ہزار مدرس و در ہر یکے ہزار اسفار

---

[1] نہاوند کی جنگ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی اس میں تقریباً تیس ہزار ایرانی مارے گئے اور ایرانیوں کا زور ہمیشہ کیلئے ٹوٹ گیا۔ چونکہ نہاوند کی فتح سے پورے عراق عجم مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے تھے اسی لئے اس فتح کو فتح الفتوح کہتے ہیں۔

[2] Brown History of Persian literature. 4 VOL

[3] تاریخ ادبیات ایرانی از ڈاکٹر رضا زادہ شفق مترجمہ سید مبارز الدین رفعت (ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۵ء) [4] اسفار یعنی کتابیں۔

قسطنطنیہ

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ترکوں کے علمی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ قابل فخر ہے وہ کتب خانے ہیں عیسائی مورخین کریزی[1] یورسلے[2] اور لارپنٹ[3] وغیرہ نے بھی ترکوں کی علم دوستی کی بہت تعریف کی ہے مصنف "دولت عثمانیہ" کا بیان ہے کہ سلطان اورخان نے ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا چونکہ کتب خانے مدرسوں کا جز ولاینفک ہیں اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ

سلطنتِ عثمانیہ میں کتب خانوں کے قیام کی ابتدا، ترکی حکومت

کے دوسرے بادشاہ اورخان متوفی (۱۳۵۹ء) کے عہد میں ہوگئی تھی اس کے بعد دوسرے ترکی سلاطین اور دیگر اصحاب ذوق نے کتب خانے قائم کئے اور مدرسے کھولے کہا جاتا ہے کہ ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو اس طرح ہر دور میں تعلیمی کتب خانے موجود تھے خصوصاً سلطان محمد خان ثانی (متوفی ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ کے عہد میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اس سلطان کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے تعلیم پھیلانے میں بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا اپنی مملکت کے ہر قصبہ اور ہر شہر میں مدارس

---

(1) History of the Ottoman Turks by Sir Edward S. Creasy. (2) Turkish Empire by Eversley (3) Turkey by Sir George Larpent.

[4] تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ شبلی کا رسالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" اور ڈاکٹر محمد عزیز کی "دولت عثمانیہ" جلد دوم ص ۳۹۰ (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء)

کھولے قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیا ڈالی جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ ہاؤس تھے مصنف دولت عثمانیہ کے اس بیان میں اتنا اضافہ کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ ان سارے مدرسوں کے ساتھ کتب خانے بھی موجود تھے۔

کتب خانوں اور مدرسوں کو ترقی دینے میں سلیمان اعظم (متوفی ۱۵۶۶ء) نے بھی نمایاں حصہ لیا اس نے تعلیمی نظام کو اتنی وسعت دی کہ مکہ معظمہ میں بھی چار مدرسے قائم کر دئیے اس زمانہ کے کتب خانوں میں سلیمان کے وزیر اعظم رستم پاشا کا کتب خانہ بھی تھا جس میں قرآن پاک کے چھ سو نسخے اور پانچ ہزار دوسری کتابیں تھیں سلطان احمد ثالث (متوفی ۱۷۳۰ء) کے عہد میں مطبع جاری ہو جانے کی وجہ سے کتب خانوں کی ترقی کی راہیں کشادہ ہو گئیں محمود اول متوفی ۱۷۵۴ء نے قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتب خانے قائم کئے اور جامعہ نور عثمانی کی تعمیر شروع کی مگر اس دور میں کریمیا کی جنگ سے کتب خانوں کی ترقی کی ساری تدبیریں خاک میں مل گئیں روسی فوجوں نے شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی اور باشندوں کو تہ تیغ کیا قدیم یادگاریں بے رحمی کے ساتھ مٹا دیں اور کتب خانے و مدرسے شعلوں کی نذر کر دئیے۔[۵۲]

لیکن ان علمی نقصانات کی تلافی مصطفےٰ ثالث (متوفی ۱۷۷۳ء) اور سلیم ثالث (متوفی ۱۸۰۷ء) کے عہد میں ہو گئی لکھا ہے کہ مصطفےٰ کے زمانہ میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر ۲۷۵ مدرسے یا یوں کہئے کہ ۲۷۵ تعلیمی کتب خانے تھے اس بادشاہ کے صدر اعظم راغب پاشا نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک کتب خانہ عام قائم کیا تھا جو کتب خانہ راغب پاشا کے نام سے مشہور ہے سلطان سلیم ثالث کے عہد میں بھی بہت سے نئے مدرسے قائم ہوئے اور ایک جدید بحری مدرسہ کھلا

---

[۵۲] دولت عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیر جلد اول ص ۲۲۹، ۳۴۹

اس دور کے کتب خانوں میں مدرسہ توپچیہ کا کتب خانہ نہایت اہم تھا اس میں کتابوں کی تعداد تو صرف چار سو تھی[1] مگر یہاں وہ تمام اہم کتابیں جمع تھیں جو یورپ میں جدید فنون جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ترکوں کی عظیم الشان فتوحات سے ترکی کتب خانوں کو بے انتہا نفع پہونچا۔ سلطان محمد خاں ثانی نے ۱۴۵۲ء میں مسیحی یورپ کے مرکز قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا سلطان سلیم اول (متوفی ۱۵۲۰ء) کے عہد میں مصر، شام اور حجاز بھی ترکی سلطنت میں شامل ہو گئے ۱۶۳۸ء میں مراد چہارم نے بغداد پر قبضہ کر لیا ظاہر ہے کہ ان فتوحات میں دولت بنی امیہ اور بنی عباس کا علمی اندوختہ ترکوں کے ہاتھ آیا ہوگا اور وہ بچی کھچی کتابیں انھیں ملی ہوں گی جو کبھی بغداد، قاہرہ، دمشق وغیرہ کے کتب خانوں میں تھیں جس کی تصدیق علامہ شبلی کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تھے انھوں نے اپنے سفر نامہ[2] میں لکھا ہے کہ "یہ شہر تمام اسلامی دنیا میں عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے یہاں ۴۵ کتب خانے ۱۶۴ مدارس قدیمہ، ۵۰ مدارس جدید اور ۱۲ کالج ہیں" قسطنطنیہ کا شاہی کتب خانہ شبلی نے نہایت قدیم بتایا ہے اور پچھلے سلاطین اور امراء وغیرہ کے کتب خانوں کے نام بھی دیدئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

کتب خانہ جامع ایا صوفیہ، کتب خانہ جامع بایزید، کتب خانہ حمیدیہ قدیمہ، کتب خانہ جامع محمد فاتح، کتب خانہ علی پاشا شہید، کتب خانہ لالہ لی،

---

[1] دولت عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیز ج اص ۵۱۰ [2] سفر نامہ روم و مصر و شام از شبلی نعمانی ص ۳۶، ۸۱ — ۹۱ (مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۴ء)

کتب خانہ اُغلی ملی پاشا، کتب خانہ عاشر آفندی، کتب خانہ سلیمیہ
کتب خانہ جامع والدہ سلطان، کتب خانہ شہزادہ واماد ابراہیم پاشا
کتب خانہ سلیمانیہ، کتب خانہ راغب پاشا۔

ان کتب خانوں میں بقول علامہ شبلی کتابوں کی مجموعی تعداد پچاسی ہزار تھی عہد عباسی میں یونانی اور مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے ان میں سے کچھ اُس وقت تک یہاں محفوظ تھے عبد القاہر جرجانی کی اسرار البلاغہ یاقوت حموی کی معجم الادبا، البلاذری کی کتاب الاشرف اور امام بخاری کی تاریخ کبیر کے صحیح اور مستند نسخے یہاں شبلی کی نظر سے گذرے تھے وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ و ادب کی نایاب تصنیفات اور مشہور حکمار اور آئمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں امام غزالی بوعلی سینا فخر رازی اور فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں اکثر یہاں موجود ہیں۔ کتب خانہ ایا صوفیہ میں ایک جرمن مستشرق ہلمٹ رٹر (Helmut Ritter) کو دیوان حافظ کا ایک نسخہ ملا تھا جس کی کتابت ۸۱۳ھ اور ۸۱۷ھ کے درمیان ہوئی تھی اور جو اس وقت تک دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم کہا جاتا ہے۔[1]

یہ ہی وہ کتابیں ہیں جنھیں دیکھکر بقول علامہ شبلی حیرت ہوتی ہے کہ ان کتابوں کے ایسے عجیب و غریب نسخے کہاں سے بہم پہونچائے ہیں۔

---

[1] مجلہ علوم اسلامیہ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) جلد ۱ ص ۵۹

شمالی افریقہ

شمالی افریقہ کے خشک صحراؤں میں مسلمانوں کے قدم سے علم و فضل کے جو چشمے پھوٹے تھے وہ کتب خانہ جامع زیتون تونس، کتب خانہ رباط مراکش، کتب خانۂ مدرسہ تلمسان کی شکل میں آج تک موجود ہیں۔

افریقہ کو عقبہ بن نافع نے فتح کرکے ۵۵ھ/۶۷۵ء میں شہر قیروان کی بنیاد ڈالی اور مسجد قیروان تعمیر کی۔ وہ اسلامی قلمرو کو بڑھانے کی ایسی تڑپ اور لگن رکھتے تھے کہ خشکی ختم ہونے کے بعد انھوں نے اپنا گھوڑا بحر اقیانوس میں ڈال دیا اور نعرہ تکبیر بلند کرکے کہا "اگر مجھے سمندر نہ روک لیتا تو میں خدا کا نام اور پیغام سارے مغرب میں پہونچا دیتا" ان کے اس کارنامۂ عجیب کو ڈاکٹر اقبال نے "شکوہ" کے ان اشعار میں قلمبند کر دیا ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

افریقہ میں مسلمانوں کی آمد کے وقت زیادہ تر بربری قوم آباد تھی جو اپنی وحشت اور بربریت کے لئے مشہور ہے لیکن اسلام کے اثر سے یہ لوگ مہذب اور شائستہ ہوئے اور ان میں پڑھنے پڑھانے اور کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا جب دوسری صدی ہجری میں افریقہ کا رشتہ عباسی سلطنت سے منقطع ہو گیا تو بربری خاندانوں (ادریسی، مرابطین، موحدین،

مرینی حفصی وغیرہ) کی یکے بعد دیگرے حکومتیں قائم ہوئیں ادریسی خاندان کے عہد (۲/ ۱ھ/ ۸۸ء - ۵ ۳۷ ھ/ ۹۸۵ء) میں فاس آباد ہوا اور علم کا مرکز بن گیا تھا اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں اسے اتنا عروج ملا کہ یہاں پانچ لاکھ باشندے اور آٹھ سو مسجدیں تھیں[۱] ان مسجدوں کے ساتھ سیکڑوں مدرسے اور کتب خانے ہوں گے بقول ڈاکٹر گستاولی بان فاس کا ایک کتب خانہ بیش بہا یونانی اور لاطینی قلمی کتابوں سے معمور تھا[۲].

مرابطین خاندان کے حکمراں یوسف بن تاشفین (متوفی ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء) نے مراکش آباد کرکے اُسے اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور وسط مغرب و الجزائر تک کا علاقہ فتح کرلیا اس کے عہد میں مراکش کے کتب خانے کافی ترقی کر گئے تھے یوسف کی فتوحات نے شمالی افریقہ اور اندلس کے درمیان ایسے علمی رابطے پیدا کر دئے کہ اندلسی کتب خانوں کی بہترین کتابیں مراکش پہونچ گئیں جن سے یہاں کے کتب خانوں کے ذخائر میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا یوسف بن تاشفین نے نہ صرف تمام شمالی افریقہ پر حکمرانی کی بلکہ اندلس میں عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پامال کرکے تمام اندلس پر قبضہ کرلیا تھا.

یوسف اور اس کا جانشین علی دونوں بڑے عابد وزاہد اور علم پرور تھے مگر افراط و تفریط کی راہیں اختیار کرنے کی وجہ سے ان کی علم دوستی زیادہ سودمند ثابت نہ ہوئی ان کے عہد میں کتب خانے علم کلام اور فلسفہ کی کتابوں سے خالی ہو گئے کیونکہ ان بادشاہوں کا رجحان مالکی فقہ کی طرف حد سے زیادہ

[۱،۲] تمدن عرب : از ڈاکٹر گستاولی بان ص ۱۰۱۶ ۲

تھا اور وہ فلسفہ وعلم کلام کے اتنے شدید مخالف ہو گئے تھے کہ امام غزالی کی تصانیف رکھنے والوں کو گردن زدنی قرار دے دیا تھا ان کا یہ طرز عمل بالآخر مرابطین کی تباہی کا سبب بن گیا مورخ اکبر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ایک روز کسی نے امام غزالی سے کہا کہ علی بن یوسف بن تاشقین نے آپ کی کتابیں جلا ڈالنے کا حکم دیا ہے انھوں نے فرمایا کہ اس کا ملک برباد ہو جائے گا اور ابن تومرت جو اس وقت موجود تھا اس کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ علی کے ملک و سلطنت کی بربادی اس شخص کے ذریعہ عمل میں آئے گی امام غزالی کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور مرابطین کی جگہ موحدین آگئے۔

موحدین کے عہد میں مراکش کے کتب خانے امام غزالی کی تصانیف اور فلسفہ و علم کلام کی کتابوں سے معمور ہو گئے اس زمانہ میں دینی علوم کے علاوہ فلسفہ نے بھی ترقی کی اور امام غزالی کی تصانیف جو مرابطین کے عہد میں ممنوع الاشاعت قرار دیدی گئی تھیں اب آزادی سے پڑھی جانے لگیں۔

موحدین سلطنت کے بانی محمد بن عبد اللہ تومرت (متوفی ۵۲۴ھ/۱۱۲۹ء) نے علوم دینیہ اور فقہ وغیرہ کی تعلیم تو بغداد میں ابوبکر شاشی سے حاصل کی تھی مگر امام غزالی سے بھی کسب فیض کیا تھا اس نے مہدی کا لقب حاصل کرکے مرابطین کے خلاف خروج کیا اور انھیں ختم کرکے موحدین کی سلطنت قائم کی اس کے جانشینوں میں عبد المومن (متوفی ۵۵۸ھ) ابو یعقوب یوسف (متوفی ۵۸۰ھ) اور ابو یوسف منصور (متوفی ۵۹۵ھ) کے زمانہ میں ان کی سلطنت جس کا مرکز مراکش تھا نہایت وسیع ہو گئی تھی اس میں پولستانی

افریقہ اور اندلس شامل تھے ان بادشاہوں نے اپنے علمی ذوق کی بنا پر
جو کتب خانے قائم کئے ان میں ابویعقوب کا کتب خانہ نہایت عظیم الشان
تھا اس بادشاہ کے عہد میں فلسفہ نے خصوصی طور پر عروج پایا ایک نہایت
نامور فلسفی ابن طفیل کو اس نے اپنا طبیب خاص اور وزیر بنایا دوبور[لہ] نے لکھا
ہے کہ ابن طفیل کو "انسانوں کی بہ نسبت کتابوں سے زیادہ محبت تھی اپنے
آقا کے عظیم الشان کتب خانہ میں اس نے بہت سی کتابیں پڑھیں جن کی
اسے اپنے فن کے لئے ضرورت تھی یا جن سے اس کے علم کی پیاس بجھتی تھی"
موحدین خاندان کے فرماں رواؤں میں عبدالمومن دینی علوم سے زیادہ
رغبت رکھتا تھا اس کے عہد میں جو کتابیں مراکش پہونچیں ان میں حضرت
عثمانؓ کے عہد کا ایک قرآن مجید بھی تھا جس کی عبدالمومن نے بڑی قدر
اور تعظیم کی حسب بیان علامہ مقری[لہ] اس قرآن پاک کو ایک عجیب و غریب طریقہ پر سونے
چاندی سے منڈھ دیا گیا۔ کناروں پر ایسے بیش قیمت یاقوت، موتی زمرد سے کام کیا گیا کہ جو
بہت کم بادشاہوں کے خزانے میں نکلیں گے آبنوس اور دوسری قیمتی لکڑیوں کی ایک
منقش رحل بنائی گئی ایک تخت بنایا گیا جس پر یہ قرآن شریف رکھا جاتا تھا یہ تمام چیزیں
جواہر سے مرصع تھیں اس کے علاوہ ایک صندوق بھی ایسا ہی بیش قیمت تیار کرایا گیا اور ایسا ہی ایک چراغ دان تیار ہوا جو غلاف
کو کھول لینے سے قرآن شریف خود بخود کھل جاتا تھا اور بند کرنے سے بند ہو جاتا تھا یہ قرآن شریف
مع ان تمام چیزوں کے مراکش کی جامع مسجد میں رکھا گیا اور اس کی اتنی مرتبہ تلاوت ہوئی کہ جس کا شمار
کرنا مشکل ہے۔"

لہ تاریخ فلسفہ اسلام مصنفہ ٹی جے دوبور (T. J. De Boer) مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین
ص ۱۳۲ مطبع جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۲۷ء لہ نفح الطیب از علامہ مقری (اردو ترجمہ) ص ۳۲۰

مراکش میں مرینی خاندان کی حکومت ۵۹۱ھ میں قائم ہوئی اس خاندان کے حکمراں عبدالحق (متوفی ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) کے عہد میں **مدرسہ الصفارین کا کتب خانہ** ان کتابوں سے بھرا ہوا تھا جو سلطان موصوف نے اسپین کے مغلوب بادشاہ سانچو کے پاس سے طلب کی تھیں[1]۔ مرینی خاندان نے ۲۷۶ سال حکومت کی اس دوران میں ابوالحسن علی، ابوعنان، ابوسعید اور دوسرے بڑے بڑے بادشاہ گذرے جن کے عہد میں بھی مراکش کو علم و فضل کے مرکز بننے کا فخر حاصل رہا۔

تونس میں ابوذکریا یحییٰ کا کتب خانہ سو برس تک ارباب ذوق کو فیض پہونچاتا رہا حفصی خاندان کا یہ فرد تونس میں موحدین کا گورنر تھا مگر ۶۲۴ھ/۱۲۳۶ء میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے تونس کو پایہ تخت بنایا تھا یہاں مختلف زمانوں میں سیکڑوں مسجدیں، مدرسے اور ان کے ملحقہ کتب خانے رہے ان میں **مدرسہ زیتون کا کتب خانہ** اب تک موجود ہے آج سے کوئی ۲۰ سال قبل ایک بزرگ محمد ابن نسیم الشہابی المخزومی المدنی سیاحت کرتے ہوئے تونس پہنچے تھے انھوں نے اپنی سفرنامہ "الرحلۃ الحجازیہ" میں لکھا ہے کہ تونس میں ۱۳۶ مسجدیں ہیں ان میں مسجد زیتون سب سے بڑی مسجد ہے اس کا مدرسہ نہایت قدیم اور عظیم الشان ہے اس کے کتب خانہ میں قلمی اور مطبوعہ کئی لاکھ کتابیں ہیں جن میں شمالی افریقہ کے مرحوم حکمرانوں کے کتب خانوں کی بھی کتابیں شامل ہیں۔

---

[1] ادگانیوص ۲۱

اُندلس

۵ شوال ۹۲ھ/۷۱۱ء کو طارق ابن زیاد[1] نے اپنی بارہ ہزار فوج سے عیسائیوں کے ایک لاکھ لشکر جرار کو شکست دیکر اندلس میں اسلامی سلطنت قائم کردی یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں جہل و جمود کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور اخلاقی پستی و علم دشمنی[2] کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ علم کے نام لیوا ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے تھے اس ظلمت کدہ میں علم اور تہذیب کے چراغ پہلے پہل مسلمانوں نے روشن کئے جن کے دورِ حکومت میں اندلس کا ہر شہر علم و فن کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا ان میں دار الخلافہ قرطبہ کو خاص عظمت حاصل تھی اس چوبیس میل لمبے اور ساڑھے چھ میل چوڑے شہر کی دس لاکھ آبادی میں ۳۸۰ مسجدیں اور سیکڑوں مدرسے اور کتب خانے موجود تھے جن کا علمی فیض پورے مغرب میں پھیلا ہوا تھا۔ بقول ڈاکٹر اقبال

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ؎ ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور

---

[1] طارق ابن زیاد اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے گورنر موسیٰ بن نُصیر کا آزاد کردہ غلام تھا اپنی فوج کو لیکر جہاں اترا تھا اسے جبل الطارق (Gibraltar) کہتے ہیں مورخ اکبر شاہ خاں کا بیان ہے کہ طارق نے خواب میں آنحضرت صلعم کو دیکھا تھا کہ آپ اندلس کی فتح کی بشارت دے رہے ہیں چنانچہ فتح کا کامل یقین رکھتے ہوئے طارق نے اپنے جہازوں کو آگ لگا کر واپسی کے راستے بالکل بند کر دیے تھے

[2] عیسائی کلیسا کی علم دشمنی کے بھیانک نمونے "العلم والعلماء" (مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی) میں درج ہیں ان میں کچھ یہاں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں لکھا ہے کہ جس شخص پر علم دوستی کا ذرا بھی شبہ ہوتا اسے پوپ کی قائم کردہ مجلس تفتیش و احتساب (Enquisition) فوراً گرفتار کر لیتی اور جرمانے سے لیکر قید، قتل اور زندہ جلا ڈالنے تک کی سزائیں دیتی محکمۂ احتساب کی سفاکیوں کا یہ حال تھا کہ اس نے [illegible]ء تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں ان میں بتیس ہزار انسان ایسے تھے جنھیں زندہ جلا ڈالا گیا اسپین کے محکمۂ احتساب نے اپنی پہلی سالگرہ اس کارنامے سے منائی کہ بارہ مہینہ میں دو ہزار آدمیوں کو زندہ جلایا اور سترہ ہزار کو بھاری جرمانے اور حبسِ دوام کی سزائیں دیں۔

کتب خانے

تاریخ کہتی ہے کہ اسلامی اندلس میں صرف کتب خانے ہی قائم نہیں ہوئے بلکہ علم پرور بادشاہوں بالخصوص عبدالرحمٰن اول[۱] ہشام اول حکم اول عبدالرحمٰن ثانی عبدالرحمٰن ثالث اور حکم ثانی کے عہد میں علم و فن کے ہر شعبہ نے انتہائی عروج پایا اور تعلیم اتنی پھیلی کہ بقول مورخ ڈوزی اسلامی اندلس میں ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن مسیحی یورپ میں سوائے بڑے درجے کے لوگوں یا پادریوں کے سب ناخواندہ ہوتے تھے کہتے ہیں کہ قرطبہ اشبیلیہ طلیطلہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں شاندار کتب خانوں اور اعلیٰ درجہ کی لیبوریٹریوں سے معمور تھیں صرف قرطبہ میں ۸۰۰ اور غرناطہ میں ۱۳۷ مدرسے تھے کتب خانوں کی تو کوئی انتہا نہ تھی ذاتی تعلیمی شخصی عام غرض ہر قسم کے کتب خانے موجود تھے (ایک شہر غرناطہ میں ۷۰ کتب خانوں کی تعداد ہی تھی) اسکاٹ نے لکھا ہے:-

"کوئی بڑا شہر ایسا نہ ہوتا تھا جہاں تشنگان علوم کو سیراب کرنے کے لئے کم از کم ایک چشمہ (کتب خانہ) نہ ہو، (کتب خانوں کی) الماریاں ہر شخص کے لئے جو ان سے مستفیض ہونا چاہتا ہو کھلی رہتی تھیں۔ فن وار فہرستیں ہر کتب خانہ میں مہیا رہتی تھیں تاکہ ہر شخص کو تمام کتابوں کے نام اور ان کے مضامین بہ آسانی معلوم ہو سکیں بہت سی کتابیں مطلا و مذہب ہوتی تھیں بعض قیمتی کتابوں کی جلدیں خوشبودار لکڑی اور گل... چمڑے سے باندھی جاتی تھیں اور بعض پر سونا چڑھا ہوتا تھا اکثر کتب خانوں میں کتابیں خوشبودار اور قیمتی لکڑیوں (مثلاً سرو، عود، آبنوس اور صندل) کے بکسوں میں رکھ کر الماریوں میں چنی جاتی تھیں۔"

۱؎ اموی خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمٰن عباسیوں کے ظلم و ستم سے بچکر مصیبتیں اٹھاتا ہوا اندلس پہنچا اور یہاں اس نے ایک نئی اموی سلطنت قائم کی جو ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) سے ۴۲۲ھ (۱۰۳۱ء) تک رہی۔ اس کے بعد دوسرے خاندان حکومت کرتے رہے۔ تاریخ اندلس جلد سوم ص ۴۳ و ۱۰۵ تمدن عرب: جرجی زیدان ص ۱۳۴ [illegible] جلد

لیکن کتب خانوں کے لحاظ سے قرطبہ کو سب شہروں پر فضیلت تھی اس سلسلہ میں علامہ مقری نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ "جب کوئی عالم اشبیلیہ میں مرجاتا ہے تو اس کی کتابیں فروخت ہونے کے لئے قرطبہ میں آتی ہیں اور جب کوئی مطرب قرطبہ میں مرتا ہے تو اس کے آلات اشبیلیہ جا کر بکتے ہیں"۔ اسی مورخ کا بیان ہے :-

"بلاد اندلس میں سب سے زیادہ کتابیں بھی (قرطبہ) ملتی ہیں کتب خانے رکھنے میں یہاں کے لوگ سب سے بڑھ گئے ہیں کتب خانہ کا ہونا شان ریاست سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سے رئیس ایسے ہیں کہ جو خود عالم نہیں ہیں مگر وہ فخر کرتے ہیں کہ ان کے مکان میں کتب خانہ موجود ہے دوسروں کا تذکرہ اسطرح ہوتا ہے کہ فلاں کے یہاں کتب خانہ ہے فلاں کتاب فلاں شخص کے کتب خانہ میں ہے اور فلاں رئیس نے فلاں شخص کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ایسی گراں قیمت میں خریدی ہے"۔

الحکم کا کتب خانہ

اندلس میں کتب خانوں کی تحریک سب ہی بادشاہوں کے عہد میں پھلی پھولی مگر اس باب میں خلیفہ الحکم ثانی (متوفی ۳۶۶ھ/۹۷۶ء) سب پر سبقت لے گیا وہ کتابیں جمع کرنے کا بڑا شائق تھا حسب بیان مورخ ڈوزی الحکم کے برابر کوئی عالم و فاضل بادشاہ اسپین میں نہیں گزرا نہ علوم و معارف میں کسی کو اتنی قدرت حاصل ہوئی اور نہ کسی نے اتنی کتابیں جمع کیں الحکم نے قرطبہ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے علامہ جرجی زیدان نے کہا ہے کہ یہ کتب خانہ تمام قدیم اسلامی کتب خانوں سے سبقت لے گیا تھا۔ مورخ اسکاٹ کا بیان ہے کہ یہ وہ خزانہ تھا جو علماء کو محظوظ کرتا اور جاہلوں اور وہمیوں کو متحیر۔ اس کتب خانہ میں عربی یونانی عبرانی وغیرہ کی چار لاکھ کتابیں جمع تھیں جن کی

فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔

کتب خانے میں سیکڑوں کاتب اور جلدساز اور دوسرے ملازمین کام کرتے تھے ان اخراجات کے لئے باقاعدہ بجٹ بنتا تھا جس کا خاکہ پہلے پیش کیا جاچکا ہے اس میں ثقرالبغدادی اور قیاس بن عمر جیسے مشہور خوشنویس کتابت کی خدمت پر مامور تھے جن کی الحکم بڑی قدر کرتا تھا۔ کتب خانہ کے مہتمم کا عہدہ الحکم کی نظر میں اتنا اہم تھا کہ اس نے اپنے بھائی عبدالعزیز کو اس پر مقرر کیا تھا ان کے علاوہ تلید خصی[۱] نے بھی یہ خدمت انجام دی تھی۔

لیکن یہ دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ اس کتب خانہ کی چار لاکھ کتابوں میں بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کا الحکم نے مطالعہ کیا تھا اور ان پر مفید حواشی لکھکر کتب خانہ کی افادیت کو دوبالا کر دیا تھا۔ علامہ مقری نے لکھا ہے کہ الحکم کی عادت یہ تھی کہ جس کتاب کو وہ پڑھتا اس پر مصنف کا شجرہ نسب اس کا مولد اور اس کی وفات بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

الحکم کی علم نوازی اور کتابوں سے اس کی شیفتگی ضرب المثل بن گئی تھی دور دراز ملکوں سے علماء اور کتابوں کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا ابن مغیث، احمد بن سعید ہمدانی، محمد بن یوسف وراق، ابو عمر احمد بن فرج، عیسیٰ بن سعید جیسے زبردست عالم الحکم کے دربار کی زینت تھے کتابوں کی فراہمی کے لئے الحکم نے تمام مراکز میں اپنے گماشتے مقرر کئے جو اس کے لئے کتابیں خرید کر بھیجتے تھے اور جن کی قیمتیں وہ بڑی فیاضی کے ساتھ ادا کرکے گماشتوں اور مصنفین کے حوصلے بڑھاتا رہتا تھا ایک بار اس نے ابوالفرج اصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کو

---

[۱] نفح الطیب از علامہ مقری (اردو ترجمہ) ص ۲۰۸

کتاب الاغانی کے صلہ میں ایک ہزار دینار بھیجے تھے یہ عرب شاعری موسیقی کے متعلق معلومات کی مشہور و مستند کتاب ہے جس میں مغنیوں اور شعراء کا تفصیل سے ذکر ہے

الحکم جیسے علم پرور بادشاہوں کے عہد حکومت میں تمام بڑے بڑے شہروں میں عام کتب خانے کھلے ہوئے تھے ہر امیر و غریب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہو گیا تھا شہزادہ احمد کی بیٹی عائشہ کا کتب خانہ تمام اندلس کے نفیس و مکمل کتب خانوں میں سے ایک تھا قرطبہ کے قاضی ابو مطرف کا کتب خانہ اتنی نایاب کتابوں سے پُر تھا کہ جب یہ نیلام ہوا تو اس کی قیمت چالیس ہزار دینار (یعنی دو لاکھ باسٹھ ہزار روپیہ سے زائد) وصول ہوئی۔ قرطبہ کے ایک غریب مدرس علامہ محمد بن حزم کا کتب خانہ اس قدر نفیس تھا کہ اکثر اہل علم اس پر رشک کیا کرتے تھے علامہ محمد بن حزم کتابوں کے معاملہ میں بڑے فیاض تھے انھوں نے ارباب علم کو اپنے کتب خانہ سے مستفید ہونے کی اجازت دے دی تھی ان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اندلس کے سب سے بڑے محدث، فقیہ، عالم، مورخ اور ماہر انساب تھے انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں کی ایک کتاب "مراتب[1] الاجماع" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش بانکی پور میں ہے۔

اندلس کی سلطنت میں ضعف آجانے کے بعد چھوٹے چھوٹے خود مختار بادشاہوں نے اپنی حکومتوں میں مدرسے اور کتب خانے کھول کر علم و فن کی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱ ص ۱۲۳ (ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سرپرستی جاری رکھی ان میں سلطان بطلیوس مظفر بن الافطس کا کتب خانہ بہت بڑا تھا ایک ادیب اور مصنف کی حیثیت سے اس سلطان کا مرتبہ نہایت بلند ہے اس کی تصنیف المظفری پچاس جلدوں پر مشتمل ہے المیریا کے حکمران زہیر کے وزیر ابن عباس کا کتب خانہ نہایت عالی شان تھا اس میں بے شمار رسائل کے علاوہ چار لاکھ کتابیں تھیں[1] یہ وزیر نہایت جید عالم اور بہت بڑا خوشنویس تھا اس کے کتب خانہ کی شان اور خوبصورتی کی نسبت اسکاٹ نے لکھا ہے۔

> "ابن عباس کے محل میں کوئی حصہ اتنا پر تکلف اور شاندار نہ تھا جتنا کہ کتب خانہ الماریاں خوشبودار لکڑی کی تھیں اور ان میں ہاتھی دانت سیپ اور کچھوے کی کھوپڑی سے مینا کاری کی ہوئی تھی۔ تمام کمرے میں سونے کا کام تھا دیواروں میں سفالی کی اینٹیں تھیں جس سے تمام کمرہ جگمگاتا تھا اور فرش سنگ مرمر کا تھا وہ اپنی فرصت کا وقت اس عالیشان کتب خانہ میں کاٹتا تھا"

اندلسی کتب خانوں کا اثر یورپ پر

جس طرح بغداد، دمشق اور دوسرے علمی مراکز نے ایشیا میں ایک علمی و ادبی فضا پیدا کر دی تھی اسی طرح اسلامی اندلس کے مدرسوں

---

[1] عبرت نامہ اندلس جلد ثانی ص ۳۳۱ (عالی اکیڈمی پانی پت ۱۹۳۹) (Spanish Islam by Reinhart Dozy کا اردو ترجمہ مترجم محمد عنایت اللہ) [2] اخبار الاندلس جلد دوم ص ۱۳۶

اور کتب خانوں نے یورپ کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی پر نہایت گہرا اور پائدار اثر ڈالا اُس زمانہ میں اندلس کے سوا یورپ میں کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کی جا سکتی چنانچہ طالبانِ علم یورپ سے اندلس آتے اور یہاں کے اداروں سے فیض اُٹھاتے تھے ان میں ایک شخص گربرٹ تھا جس نے قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور جو ۹۹۰ء میں سلویسٹر دوم کے نام سے پوپ کے عہدہ پر سرفراز ہوا تھا مورخ سدیو نے لکھا ہے کہ گربرٹ نے اندلسی کتب خانوں سے فائدہ اٹھا کر ایسے عجیب و غریب علوم و معارف اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش کئے کہ انھوں نے اس پر جادوگری کی تہمت لگا دی اور اسے زہر دے کر مار ڈالا لیکن ان وحشیانہ مظالم کے باوجود یورپ میں کچھ افراد ابن سینا، ابن رُشد اور فارابی جیسے علمائے اسلام کی کتابوں سے روشنی حاصل کرتے رہے اگرچہ دین مسیح کے رہنما ان کی کتابوں کے سخت مخالف تھے اور ان کا پڑھنا انھوں نے کفر قرار دیدیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اہلِ یورپ مسلم مفکرین کی تصانیف کے اس قدر دلدادہ ہو گئے کہ بقول مورخ اسکاٹ "یہ ممنوعہ کتابیں یورپ کے ہر دیر میں نہایت شوق سے پڑھی جانے لگیں"۔ اور وہ ابن رُشد جسے گالیاں دینا عیسائی کلیسا نے مذہبی شعار بنا لیا تھا اسی کی تصانیف ۱۴۷۳ء میں یورپ کے نصاب تعلیم میں شامل ہو گئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل و خرد کو بیدار کرنے والی یہ تصانیف اہلِ یورپ کی مذہبی اور علمی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا ایک زبردست

---

[1] بحوالہ مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص ۱۶۲

آر ثابت ہوئیں کہتے ہیں کہ لوتھر[1] نے اصلاح مذہب کی جو تحریک پروٹسٹنٹ (Protestantism) کے نام سے جاری کی تھی وہ بڑی حد تک اس بیداری کا نتیجہ تھی جو مسلم حکماء کی تصانیف کے اثر سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک عرب جغرافیہ داں ادریسی کی تصانیف[2] نے جو لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں جغرافیہ کا علم یورپ کے ازمنہ متوسط میں پھیلایا۔ بحری دنیا میں ابن ماجد[3] کی تصانیف اور اس کے تجربات پندرھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کے وسط تک جہاز رانوں کے لئے شمع راہ کا کام دیتے رہے ایک پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما نے اپنے بیڑہ کو مشرقی افریقہ کے ساحل مالندی سے ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ[4] تک لیجانے اور ساری دنیا کا چکر لگانے میں ابن ماجد کی تصانیف اور معلومات سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا کولمبس[5] نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے نئی دنیا یعنی امریکہ کے دریافت کرنے میں ان نظریات و قیاسات سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے جو عربوں نے اپنی تصانیف میں پیش کئے ہیں۔

---

[1] MARTIN LUTHER (1483 - 1546) [2] ادریسی کی مشہور و معروف تصنیف "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" ہے جو ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں لکھی گئی۔

[3] ابن ماجد کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ برہان دہلی مارچ ۱۹ء

[4] واسکو ڈی گاما (VASCO DA GAMA) ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ پہونچا تھا [5] Christopher Columbus (1451 - 1506)

عیسائی مورخین گبن، لین پول، اسکاٹ، موسیولیبان وغیرہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی درسگاہوں اور ان کی تصانیف کی بدولت وہ اسباب فراہم ہوئے جن کے اثر سے یورپ جہالت کی تاریکی سے نکلا اور اس دور ترقی کا آغاز ہوا جو نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے مشہور ہے موسیولی بری لکھتا ہے کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جاتا تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کئی صدیوں پیچھے ہٹ جاتی موسیولیبان کہتا ہے کہ یونان کی تصانیف کا علم ان کے عربی ترجموں ہی کے ذریعہ سے پھیلا ان ہی ترجموں کی بدولت وہ تصانیف قدیمہ ہم تک پہونچی ہیں جن کی اصلیں بالکل تلف ہوگئیں اور دنیا کو عربوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس ذخیرہ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا مگر ان باتوں کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں ہے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اندلسی کتب خانوں کی تباہی میں سب سے بڑا ہاتھ اس قوم کا ہے جسے مسلمانوں نے علم و تہذیب کی نعمتیں بخشی تھیں[۱]

اندلسی کتب خانوں کی تباہی

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پر زوال آجانے کے بعد ان کے کتب خانوں پر بھی تباہی آگئی خلیفہ حکم ثانی کا کتب خانہ اس کے بیٹے ہشام کے عہد میں برباد ہونا شروع ہوگیا تھا۔ وزیر ابن ابی عامر ہشام کی کمسنی سے فائدہ اٹھا کر سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا اور عوام میں ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے اس نے اصیلی بن ذکوان اور زبیدی

---

[۱] تمدن عرب از ڈاکٹر گستاولی بان ص ۵۱۴

جیسے علمار کو ہدایت کی کہ وہ فلسفہ و ہیئت قسم کی کتابیں جن کا پڑھنا مذہباً جائز نہ ہو کتب خانہ سے خارج کر دیں جب یہ کتابیں علیحدہ کر دی گئیں تو ابن ابی عامر نے انھیں جلوا دیا اور خود اپنے ہاتھ سے کچھ کتابیں آگ میں ڈال دیں تاکہ لوگ اسے راسخ العقیدہ مسلمان سمجھیں۔ اس کے بعد جو کتابیں بچیں وہ بربری حملہ کے وقت تباہ ہو گئیں اس موقع پر کتابوں کے بہت سے ذخیرے برباد ہوئے اسکاٹ نے لکھا ہے کہ "وحشیانِ بربر نے جب قرطبہ کو لوٹا ہے تو ان لوگوں نے کتابوں کی بے بہا جلدیں اکھاڑ کر اپنے جوتے بنائے۔ جانور صفت حملہ آوروں نے سونے اور جواہرات جلدوں پر سے اتار کر کتابوں کو پامال کرنے کے لئے اِدھر اُدھر پھینک دیا"۔

اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد مسیحی رہنماؤں نے علم دشمنی اور وحشت و بربریت کا ایسا نمونہ پیش کیا جسے علمی دنیا کبھی نہیں بھول سکتی انھوں نے اسلامی اندلس کے سارے کتب خانوں کو یک لخت مٹا دینا ایک مذہبی فریضہ قرار دیا اور اس کا نام عمل ایمانی (Auto De Fe) رکھا اب اندلس میں علم سوزی کا بازار گرم تھا اور مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی ثقافت کے بے بہا خزانے تباہ کئے جا رہے تھے۔ تمام بلاد اندلس میں جو کتابیں برباد کی گئیں ان کا تو کوئی حد و شمار ہی نہیں صرف ایک شہر غرناطہ میں جو کتابیں اسپین کے اسقف اعظم فرانسسکو شیمنش نے جلا کر خاکستر کر دیں ان کی تعداد اسی ہزار تھی عیسائیوں نے Francisco Ximenes de Cisneros

نے ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد ایک طرف مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا دوسری طرف یہاں کا شاہی کتب خانہ جلا دیا انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں لیں اور عربی زبان کی جس قدر کتابیں ملیں وہ ضبط کرلیں اس طرح تقریباً دس لاکھ کتابیں جمع ہوئیں لکھا ہے کہ غرناطہ میں کتابوں کے انبار دس روز تک برابر جلتے رہے۔ علوم وفنون کے اس قیمتی ذخیرے کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے مورخ اسکاٹ لکھتا ہے:۔

"اس وحشیانہ فعل سے مالی نقصان تو بہت ہوا ہی تھا مگر اس کا مہلک اثر جو سوسائٹی پر پڑا وہ بالکل ناقابل بیان ہے اس سے وہ یگانہ روزگار علمی یادگاریں تباہ ہوگئیں جن کا بدل ناممکن ہے گھڑی بھر میں اس (ڈیمنیش) نے صدیوں کا جمع کیا ہوا وہ بیش بہا خزانہ خاک سیاہ کردیا جس سے زمانہ حال کے مورخ مسلمانان اندلس کی تہذیب کے متعلق ایسے ماخذ پیدا کرسکتے تھے جن کا علمی دنیا میں اب پتہ لگنا بالکل ممکن نہیں ہے"۔

یہی مورخ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ اس عجیب وغریب سلطنت (اندلس) کی تباہی صرف ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں ہی کو خون رلائے یہ ایسا بدقسمت واقعہ اور ایسی مصیبت ہے جس پر نہ صرف زمانۂ حال بلکہ زمانۂ آئندہ کے علم دوستوں کو آنسو بہانے چاہئیں"۔[1]

---

[1] مسلمانوں کا عروج وزوال از مولانا سعید احمد ص ۱۹۸۔

حصّہ دوم

ہندوستان کے اسلامی کتب خانے

(ہند کے عہدِ اسلامی کے کتب خانوں کا ایک جائزہ)

ہندوستان کے مسلم عہد میں

کتب خانوں کا قیام اور نظام

مسلمانوں کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی آمد سے سیکڑوں برس پہلے عہد قدیم میں ہندوستان علم ہیئت، طب، الٰہیات اور فن سنگ تراشی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پنجاب میں ہڑپا، سندھ میں موہن جوڈارو کے کھنڈرات اور دکن میں اجنتا اور ایلورا کے غار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ہزاروں برس قبل ہندوستان نے سنگ تراشی، نقاشی اور مصوری کے فن میں بہت ترقی کرلی تھی خصوصاً موریہ اور گپت خاندان کے عہد میں یہاں علم و ثقافت کے بہت سے اہم کام انجام پائے۔ چندر گپت موریہ[1] کے وزیر چانکیہ یا کوٹلیہ نے "ارتھ شاستر" تصنیف کی۔ گپت عہد[2] میں کالیداس نے اپنا مشہور ڈراما "شکنتلا" لکھا۔ اس زمانہ میں تعلیم کے کئی مراکز اور

---

[1] یہ بادشاہ ۳۲۱ ق-م میں تخت پر بیٹھا تھا۔
[2] گپت خاندان نے ۳۲۰ء سے ۶۷۵۰ء تک حکومت کی۔

قدیم طرز کے کچھ کتب خانے قائم ہوئے ان میں درس گاہ نالندہ کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ جو اپنی درس گاہ کے ڈیڑھ ہزار اساتذہ اور نو ہزار طلباء کی علمی ضرورتیں پورا کرنے کے علاوہ بیرون ہند کے لوگوں کو بھی فیض پہنچاتا تھا۔ ایک چینی سیاح آئی۔سانگ (I-tsing) نے دس سال ۶۷۵ء۔ ۶۸۵ء تک اس سے استفادہ کیا تھا اور پانچ لاکھ اشلوک پر مشتمل چار سو سنسکرت کی کتابیں جمع کی تھیں۔ اس کتب خانہ کے متعلق مکرجی[۵] نے لکھا ہے کہ یہ جس جگہ واقع تھا اسے دھرم گنج کہتے تھے اور کتب خانہ تین وسیع عمارتوں پر مشتمل تھا جو رتن ساگر، رتنو دوھی اور رتن رنجک کہلاتی تھیں ان میں رتن ساگر کی نو منزلہ عمارت "پرگیا پارمتا سوتر" اور "سماج گہیہ" قسم کی نادر کتابیں رکھنے کے لئے مخصوص تھی۔

نالندہ کے علاوہ دوسرے علمی مراکز پاٹلی پتر، ولبھی، وکرم شلا، جگدل، ہتھلا اور ندیا وغیرہ میں بھی کتب خانے تھے اور درس گاہوں کے ساتھ کتب خانوں کی ضرورت یہ کہہ کر واضح کی جاتی تھی کہ درس گاہ کی حیثیت بغیر کتب خانے کے ایسی ہے کہ جیسے قلعہ بغیر اسلحہ خانہ کے۔

---

۵ Ancient Indian education by Radha Kumud Mookerji P. 574 (London, Macmillan, 1951)

مسلمانوں کی آمد کے بعد قدیم ہندوستان کی ان علمی سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد بھی یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی کہ اس زمانہ میں یہاں علمی اور کتابی ذوق عام نہ تھا اور علم ذات پات کے جال میں پھنس کر ایک مخصوص طبقہ کی ملکیت بن گیا تھا مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں علم کی توسیع و اشاعت ہوئی اور سیاسی وحدت کے ساتھ لسانی وحدت و ذہنی بیداری کے بھی سامان فراہم ہوئے اور ایک نئی تہذیب ظہور میں آئی جس کی توانائی و رعنائی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سرہلی .سی رائے نے اپنے خطبہ میں کہا ہے[۱]۔

"یہ صحیح نہیں کہ مسلمان ہندوستان میں آکر صرف بس گئے ہیں اور انھوں نے کچھ کیا نہیں بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے یہاں کے فنون لطیفہ، ادب اور فن ملک داری میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی پیچ در پیچ لچھی میں رنگ رنگ کے جو بہت سے دھاگے نظر آتے ہیں وہ ذہانت اسلامی ہی کا نتیجہ ہیں۔ عروس ہند کو مسلمانوں نے جو لباس زرتار پہنایا ہے اگر اتار لیا جائے تو وہ کیسی حقیر و نزار اندام نظر آنے لگے۔"

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان علمی و ثقافتی ترقیوں کے لئے ہندوستان براہ راست اسلامی تعلیم کا احسان مند ہے۔ مذہب اسلام نے مسلمانوں میں

---

[۱] اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم (خطبہ جلسہ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ ۱۹۲۳ء) ص ۲۲

علم کی اشاعت کا جو ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا وہ مسلم مشائخ، علماء اور فاتحین کے ساتھ پہاڑوں، ریگستانوں، دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا ہندوستان پہنچا اور یہاں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں کتابوں کا استعمال عام کرنے اور مدرسوں اور کتب خانوں کے ذریعے علم کو پھیلانے کا شعور اور رجحان جاگا، بڑھا اور پھیلا۔ چنانچہ مورخ جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے[1]: ۔

"کتابوں کو نقل کر کے تقسیم کرنے اور علم کی عام اشاعت کے رواج کے لئے ہم اسلامی اثرات کے رہین منت ہیں ورنہ پرانے ہندو مصنفین تو اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو خفیہ رکھنے کے شیدائی تھے۔"

لیکن یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کی آمد کے اثرات صرف کتابوں کی اشاعت ہی تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے ہندی تہذیب و تمدن کے ہر گوشہ کو منور کر دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مقالہ[2] میں اُن اشیاء کی مفصل فہرست دی ہے جو مسلمان اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے اور جن سے یہ ملک پہلے بالکل نا آشنا تھا۔ ہندوستانی زندگی پر مسلمانوں کے جو اثرات پڑے ان سب کا ذکر یہاں ناممکن ہے صرف زبان کو لیجئے جو تہذیبی لین دین کا سب سے واضح ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن اس کثرت میں وحدت کا

---

[1] India Through The ages by Jadunath Sarkar P. 52 (Sarkar & Sons, Calcutta, 1950)

[2] "ہندوستان میں ہندوستانی" یہ مقالہ انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں پڑھا گیا اور ۱۹۳۲ میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔

پننگ ہندواور مسلمانوں کے معاشرتی اختلاط سے اُبھرا اور ایک نئی زبان وجود میں آئی جو مختلف مدارج طے کرکے اُردو کہلائی۔ اس لسانی انقلاب نے ہندوؤں کے مذہبی شعور کو بھی متاثر کیا۔ الفاظ خیالات کا جامہ کہے جاتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کی زبان کے ساتھ اسلامی افکار بھی غیر ارادی طور پر ہندوستان آگئے اور جب عربی و فارسی الفاظ یہاں کی مقامی زبانوں میں گھل مل گئے تو قدرتی طور پر اسلامی فکر کے اثرات بھی ہندوؤں کے دل و دماغ پر پڑنے لگے یہاں تک کہ ان کے دل میں اپنے ہزاروں سال پرانے مذہب کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ہندو مذہب کے بہت سے اصلاحی فرقے مثلاً بھگتی تحریک، برھمو سماج اور آریہ سماج[1] وغیرہ وجود میں آئے ہندوستان کی مذہبی فکر اسلامی توحید سے جس طرح متاثر ہوئی اس کے نقوش نامدیو (مرہٹی شاعر) کبیر داس اور گرونانک جیسے بزرگوں کی تعلیمات میں صاف نظر آتے ہیں۔ کبیر داس نے بت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے بڑے لطیف و مؤثر انداز میں کہا ہے :-

پاہن پوجے ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ ۔ تاتے یہ چاکی بھلی، پیس کھائے سنسار[2]

---

[1] آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (اصل نام مول شنکر) کے بت پرستی سے بیزار ہونے کا یہ سبب بتایا جاتا ہے کہ ایک رات وہ شیوجی کے مندر میں پوجا کرنے گئے اس وقت چوہے بُت پر دوڑ رہے تھے۔ اپنے معبودوں کی اس بے بسی نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے بُت پرستی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

[2] اگر پتھر پوجنے سے خدا ملتا تو میں پہاڑ کو پوجتا۔ اس سے تو یہ چکی بھلی جس سے لوگ پیس کر کھاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عہد میں

کتابیں جمع کرنے کا ذوق وشوق

ہندوستان میں مسلمانوں کا عہد اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ ان کے عہد میں مدرسوں اور کتب خانوں کے قیام کا اہتمام نہایت وسیع پیمانے پر ہوا اور کتابیں جمع کرنا ایسا محبوب مشغلہ بن گیا کہ جس کی نظیر اس سے قبل ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کا قدم سرزمینِ ہند کے جس مقام پر پہنچا وہاں مسجدیں تعمیر ہوئیں اور مسجدوں کے زیرسایہ مدرسے کھلے ان کے علاوہ علماء اور امراء کے مکانوں کے ساتھ بھی مدرسے ہوتے تھے اور ہر مدرسہ سے چھوٹا یا بڑا کتب خانہ ملحق ہوتا تھا اور شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو کہ جس میں حدیث، وظائف، شعر، شاعری اور قصے کہانیوں کی کچھ کتابیں جمع نہ ہوں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کتابیں جمع کرنے کا ذوق بھی اسلامی تعلیم کے اثرات کا رہینِ منت ہے جس کی ایک روشن مثال مولوی خدابخش (بانی اورینٹل لائبریری بانکی پور) کے ایک خواب میں نظر آتی ہے۔ مولانا موصوف کتابیں جمع کرنے کا

جو والہانہ جذبہ رکھتے تھے اس کی تہ میں تعلیم محمدی اتنی قوت کے ساتھ کام کر رہی تھی کہ ایک بار انھیں خواب میں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم ان کے کتب خانہ میں تشریف لائے ہیں۔

خدابخش مرحوم کہتے ہیں[1] "ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کتب خانہ سے لگی ہوئی گلی میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں میں بھی گھر سے نکل پڑا۔ لوگ چلانے لگے۔ رسول اللہ صلعم، تمہارے کتبخانہ کی سیر کیلئے تشریف لارہے ہیں۔ تم کہاں ہو"
"میں اُس کمرے کی طرف دوڑا جہاں قلمی کتابیں رکھی تھیں، اس وقت رسول اللہ صلعم تشریف لے جا چکے تھے لیکن حدیث کی دو قلمی کتابیں میز پر کھلی رکھی تھیں، لوگوں نے بتایا کہ ان دونوں کو رسول اللہ صلعم ملاحظہ فرمارہے تھے۔"

اس خواب سے متاثر ہو کر ان دونوں کتابوں پر مولوی خدابخش مرحوم نے یہ نوٹ لکھ دیا ہے کہ انھیں کسی حالت میں بھی کتب خانہ سے باہر نہ لیجایا جائے۔

اس مثال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کتابیں جمع کرنے کا ذوق مسلم عہد میں اتنا شدید اور مستحکم ہو چکا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی خوں ریزیاں بھی اسے کم نہ کر سکیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس ذوق کی جڑیں گہری اور مضبوط کرنے میں مسلم بادشاہوں اور امیروں نے اپنی دولت بڑی فراخدلی سے صرف کی تھی۔ عہد مسلم کے ہندوستان میں بادشاہ، امراء اور عوام سب کتابیں جمع کرنے اور مدرسے قائم کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

---

[1] ایک مشرقی کتب خانہ ص ۸ (انجمن ترقی اُردو۔ ہند۔ علی گڑھ)

دہلی سلطنت میں یہ شوق اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ مدرسوں اور کتب خانوں
کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ مغلیہ عہد تو اس اعتبار سے عہد زریں کہا
جا سکتا ہے۔ کتب خانوں کی زیادہ سے زیادہ ترقی اسی زمانہ میں ہوئی۔
بعض مغل بادشاہوں کے کتب خانے پوری دنیا میں امتیازی حیثیت رکھتے
تھے۔ ہمایوں کا کتب خانہ اس لئے نادر کہا جاتا ہے کہ اس میں ریاضی اور نجوم
کی نایاب اور منتخب کتابیں جمع تھیں۔ اکبری کتب خانہ کے یکتائے روزگار
ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں
کثیر تعداد میں جمع تھیں۔ جہانگیر کا کتب خانہ آرٹ کی کتابوں کا بے بہا
خزانہ تھا۔ عالمگیر کا کتب خانہ اسلامیات کی کتابوں کا مخزن ہونے کی
وجہ سے بے نظیر تھا۔ شہزادیوں کے کتب خانوں میں زیب النساء کا کتبخانہ
نہایت عمدہ تھا۔

شاہان دہلی کی مملکت کے علاوہ خود مختار حکومتوں دکن، گجرات،
بنگال، کشمیر، اودھ وغیرہ میں بھی گراں قدر کتب خانے موجود تھے۔
یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ علوم و فنون کے بڑے سرپرست تھے ان
میں سے ہر فرماں روا علم کی سرپرستی کرنے میں ایک دوسرے سے
آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

ہندوستان کے عہد اسلامی میں گشتی کتبخانوں (Mobile libraries)
کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ہمایوں کا بے سر و سامانی کے عالم میں کتابوں کو
اپنے سینے سے لگائے ہوئے مارے مارے پھرنا۔ جہانگیر اور عالمگیر کے

ساتھ مہمات کے دوران میں کتابوں کا ہونا۔ بیجاپور کے فرمانروا علی عادل شاہ کا کتابوں کو اپنا رفیق سفر بنانا کتب خانوں کی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔

ہندوؤں کا کتابی ذوق اس سے بھی اہم اور لائق ذکر بات یہ ہے کہ مسلم دور حکومت میں کتابیں جمع کرنے کا شوق صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہا بلکہ ہندوؤں میں بھی پھیلا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم کی حفاظت کرنے میں کسی تعصب سے کام نہیں لیا اور تعلیم کے معاملہ میں ذات، پات اور مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ رکھی۔ انھوں نے سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کرائے، ہندوؤں کی تعلیم کے لئے ملتان، متھرا اور بنارس وغیرہ میں پاٹ شالے اور مدرسے قائم کئے، ان کے درباروں میں ہندو فضلاء کو مسلمان فضلاء کے برابر جگہ ملتی تھی، مدرسوں میں ہندو اور مسلمان طالب علم ساتھ ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ اسلامی کتب خانوں میں سنسکرت وغیرہ کی کتابیں بھی رہتی تھیں، اس آزاد تعلیمی پالیسی کا اثر ہندوؤں پر نہایت گہرا پڑا اور انہیں تحصیل علم کا جذبہ، کتابیں جمع کرنے کا شوق اور خطاطی و خوشنویسی کا ذوق پیدا ہو گیا۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے[۱] :-

---

[۱] ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ ص ۳۲-۳۳۔ یہ مقالہ سید سلیمان ندوی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۷ء بمقام کلکتہ پڑھا تھا اسے آل انڈیا پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے سید الطاف علی بریلوی کے دقیع دیباچے کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے۔

"یہ لیکن ہم نہیں کہتے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا لیکن اس عہد میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا میں کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ تاریخی حوالوں کو چھوڑ کر آج ہندوؤں کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہیں وہاں عربی اور فارسی کے چند فرسودہ جلدیں کس مپرسی میں پڑی ہوئی ملیں گی بڑے بڑے ہندو امراء کے ایوانوں میں دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتب خانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا۔ لاہور، دلی لکھنؤ، پٹنہ اور ڈھاکہ میں ایسے بکثرت گھرانے ملیں گے۔ پٹنہ میں اس وقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں جن کے یہاں عربی کتابوں کے نوادر نسخے اب تک موجود ہیں اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کو جدا نہیں کرسکتے راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا ایک نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے۔"

شائقین علوم کی فہرست میں راجہ جے سنگھ والیِ جے پور اور راجہ بنے سنگھ والیِ الور بہت بڑا درجہ رکھتے تھے جنھوں نے محمد شاہ کے عہد میں علم ہیئت اور نجوم کی ترقیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ راجہ بنے سنگھ کو کتابیں جمع کرنے کی ایسی لگن پیدا ہوگئی تھی کہ اس نے واقعات[۵۲] بابری کا ایک نسخہ پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا اور گلستان[۵۲] سعدی کے نسخہ کی تیاری پر سوا لاکھ[۵۳] روپے خرچ کر دیے تھے۔

---

۵۲ گلستان سعدی اور واقعات بابری کے یہ نسخے الور کے میوزیم میں ہیں۔

۵۳ ملاحظہ ہو روداد کل راجستھان اردو کنونشن از احترام الدین احمد شاغل ص ۱۲۰ اور ۱۱۶۔

بتایا جاتا ہے کہ اس قابل دید نسخہ کو میر پنجہ کش کے شاگرد آغا مرزا دہلوی نے لکھا تھا اس کا ایک ورق ۱۲ دن میں تیار ہوا اور پوری کتاب پندرہ برس میں مکمل ہوئی۔ اس کا سنِ تکمیل ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۰ء) ہے۔ یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ گلستاں کے اس قیمتی اور خوبصورت نسخہ کی کتابت و تزئین کا قطعہ تاریخ مرزا غالب نے لکھا ہے مگر یہ ان کے دیوان کے متداول نسخوں میں موجود نہیں ہے۔

قطعۂ تاریخ :-

فرزانۂ یگانہ مہاراؤ راجہ را — بادا بقائے دولت و اقبال جاوداں
مہرش کجے نہ کار گزاران بارگاہ — تا بستہ کجے ز ناصیہ سایان آستاں
فرمود تا طرازِ گلستاں کنند نو — زاں ساں کہ در بہار شود تازہ بوستاں
آنا کہ حق سپردہ بدستش کلید گنج — تا کردہ خامہ را بہ نگارش گہر فشاں
رخشید حسنِ جوہرِ الفاظ از مداد — زاں ساں کہ در سوادِ شب انجم شود عیاں
غالب ز راز سال بدیں گونہ نقش بست — از روئے طرزِ تعمیہ در معرضِ بیاں
ہر کس کہ خواہد آگہی از سالِ اختتام — باید کہ دل نہد بہ گلستانِ بے خزاں

۱۲۶۵ھ = ۱۲۳۱ + ۳۴

کتب خانوں پر اولیاء اللہ کا فیضان ہندوستان میں کتابیں جمع کرنے کے شوق کو عام کرنے میں اولیاء اللہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ حضرات مسلم فاتحین کی آمد سے پہلے ہندوستان تشریف لائے اور پھر ابرِ کرم بن کر سارے ملک پر چھا گئے۔ لاہور میں داتا گنج بخش، اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی، دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی و خواجہ نظام الدین اولیاء، پاک پٹن میں بابا فرید

ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا، اُچہ (سندھ) میں جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت، بنگال میں شیخ جلال الدین تبریزی، گجرات میں نور قطب عالم، گلبرگہ میں سید محمد گیسو دراز اور اورنگ آباد میں باباشاہ سعید پلنگ پوش[1] و باباشاہ مسافر وغیرہ۔ کی خانقاہوں کے دروازے مسلم و غیر مسلم دونوں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں نے انسانی اعمال میں اخلاص[2] کی روح بیدار کرنے کے لئے جو مجاہدے اور ریاضتیں مقرر کی ہیں ان میں تحصیلِ علم بھی ایک اہم عنصر ہے چنانچہ شیخ سراج الدین عثمانی کو منصب خلافت عطا کرتے وقت حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا تھا کہ "اس کام میں علم سب سے زیادہ درکار ہے اور تمھیں علم سے ابھی وافر حصہ نہیں ملا"۔ اسی وجہ سے شیخ موصوف نے پڑھنا شروع کیا اور کئی سال تک تعلیم جاری رکھی۔ اسی طریقۂ کار کا یہ نتیجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے نام ہندوستانی مصنفین کی

---

[1] باباشاہ سعید پلنگ پوش اور باباشاہ مسافر کے بارے میں ایک نہایت قابل قدر مضمون "اورنگ آباد کی پن چکی اور اس کی تاریخ" رسالہ معارف (اعظم گڈھ) جون اور جولائی ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے۔

[2] تصوف کی زبان میں اخلاص فی العمل۔ احسان کو کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اسے اتنا یقین ہو کہ اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ صفت احسان ہے کہ جو انسان کو فرشتہ خصلت بنا دیتی ہے۔

صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ فارسی اور ہندی زبانوں کو ان سے فیض پہنچا،
اُردو میں تصنیف وتالیف کا آغاز ان ہی کے بابرکت ہاتھوں سے ہوا
شمالی ہند میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی دکن میں شیخ
عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شمس العشاق شاہ میراں جی،
شاہ برہان الدین جانم، اور شاہ میراں جی خدا نما کی تصانیف اردو نظم ونثر کی
اولین کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔

غرض علم کی اشاعت اور دین کی حفاظت کا کام خوبی کے ساتھ انجام دینے
کے سلسلے میں صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہوں میں کتابوں کے بڑے اچھے
ذخیرے جمع کئے تھے، ان میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے ذخیرۂ کتب کی
مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔ اصل میں تو ہر سچا صوفی ایک متحرک کتب خانہ
کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے نور باطن سے لوگوں کے دل ودماغ کو
علم وعرفان کی روشنی سے منور کر دیتا ہے۔

الغرض مسلمانوں کے عہد میں کتابیں جمع کرنے کا ذوق سندھ سے
بنگال اور کشمیر سے مدراس تک جاری وساری تھا اور ہندوستان میں
چاروں طرف کتب خانے اور مدرسے پھیلے ہوئے تھے۔ ساحل ملابار اور
کارومنڈل کے علاقوں میں تو مسلم فتوحات سے پہلے عرب سوداگروں اور
مشائخ وعلماء کی بدولت علم کی شعاعیں پہنچ گئی تھیں۔ اسلامی حکومت
کے قیام کے بعد ملتان، لاہور، دہلی، گجرات اور لکھنؤ کے علمی مراکز سارے
ہندوستان کو فیض پہنچاتے رہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کے ایک عالم ملا عبد العلی

بحرالعلوم کرناٹک کے نواب محمد علی والاجاہ کی دعوت پر لکھنؤ سے مدراس چلے گئے جہاں علم و فضل کا یہ دریا برسوں بہتا رہا۔ ۱۸۱۹ میں مولانا نے وہیں وفات پائی۔ مسلم عہد کے اس آخری دور میں بھی ہندوستان کے ہر شہر میں علم کے دریا بہہ رہے تھے اور ہر شخص کے دل میں تحصیل علم کا شوق موجزن تھا کرنل سلمین ریذیڈنٹ دربار اودھ نے ۱۸۴۴ء میں جو خفیہ رپورٹ لندن بھیجی تھی اس میں لکھا تھا:[۵]

"مسلمانوں میں تحصیل علم کا شوق اس قدر شدید ہے کہ جو متصدی بیس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے وہ بھی اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے ایک منشی یا مولوی ضرور ملازم رکھتا ہے اور تعلیم یافتہ مسلمان منطق اور فلسفہ میں اس قدر ماہر ہیں کہ انگلستان کا گریجویٹ ان کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد

مسلم عہد کے سارے کتب خانوں کی تفصیل اور کتابوں کی تعداد تو نہیں مل سکی ہے۔ لیکن معاصر تاریخوں سے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اکبری کتب خانہ میں ۲۴ ہزار، جہانگیر کے کتب خانہ میں کتابوں اور تصویروں کی تعداد تقریباً ۶۰ ہزار، فیضی کے کتب خانہ میں ۴۳۰۰، نوابین اودھ کے کتب خانوں میں تقریباً ۳ لاکھ، اور وزیر محمود گاواں کے پاس ۳۵ ہزار کتابیں تھیں ان کتب خانوں میں بھی

---

[۵] شرح اسرار خودی مولفہ یوسف سلیم چشتی ص ۲۳۲ (لاہور ۱۹۵۲ء)

ایک کتاب کے بہت سے نسخے رہتے تھے۔ فیضی کے کتب خانے کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں مثنوی نل دمن کے ۱۰۱ نسخے تھے۔

چونکہ کتب خانوں اور مدرسوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ان کے اعداد و شمار کا اندازہ لگانے کے لئے اگر اس عہد کے مدارس[۵۱] کی تعداد بھی دیکھی جائے تو کتب خانوں کی تصویر واضح طور پر نگاہوں کے سامنے آجائیگی۔ صرف دہلی اور آگرہ میں جو علمی اعتبار سے ہندوستان کے بغداد و قرطبہ تھے ہزاروں چھوٹے بڑے کتب خانے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر محمد تغلق کے عہد کو لیجئے اُس وقت دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے اس کے یہ معنی ہوئے کہ شاہی اور ذاتی کتب خانوں کے علاوہ دہلی میں تعلیمی کتب خانے ایک ہزار تھے اگر ہر ایک میں کتابوں کی تعداد اوسطاً تین سو بھی رکھ لی جائے تو صرف دہلی کے تعلیمی کتب خانوں میں تین لاکھ کتابیں ہو ہیں۔ عہد مغلیہ میں مدرسوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا اور اس ترقی کا سلسلہ سلطنت مغلیہ کے آخری دم تک جاری رہا۔ لکھا[۵۲] ہے کہ انیسویں صدی کے

---

[۵۱] اسلامی عہد کے مدارس کا مفصل حال ملاحظہ ہو (الف) "ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں" از مولوی ابوالحسنات ندوی (مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء)

(ب) Promotion of Learning in India by Narendra Nath Law. (London. Longmans, 1916)

The Report of William Adam on Vernacular Education In Bengal & Bihar (1835-38)

شروع میں یعنی برطانوی عہد حکومت سے قبل صرف بنگال میں مدرسوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی اس حساب سے سارے ہندوستان میں لاکھوں مدرسے ہوئے اور تعلیمی کتب خانوں کی تعداد بھی لاکھوں تک پہنچی۔

غرض ہندوستان کے اسلامی کتب خانوں میں کتابوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ کئی کروڑ ہو سکتا ہے۔ یہ تعداد اس عہد کی علمی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی۔

کتابوں کی فراہمی

ہند کے اسلامی عہد میں کتابوں کی فراہمی کے لئے کم و بیش وہی وسائل اختیار کئے جاتے تھے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ہندی مسلمانوں نے کتابیں فراہم کرنے میں جس کاوش اور شغف سے کام لیا اسکی بدولت اطراف عالم سے کھنچ کھنچ کر نادر سے نادر کتابیں ہندوستانی کتب خانوں میں پہنچ جاتی تھیں، غلام خاندان کے سلطان ایلتمش کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بیرون ہند سے اچھی اچھی کتابیں منگواتا اور ہندوستان کے علمی خزانوں کو مالا مال کیا کرتا تھا۔ اسی کے عہد میں آداب السلاطین[۵۱] اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں بغداد سے آئیں۔ اکبر کے کتب خانہ میں باہر سے آئی ہوئی کتابوں میں یاقوت کی معجم البلدان کی ضخیم جلدیں بھی موجود تھیں۔ ایک ترکی دیوان[۵۲] کا نسخہ سلاطین خراسان و ہرات کے

---

[۵۱] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۱۳۷

[۵۲] اس کا سرورق جس پر جہانگیر کی تحریر ہے اب کتبخانہ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

کتب خانوں سے منتقل ہوتا ہوا جہانگیر کے کتب خانہ میں پہنچا۔ شاہجہاں کے کتب خانہ میں حسینی کے شہنشاہ نامہ کا نسخہ تھا جو سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں ترکی سلطان محمد سوم کے لئے قسطنطنیہ میں لکھا گیا تھا۔ عالمگیر کے کتابی ذوق کا شہرہ سُن کر ہرات سے اس کی خدمت میں قرآن کا ایک نفیس نسخہ بھیجا گیا تھا۔ فتاوی عالمگیری کی تدوین کے سلسلہ میں خود عالمگیر نے بھی بہت سی کتابیں بیرونِ ہند سے منگائی تھیں۔ ریاست ٹونک کے ایک امیر عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں "متن حدیث" کے ایک نادر نسخہ کی نقل عرب سے حاصل کی گئی تھی۔ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ مُلا محب اللہ بہاری نے اپنی کتاب "مسلم الثبوت" کی تصنیف کے زمانہ میں اصول فقہ کی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا وہ پورا ہندوستان سے باہر کی تصانیف پر مشتمل تھا۔

ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں یہ کتابیں بڑے جتن سے ہاتھ آئی ہوں گی اور اُن کے حاصل کرنے میں بے حد و حساب روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ مسلم عہد کے ہندوستان میں کتابوں کے ایسے عاشق زار پیدا ہو گئے تھے جو ایک کتاب کی قیمت سیکڑوں اور ہزاروں روپیہ تک ادا کرنے میں پس و پیش نہ کرتے تھے اسی وجہ سے کتابوں کی تجارت کو فروغ ہوا۔ ہر شہر میں کتب فروش

ؔ یہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں ہے۔

ؔ یہ کتب خانۂ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے اس پر ہرات سے آنے کی تاریخ ۱۵ ر شوال ۱۰۹۰ھ درج ہے۔

موجود تھے جو دنیا بھر سے کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے اور شائقین سے منھ مانگی قیمتیں پاتے تھے۔

ہدیوں اور تحفوں میں کتابیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے والے بھی خالی ہاتھ نہ جاتے ان کے دامن زروجواہر سے بھر دیئے جاتے تھے۔ ایک ایرانی شخص نے سلطان محمد تغلق کے دربار میں ابن سینا کی کتاب کا ایک نسخہ پیش کیا جو یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر بادشاہ نے خوش ہو کر پیش کرنے والے کو دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ سونا انعام میں دیا ایک آدمی نے ہی سلطان کے سامنے چند کتابیں پیش کیں تو سلطان نے اسے جواہرات عطا کئے جن کی قیمت سونے کے سکے کے لحاظ سے بیس ہزار مثقال تھی۔ اس سلسلہ میں مغل بادشاہوں کی فیاضیاں اس درجہ بڑھی ہوئی تھیں کہ شاہجہاں نے ایک قصیدے کے صلہ میں اپنے درباری شاعر حاجی محمد جان قدسی کا منہ سات بار موتیوں سے بھر دیا تھا۔ ان فیض رسانیوں کے باعث بیرونِ ہند سے اربابِ علم و فن کھنچ کھنچ کر ہندوستان چلے آ رہے تھے۔ بقول علامہ شبلی ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے۔

بیرونِ ہند سے آنے والے حضرات اپنے ساتھ کتابیں بھی لاتے تھے۔ عہد تغلق میں ایک عالم شمس الدین چار سو حدیث کی کتابیں لے کر ہندوستان آئے تھے۔ علی عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے پاس شیراز سے جو لوگ آئے اور انعام و اکرام لے کر واپس ہوئے ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد میں کتنے بے شمار عالم ہندوستان آئے ہوں گے اور اگر

فی کس سو کتابوں کا بھی اوسط رکھا جائے تو باہر سے آنے والی کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

اب دیکھئے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں ایک طرف تو باہر سے کتابیں آنے کا تانتا بندھا ہوا ہے دوسری طرف ملک کے اندر مصنفین اور مؤلفین کی ایک جماعت تصنیف و تالیف میں مصروف ہے اس طرح ہندوستان کتابی اعتبار سے مالا مال ہو رہا ہے اور کتب خانوں کی رونق میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

کاغذ: کتابوں کی فراہمی میں کاغذ سازی اور خطاطی کی ترویج و ترقی سے غیر معمولی اضافہ ہوا۔ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں عموماً لکھنے کے لئے تاڑ کے پتوں[۱] اور بھوج پتروں کا

---

[۱] بیرونی لکھتا ہے کہ "جنوبی ہندوستان میں تاڑ کے پتوں پر لکھتے ہیں۔ پتوں کی یہ کتاب ایک دھاگے سے اس طرح بندھی ہوتی ہے کہ دھاگہ پتوں کے بیچ کے سوراخوں میں گذرتا ہوا ہر پتے میں سما جاتا اور کتاب کو یکجا رکھتا ہے۔ وسط اور شمالی ہند میں درخت توز کی چھال (لکھنے کے لئے) استعمال کرتے ہیں اس کو بھوج کہتے ہیں یہ ایک ہاتھ لمبی اور پھیلی ہوئی انگلیوں کے برابر یا اس سے کچھ کم چوڑی ہوتی ہے۔ اس کو کسی طریقہ سے مثلاً تیل لگا کر اور صیقل کر کے سخت اور چکنا کر لیتے ہیں اور اس پر لکھتے ہیں۔ یہ جز نیں متفرق ہوتی ہیں اور ان کی ترتیب مسلسل ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے۔ پوری کتاب کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی دو تختیوں کے درمیان جو کتاب کے برابر ہوتی ہیں، بندھی رہتی ہے۔ ان کتابوں کا نام پوتی (پوتھی) ہے"

(کتاب الہند۔ البیرونی (اردو ترجمہ) ص ۲۲۴۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۱ء)

استعمال ہوتا تھا، لیکن جب مسلم عہد میں کاغذ کا رواج ہوا تو کاغذ سازی کے کارخانے ہند کے مختلف شہروں میں کھل گئے۔ اکبری دور میں ایک کارخانہ کشمیر میں قائم ہوا اور طرح طرح کے کاغذ بنائے جانے لگے۔ ابری کاغذ عہد مغلیہ میں ایجاد ہوا تھا' اس زمانے میں کالپی' ظفرآباد، پٹنہ[ہ]، بہار شریف اور اردل کاغذ سازی کے لئے بہت مشہور تھے۔ قصبہ بہار شریف کا ایک محلہ کاغذ سازی ہی کی وجہ سے آج تک کاغذی محلہ کہلاتا ہے۔ ظفرآباد کی نسبت لکھا ہے کہ یہاں پانچ سو دکانیں (کارخانے) کاغذ بنانے کی تھیں اور سال میں تین چار لاکھ روپے کی تجارت ہوتی تھی یہاں آٹھ قسم کا کاغذ بنتا تھا۔ اردلی، نصیری، ہیرانند، راسی، موٹا، پتنگی، چوکھوٹا اور مسلم۔

ے ۵ مولوی سید مقبول احمد صمدنی نے حیات جلیل حصہ اول کے ص ۱۴۹ پر لکھا ہے کہ ۱۸۳۰ء کے قریب تک انگریزی کتابیں پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھیں۔

ے ۵ ملاحظہ ہو "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی جلد اول حاشیہ ص ۹۲۔ حوالوں میں جہاں کہیں "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" آیا ہے اس سے یہی کتاب مراد ہے۔

کتب خانوں کا نظام

مسلم عہد میں کتب خانوں کی ترتیب اور نظام کی طرف بھی توجہ کی گئی
بڑے بڑے کتب خانوں میں تراجم کا سررشتہ بھی ہوتا تھا مگر اس سلسلہ میں باقاعدہ
محکمے مغلوں کے زمانے سے قائم ہوئے۔ کتب خانوں میں ملازمین کی تعداد اور انکی
استعداد کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اکبر نے شاہی کتب خانہ کی کتابیں مصوّر اور
مزیّن کرانے کے لئے ایک سو گیارہ نامور مصوّر مقرر کئے تھے، ان کے علاوہ
بہت سے کاتب، نقاش اور جلد ساز تھے۔ اسی طرح دوسرے مغل بادشاہوں
اور ان کے امراء وغیرہ کے کتب خانوں میں بہت سے اصحاب علم و فن کام کرتے
تھے جن میں اکثر عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ دکن کے عادل شاہی خاندان
کے فرمانروا عادل شاہ اول کے کتب خانہ میں کارکنوں کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی
ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر[۱] کا بیان ہے کہ نوابین اودھ کے کتب خانوں میں تقریباً

---

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر نے نوابین اودھ کے کتب خانوں کی فہرست لارڈ ہارڈنگ
کے حکم سے ۱۸۴۸ء میں تیار کرنی شروع کی تھی اس فہرست کی پہلی جلد فارسی
اور اردو نظم سے متعلق کلکتہ سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی، باقی حصے شائع
نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی ایک اہم تصنیف "لائف آف محمد" ہے، جس کی
پہلی جلد الہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی اور باقی تین حصے ۱۸۶۱ء
میں بمقام برلن چھپے۔ ڈاکٹر صاحب کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو:
دلی کالج اردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء

تین سو آدمی ملازم تھے۔ اکبر کے ایک رتن ابوالفضل کے ذاتی کتب خانے میں چالیس کاتب کام کرتے تھے۔ عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانے میں بقول علامہ شبلی اہل کمال کا ایک بڑا عملہ مقرر تھا۔ اُس عہد کا مشہور جلد ساز محمد امین خراسانی اسی کتب خانہ کے عملہ میں شامل تھا۔ یہ مدت تک مشہد مقدس کے کتب خانہ میں رہا پھر بعد خراسان سے نکل کر ہندوستان آیا۔ یہاں خانخاناں کے دربار میں رسائی ہوگئی انھوں نے اپنے کتب خانہ سے منسلک کر کے چار ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر کیا۔[۱] علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی کتب خانہ کے تربیت یافتہ ہیں اکثر شعرا خوش نویس صناع جن کو خانخاناں تربیت دینا چاہتا تھا کتب خانہ کے کام پر مقرر ہوتے اور ترقی کرتے کرتے نادر روزگار ہو جاتے تھے"۔

ملازمین کے انتخاب میں مذہب و ملت کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا۔ عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانہ کا ایک کارکن مادھو تھا جسے مصوری اور شبیہ سازی میں کمال حاصل تھا۔ مادھو کے علاوہ اور بہت سے ہندوؤں کے نام خطاطوں اور مصوروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ پنڈت جگن ناتھ، رائے منوہر لال، دسونت، کمار، بساون، کیسو، تارا، ہری بنس اور جگن اکبری عہد میں خطاط و مصور تھے۔ جہانگیری دور کے ممتاز مصوروں میں منوہر اور بشن داس شامل تھے اور عالمگیر کے زمانہ میں پنڈت لکشمی رام، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل رائے مشہور خوشنویس تھے۔

---

[۱] مقالات شبلی حصہ دوم (۱۹۳۴ء) ص ۴۳

کاتب | چونکہ بادشاہ خوش نویسی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لئے شاہی کتب خانے کے لئے کاتب کا اہتمام خاص طور پر کیا جاتا اور یگانۂ روزگار کاتب ملازم رکھے جاتے تھے۔ شاہجہاں کے عہد میں کاتبوں کی قدر و منزلت اتنی بڑھی کہ انھیں مہتمم کے عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ کاتب کتب خانوں کے لئے کتابوں کے نسخے تیار کرتے اور ان سے بوقت ضرورت کتابوں کی نشر و اشاعت کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کو جب تزک جہانگیری کی اشاعت کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنے کتب خانہ کے کاتبوں کو اس کتاب کے بہت سے نسخے تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ نسخے حکام سرکاری اور ملک بھر کے معزز امرا کو تقسیم کئے گئے۔

خوش نویسی کے فن میں ہندوستان بھی کسی اسلامی ملک سے پیچھے نہیں رہا یہاں کے بادشاہوں، صوفیوں اور عالموں نے اُسے عرش معلی پر پہنچا دیا تھا۔ ایک طرف سلطان ناصرالدین محمود اور عالمگیر تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے لکھ رہے تھے دوسری طرف سید عبدالجلیل بلگرامی جیسے ذی علم صوفی کے دست و قلم کتابت میں مصروف تھے۔

لیکن اس فن کی اصل ترقی عہد مغلیہ میں ہوئی۔ اس سے پہلے سلطان ابراہیم غزنوی اور سلطان ناصرالدین محمود کے نام کاتبوں کی فہرست میں ملتے ہیں مگر اس زمانہ میں یہ فن پوری طرح ترقی نہ کر سکا۔ کتابیں عموماً خط شکست میں لکھی جاتی تھیں۔ مغلوں کے حسن ذوق نے اسے پسند نہ کیا اور خط نستعلیق میں کتابیں لکھوائیں۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سارے مغل بادشاہ،

شہزادیاں اور شہزادے خوشنویسی سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔ شاہجہاں نہایت اچھا خوش نویس تھا۔ عالمگیر کو بھی اس فن میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ بزم تیموریہ میں ہے کہ وہ شہزادگی سے لے کر آخری عمر تک فرصت کے اوقات میں صبح دیجے سے ۷ بجے تک اور سہ پہر کو ۲½ بجے سے ۵½ تک قرآن شریف لکھا کرتا تھا اُس نے مدینہ منورہ بھیجنے کے لیے دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھے اور ان کی تزئین وغیرہ پر سات ہزار روپے صرف کئے۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ کی کچھ وصلیاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغلوں کے زوال کے بعد بھی خطاطی کا شوق کمال پر تھا۔

خود مختار ریاستوں کے حکمراں بھی اس فن کے بڑے دلدادہ اور مربی تھے گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ اور بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی نہایت نفیس خوش نویس تھے۔ نوابین اودھ نے فن خوش نویسی کی جس طرح سرپرستی کی اس کا حال عبدالحلیم شرر نے "گذشتہ لکھنؤ" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان شاہانہ سرپرستیوں کے اثر سے وراقیت اور نساخیت کا نظام ہندوستان بھر میں قائم ہو گیا تھا اور فن کتابت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی ایک ایک آدمی صرف اپنے قلم سے مستقل کتب خانہ مہیا کر لیتا تھا۔ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک ناگوری نے اپنے ہاتھ سے پانچ سو ضخیم کتابیں لکھی تھیں۔ اس زمانے میں یہاں ایسے باکمال خوش نویس پیدا ہوئے

وصلی نوشتہ عبدالرشید دیلمی (متوفی ۱۰۸۱ھ م ۱۶۷۰ء)

جن کی نظیر نہیں ملتی۔ عہد مسلم کے بالکل آخر میں ایک خوش نویس میر بنیاد علی[1] مرتعش رقم تھے جن کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر میں رعشہ کی کیفیت کو فن کا درجہ دے رکھا تھا۔

مصوّر | شاہان مغلیہ کے کتب خانوں میں کاتبوں کے ساتھ ساتھ مصور بھی نظر آتے ہیں، یہ کتابوں میں تصویریں بناتے، مرقعے اور شبیہیں تیار کرتے پھر ان میں نقرئی اور سنہرے رنگ بھر کر اپنی فن کاری کے جوہر دکھاتے تھے کتابی تصویر کا فن بھی مغلوں کے عہد میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔ دراصل اکبر کی مصوری سے والہانہ شیفتگی اور جہانگیر کی اس فن میں مہارت اور باریک تنقیدی نظر مصوری کی ترویج و ترقی کا باعث ہوئی۔ مغلوں کے عہد میں باہر سے خواجہ عبدالصمد شیرازی، میر معصوم قندھاری، مولانا عبدالرحیم ہراتی، میر عبداللہ تبریزی، عبدالرشید دیلمی اور رشید علی خاں تبریزی جیسے صاحب کمال خطاط و مصور ہندوستان آئے اور قدرشناس بادشاہوں کی بارگاہوں سے شیریں قلم، عنبریں قلم، مشکیں رقم، جواہر رقم، یاقوت رقم، زرّیں قلم، خطابات پائے۔ اس طرح مغلوں کے کتب خانوں میں شہرۂ آفاق خطاط و مصور جمع ہو گئے تھے۔

---

[1] میر بنیاد علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین وصلیاں کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں محفوظ ہیں۔

کتابوں کی سجاوٹ اور حفاظت مغلوں کے عہد میں کتابوں کو نقش و نگار سے سجانے اور ان کی خوبصورت و منقش جلد بندی کرنے کا فن بھی انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس کام کے لئے کتب خانوں میں نقاش اور جلد ساز رہتے تھے جن کی فن کاری کے نمونے آج بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کتابوں کو سجانے اور انھیں آراستہ و پیراستہ کرانے پر جو بے دریغ روپیہ اس زمانے میں صرف کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کو مرصّع اور مزیّن کرانے پر دس ہزار روپے صرف کئے تھے اور سلطان ٹیپو نے قرآن شریف کے ایک نسخہ کی تزئین پر نوّے ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ عالمگیری عہد کا ایک قرآن شریف پٹنہ کے ایک مارواڑی جالان کے پاس ہے یہ اول تا آخر سونے کے حروف میں ہے اور فن کار نے نقاشی کا فن اس پر ختم کر دیا ہے۔

ان حسین اور قیمتی کتابوں کو نمی، دیمک اور چوروں سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ کتابوں کی دیکھ بھال کے لئے کتب خانوں میں وراق ماہر تھے جو نیم کی پتّیاں سُکھا کر کتابوں کے اندر رکھتے اور ورق گردانی کر کے یہ دیکھتے رہتے تھے کہ ان میں کہیں دیمک تو نہیں لگی یا سیلن کا اثر تو نہیں ہو گیا۔ عام طور پر کتابوں کے شروع میں دیمک کے بادشاہ کا نام "کبیکج" لکھ دیا جاتا اور یہ عقیدہ تھا کہ اس کے بعد کتابیں دیمک سے محفوظ ہو جائیں گی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر کتابوں کے یہ الفاظ بھی دیمک نے کھا لئے۔

کتابوں پر مُہریں اور عبارتیں | کتابوں کی حفاظت کے سلسلے میں یہ احتیاط برتی جاتی تھی کہ جب کوئی کتاب شاہی کتب خانے میں داخل ہوتی تو اسے تحویلدار کے حوالہ کیا جاتا وہ اس پر پہلے شاہی مُہر لگاتا پھر اپنی مُہر ثبت کرتا اور اس مُہر کے نیچے تحویل کا سنہ لکھ کر اپنے دستخط کر دیتا تھا۔ جب تحویلدار بدلا جاتا تو نئے تحویلدار کو اپنی تحویل میں لینے کی تاریخ درج کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ بعض کتابوں پر ایک ہی بادشاہ کے عہد میں مختلف تحویلداروں کے نام اور تحویل کی تاریخیں درج ہیں۔ مُہروں کے علاوہ کتابوں پر مختلف عبارتیں بھی ملتی ہیں۔ ان مُہروں اور عبارتوں سے آج بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کتاب کس کس کی ملکیت میں رہ چکی ہے، اور وہ بطور نذر ملی ہے، یا خریدی گئی ہے۔ اکثر کتابوں پر "عرض دیدہ شد" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب بادشاہ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے۔ عالمگیری کتب خانہ کی ایک کتاب "حصن حصین" کے متعلق لکھا ہے کہ اس پر عالمگیر کے قلم کا صاد ثبت ہے۔ شاہی امراء اور تحویلداران کتب خانہ کی مُہریں ہیں۔ جائزے[1] ہیں عالمگیری عہد کے تحویلداروں میں خواجہ سہیل، محافظ خاں اور محمد حافظ کے نام ملتے ہیں۔ دیوان کامران

---

[1] مقالاتِ شروانی (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے مضامین نثر کا مجموعہ) ص ۴۰۷۔

(نسخۂ خدا بخش) اور تاریخ تیموریہ (نسخۂ خدا بخش) خواجہ سہیل کی تحویل میں رہے تھے۔ دیوان کامران[1] (نسخۂ خدا بخش) پر یہ عبارت درج ہے :-

"۲۷ شوال سنہ ۱۹ از وجوہ محافظ خاں تحویلدار
متوفی تحویل محمد حافظ شد"

اب نہ یہ کتب خانے باقی ہیں اور نہ ان کا عملہ۔ البتہ ان کی یادگاریں کتابوں کی شکل میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی کیسی نادر، مرصع مزین، مطلا اور مُذہب کتابوں سے وہ مرحوم کتب خانے معمور تھے۔ یہ کتابیں دراصل عہد گذشتہ کے علمی پیام بر ہیں جو ہند کے مسلم دَور کے علمی، ادبی اور ثقافتی کارناموں کی سرگذشت زبان حال سے سنا رہے ہیں :-

لکھے نہ کیوں، نقش پائے ہمت قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ

---

[1] دیکھئے مجلۂ علوم اسلامیہ ج ۱- ص ۱۳۵ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہندوستان کے مسلم عہد

میں

کتب خانوں کی تشکیل و ترقی

سنہ ۱۱ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک

(۳۹ھ — ۹۳۳ھ)

کتب خانوں کے اولین مرقعے سندھ میں

ہندو پاکستان میں یہ شرف سندھ کو حاصل ہے کہ اسلامی کتب خانوں کے اولین مرقعے اس کی سرزمین میں تیار ہوئے۔ فاتح کی حیثیت سے مسلمان ہندوستان میں سب سے پہلے اسی علاقے میں آئے تھے جسے محمد[۱] بن قاسم نے پہلی صدی ہجری میں فتح کرلیا تھا۔ یہاں عربوں کی حکومت کئی سو برس قائم رہی۔ یہ زمانہ ہندوستان کے علم و ثقافت کی تاریخ کا نہایت اہم دور ہے اسی دور میں ہند اور عرب کے درمیان **علمی اور ثقافتی تعلقات** کی بنیاد پڑی۔ تہذیبی لین دین ہوئے اور ہند کے لسانی خاکوں میں نئے رنگ اُبھرے جن کے اثرات سندھی زبان اور اس کے رسم الخط پر اب تک موجود ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہند اور عرب[۲] کے تجارتی تعلقات نہایت قدیم ہیں جو ظہور اسلام کے بعد بھی قائم رہے، مگر ثقافتی تعلقات کی ابتدا فتح سندھ کے بعد ہوئی۔ ۷۷۱ء میں ہیئت اور ریاضی کا ایک فاضل پنڈت کتاب "سدھانت" لے کر بغداد گیا جہاں اس وقت تختِ خلافت پر خلیفہ منصور متمکن تھا اس نے یہ کتاب بڑی

۱؎ محمد بن قاسم نے صرف دو سال کے عرصہ (۷۱۱ - ۷۱۳ء) میں سندھ اور ملتان کا سارا علاقہ فتح کرلیا۔

۲؎ تفصیل کے لئے دیکھئے "عرب و ہند کے تعلقات" از سید سلیمان ندوی)

قدر کی نگاہ سے دیکھی اور اپنے دربار کے ایک ریاضی داں ابراہیم فزاری کو اس کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ آبِ کوثر میں ہے کہ ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا[1] سدھانت ہے۔ منصور کے عہد میں سنسکرت کی ایک مقبول عام کتاب "کلیلہ دمنہ" کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا جس کا مترجم منصور کے دربار کا کاتب عبداللہ بن المقفع ہے۔ کہتے ہیں کہ آج کلیلہ دمنہ کے جس قدر ترجمے موجود ہیں ان سب کی اصل یہی عربی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد ہارون رشید کے عہد میں علمی تعلقات کے اور دروازے کھلے۔ اس زمانہ میں ہندوستان سے وید بغداد بلوائے گئے اور طب، نجوم، ہیئت وغیرہ کی بہت سی کتابوں کے سنسکرت سے عربی میں ترجمے ہوئے۔ ان کتابوں کے علاوہ ہند اور عرب کے علمی تعلقات کی ایک نشانی ارقام ہندیہ بھی ہے۔ عرب عدد لفظوں میں لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ہندسے لکھنے ہندوؤں سے سیکھے اسی وجہ سے وہ انھیں ارقام ہندیہ کہتے ہیں۔ لیکن یورپ میں یہ اعدادِ عربیہ عربیک نیومرلس (Arabic Numerals) کہلاتے ہیں کیونکہ وہاں کے باشندوں نے ہندسے لکھنے کا طریقہ عربوں سے حاصل کیا تھا آبِ کوثر کے مصنف کا خیال ہے کہ جو پنڈت "سدھانت" لے کر بغداد گیا تھا اسی نے عربوں کو حساب کا نیا طریقہ سکھایا ہوگا۔

---

[1] آبِ کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۴۴

سندھ میں مسلمانوں کے طویل قیام کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ سندھی اسلام کی مساوات اور رواداری دیکھ کر خود بخود اسلام قبول کرنے کی طرف مائل ہو گئے اور ان میں تحصیل علوم کا جذبہ اتنا اُبھرا کہ بہتیرے اسلامی علوم کے امام بن گئے۔ ایک نومسلم سندھی ابو معشر فن مغازی اور سیر کے امام تھے جنھوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۷۰ھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو ہارون رشید نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی حکومت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں منصورہ اور ملتان دو آزاد ریاستیں بن گئیں۔ لیکن ان تغیّرات کے باوجود علم کا چرچا جاری رہا۔ "آئینۂ حقیقت نما" میں ہے کہ سندھ کے ملک نے علم و فضل و تہذیب میں یہاں تک ترقی کی تھی کہ اس کی شعاعیں بنگال و تبت تک پڑنے لگیں اور علم و علماء کی قدردانی نے ہندوستان کے باکمالوں کو عزت کے ساتھ بغداد پہنچا دیا۔

سندھ کی ان علمی ترقیوں کی روشنی تاریخ کے اوراق میں آج تک پھیلی ہوئی ہے مگر اس زمانہ کے کتب خانے ایسی گہری تاریکی میں روپوش ہیں کہ ان کا پتہ کسی طرح نہیں چل سکا تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی پہلی مسلم حکومت کے عہد میں کتب خانوں کی صورت گری کے اسباب فراہم ہو گئے تھے اور یہ بھی بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُچہ، ٹھٹھہ اور

---

[۱] آئینۂ حقیقت نما مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ص ۵۶ اکراچی ۱۹۵۹ء

ملتان جیسے اہم علمی مراکز کتب خانوں سے خالی نہ تھے۔ یہ شہر والی سندھ ناصرالدین قباچہ کے زمانہ (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء - ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء) میں علم کے بہت بڑے مرکز بن گئے تھے۔ قباچہ نے ملتان میں مولانا قطب الدین کاشانی کے لئے مدرسہ کی عمارت تعمیر کرائی جو ہندوستان میں اسلامی مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی روزانہ اس مدرسہ میں آتے اور صبح کی نماز مولانا کاشانی کے پیچھے ادا کرتے تھے، مگر یہ واضح رہے کہ ملتان ٹھٹھہ اور بھکر وغیرہ اسلامی عہد میں علم کے اولین مراکز تھے اور وہاں قباچہ سے بہت پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں جو علماء باہر کے ملکوں سے ہندوستان آتے ان کی پہلی منزل یہی شہر ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے ان مقامات میں کتب خانوں کے قیام اور انکی ترقی کے لئے جو فضا پیدا ہو گئی تھی وہ اس وقت تک ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہ تھی۔

لاہور، علم اور کتابوں کا گھر

کتب خانوں کے سلسلہ میں ملتان کے بعد لاہور کا نام آتا ہے جو غزنوی عہد میں علم اور کتابوں کا گھر بن گیا تھا۔ محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کر کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا

---

[1] "عہد اسلامی کا ہندوستان" از سید ریاست علی ندوی ص ۲۷۰۔
(ادارۃ المصنفین پٹنہ ۱۹۵۰ء)

مگر اس کے انتقال کے بعد سارا مفتوحہ علاقہ ہاتھ سے نکل گیا۔ صرف پنجاب پر قبضہ رہا جہاں خاندان غزنوی نے تقریباً دوسو برس حکومت کی اور لاہور دارالخلافہ رہا۔ اس زمانہ میں بخارا، سمرقند، غزنی اور بلخ وغیرہ سے علماء کا لاہور آنے کا تانتا بندھا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ اسمٰعیل پہلے بزرگ ہیں جو علم حدیث و تفسیر کو لاہور لائے اور جنھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ ۳۹۵ھ میں لاہور آ گئے تھے۔ ان کے بعد شیخ علی بن عثمان ہجوری عرف داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے عہد حکومت میں لاہور آئے اور تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گئے آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں "کشف المحجوب" بہت مشہور ہے۔ محمود غزنوی کے زمانہ میں علم ہیئت و نجوم کا ایک زبردست عالم ابوریحان البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) بھی ہندوستان آیا اس نے ہندوؤں کے مذہب، فلسفہ اور علوم سے واقفیت حاصل کر کے ایک نہایت اعلیٰ اور مستند کتاب "کتاب الہند" لکھی۔ البیرونی نے ۱۱۴ سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور اپنی ایک بہترین تصنیف "قانون مسعودی"[1] سلطان مسعود کے نام معنون کر کے اس کی علم پروری کو لافانی بنا دیا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ گو اس زمانہ میں مسلمانوں کی پائدار اور مضبوط حکومت ہندوستان میں قائم نہیں ہوئی تھی لیکن

---

[1] یہ کتاب اب دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔

کتب خانوں کی تشکیل و ترقی کی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ غزنوی سلاطین کی علم دوستی علماء نوازی اور ان کے عہد کے مدارس اور تصنیفات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ غزنوی دَور میں پنجاب کتب خانوں سے معمور تھا۔
صاحب فرشتہ[۱] نے لکھا ہے کہ "سلطان مسعود نے ممالک محروسہ کے تمام شہروں میں اس قدر مدارس و مساجد تعمیر کرائے تھے کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے" سلطان مسعود نہایت ذی علم اور سخی بادشاہ تھا۔ اہلِ قلم نے مختلف علوم و فنون کی کثیر التعداد کتابیں اس کے نام معنون کی تھیں۔ اس کے جانشینوں میں سلطان ابراہیم نہایت دیندار اور صاحب علم بادشاہ گذرا ہے۔ خطِ نسخ لکھنے میں اُسے مہارتِ تامہ حاصل تھی اور کتابت کا اتنا شوق تھا کہ قرآن مجید کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک سال مکّہ اور دوسرے سال مدینہ بھیجا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید مدینہ کے کتب خانے میں جہانگیر کے عہد تک موجود تھے۔ ابراہیم کے ایک وزیر ابو نصر فارسی کو علم و ادب سے ایسی دلچسپی تھی کہ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ بنوائی جو اہل علم کا مرکز بتائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے غالب خیال یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ہوگا۔

۱ـ حکیم محمد قاسم فرشتہ (متوفی ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء)، مصنف تاریخ فرشتہ۔

غزنوی دور میں جو یگانۂ روزگار ادیب اور شاعر لاہور میں آکر جمع ہو گئے تھے اُن کے پاس بھی کتابوں کے نادر ذخیرے ہوں گے۔ ان ارباب علم میں مسعود سعد سلمان ہندوستان کا وہ ممتاز شاعر تھا جس نے فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی شعر کہے اور اس زبان میں اس نے ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اکبر کے عہد تک موجود تھا۔ مسعود سعد سلمان نے سلطان بہرام شاہ اور دوسرے غزنوی سلاطین کی مدح میں قصائد بھی کہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ سلطان بہرام شاہ کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اس کے لئے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں شیخ سنائی کی "حدیقۃ الحقیقہ" قابل ذکر ہے۔

سلطان محمد غوری اور کتب خانے

پنجاب کی حکومت ۱۱۸۶ء میں غزنوی خاندان سے نکل کر غوریوں کے ہاتھ میں آگئی اس کے پانچ سال بعد جب شہاب الدین[۱] محمد غوری نے ترائن کے میدان میں پرتھوی راج کو شکست دے کر اجمیر اور دہلی کا علاقہ فتح کر لیا تو شمالی ہند میں راجپوتوں کی طاقت اور ہندوؤں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کی مستقل حکومت کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کی

۱؎ اسے سلطان معز الدین محمد غوری بھی کہتے ہیں۔

فتوحات کا سلسلہ جیسے جیسے بڑھتا گیا مدرسوں اور کتب خانوں کا نظام وسیع اور جامع ہوتا گیا۔ محمد غوری کو ہندوستان میں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا اور وہ دہلی میں قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کر کے غزنی چلا گیا[1] اس کے باوجود اس نے اجمیر میں متعدد مدرسے قائم کئے اور کتب خانوں کی نشوونما کے لئے راہیں کھول دیں۔ یہ سلطان تعلیم کے معاملہ میں نہایت وسیع النظر تھا اس نے اپنے غلاموں کو اتنی اعلیٰ تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ آفتاب بن کر چمکے۔ اُس کے غلاموں میں قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ اور بختیار خلجی نے کتب خانوں کی تخلیق میں بڑی اعانت کی۔ قطب الدین کے عہد میں دہلی اور دوسرے شہروں میں کتب خانے قائم ہوئے ناصر الدین قباچہ کی سرپرستی میں کتب خانوں کی تحریک سندھ میں پھیلی اور بختیار خلجی کی فتح بنگال و بہار نے کتب خانوں کی توسیع و ترقی کے لئے دروازے کھول دیے۔

---

[1] جب ۱۲۰۶ء وہ غزنی کو واپس جارہا تھا تو راستہ میں باطنی فدائیوں کی ایک جماعت نے اسے قتل کر دیا۔

سلاطینِ دہلی اور کتب خانے

سنہ ۱۲۰۶ء میں سلاطین دہلی کی سلطنت کے قیام کے بعد سے ہندوستان میں کتب خانوں کا نیا اور سنہرا دور شروع ہوا۔ اب چونکہ اس ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی تھی اس لئے کتب خانوں کا سلسلہ وسیع ہونے کے امکانات روشن ہو گئے۔ جب دہلی سلطنت کے پہلے سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو یہ شہر علم و ہنر کا ایسا عمدہ گہوارہ بن گیا جس میں علمی اور کتابی ذوق کی پرورش اور ترقی نہایت سُرعت کے ساتھ ہوئی۔ اسی مرکزی شہر سے یہ ذوق سلاطین دہلی کی فوجوں، تاجروں، مشائخ اور علماء کے قافلوں کے ساتھ بنگال، گجرات اور دکن وغیرہ پہنچا جس نے کتب خانوں کی وسعت اور ان کے استحکام کا مستقل انتظام کر دیا۔ اس موقع پر یہ کہہ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں غلام سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی جو چوراسی برس تک قائم رہی۔ اس کے بعد مختلف خاندان خلجی، تغلق، سید اور لودی یکے بعد دیگرے ۱۵۲۶ء تک حکومت کرتے رہے۔ لیکن دہلی سلطنت کا تین سو بیس سالہ دور بڑا ناہموار رہا۔ آئے دن خانہ جنگیاں اور حکومت کی تبدیلیاں ہوتی رہیں سلاطین دہلی کو شروع میں مغلوں کے حملے پریشان کرتے رہے۔ پھر ۱۳۹۸ء میں

تیمور کے حملے نے انھیں بالکل بیجان کر دیا۔ اس کے باوجود اُنھوں نے علم و ہنر کا چراغ روشن رکھا اور اہلِ علم کی قدر دانی اور ہمّت افزائی کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ اگرچہ اس دور کے مدارس، علماء، فضلاء اور شعراء کا ذکر تو مورخین نے کیا ہے لیکن کتب خانوں کی طرف سے نہایت بے رخی برتی ہے۔ صرف چند کتب خانوں کا ذکر کر کے وہ خاموش ہوگئے ہیں لہٰذا جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں، ہمیں جہاں کہیں ارباب علم اہل قلم اور مدارس ملیں گے وہاں ہم کتب خانوں کا ہونا یقینی سمجھیں گے اس لئے کہ ان کے بغیر تعلیمی اور تصنیفی کام انجام ہی نہیں پا سکتے۔ اسی نظریئے کے تحت کہا جا رہا ہے کہ سلاطین دہلی کی سلطنت میں جا بجا بے شمار کتب خانے پھیلے ہوئے تھے۔

غلام خاندان
۱۲۰۶ - ۱۲۹۰ء

دہلی سلطنت کے اس پہلے حکمراں خاندان کے عہد میں ایسی سرگرمیوں کے ذکر ملتے ہیں جن سے کتبخانوں کی تعمیر و ترقی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ قطب الدین ایبک (متوفی ۱۲۱۰ء) نے دہلی فتح کرنے کے بعد مسجد قوت الاسلام تعمیر کی تھی جہاں قیاس ہے کہ اس عہد کے رواج کے مطابق مدرسہ اور کتب خانہ بھی ہوگا۔ یہ بادشاہ بڑا علم دوست اور سخی تھا۔ اس نے اہلِ علم و ہُنر کو اکرام و انعام سے اتنا نوازا اور ایسی بے پایاں داد و دہش کی کہ لکھ بخش مشہور ہوا اس کے جانشین سلطان التمش (متوفی ۱۲۳۵ء) کے بیرون ہند سے کتابیں منگانے کا حال پچھلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ یہ سلطان

کتابوں کا ایسا عاشق تھا کہ ایک بار قاضی جلال عروس بغداد سے تحفہ میں خلیفہ مامون رشید کی ایک تحریر لائے[1] جو اس نے سفینۃ الخلفاء میں لکھی تھی، اسے پاکر التمش اتنا خوش ہوا کہ اس کے صلہ میں قاضی جلال کو اپنی آدھی مملکت دے دینی چاہی۔ سلطان ناصر الدین محمود (متوفی ۱۲۶۶ء) بھی کتابوں کا بڑا شیدائی تھا اس نے کتابت کو اپنا دل پسند مشغلہ بنا کر فنِ کتابت کو ہندوستان میں معزز و محترم بنا دیا تھا۔ غلام خاندان کے سب سے بڑے بادشاہ غیاث الدین بلبن (متوفی ۱۲۸۷ء) کی نسبت لکھا ہے کہ اس کا دربار علم اور دولت دونوں کا مرکز تھا۔

ان سلاطین کی معارف پروری کے اثر سے اس نوزائیدہ سلطنت میں کتب خانے قائم کرنے کا جو ذوق و شوق پھیلا ہوگا اس کا اندازہ لگانے کے لئے ان مدارس کو دیکھئے جو دہلی، ملتان، ٹھٹھ، اُچہ اور بہار وغیرہ میں قائم ہوئے تھے۔ ان میں اُچہ (سندھ) کے مدرسہ فیروز شاہی اور دہلی کے مدرسوں معزی اور ناصری نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس عہد کے ارباب علم میں نظام الدین حسن نیشاپوری مصنفِ "تاج المآثر"۔ فخر الدین مبارک شاہ مصنفِ "تاریخ مبارک شاہی" قاضی منہاج الدین سراج مصنف "طبقات ناصری" محمد عوفی

---

[1] اس تحریر کا خلاصہ بزم مملوکیہ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن) کے ص ۹۱ پر درج ہے۔

مصنف "لباب الالباب" اور "جوامع الحکایات و لوامع الروایات"[۵۱] اور ناصر الدین قباچہ کا وزیر، عین الملک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غلاموں کے عہد میں صوفیائے کرام کی وجہ سے بھی کتب خانوں کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ ایک طرف ۱۲۰۶ء میں دہلی سلطنت قائم ہوئی اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح (متوفی ۶۳۴ھ/۱۲۳۵ء) نے دہلی میں روحانی سلطنت قائم کی، ان کے جانشین شیخ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۱۲۶۵ء) نے تو پاک پٹن کو اپنا مرکز بنایا مگر ان کے خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء[۵۲] (متوفی ۱۳۲۵ء) اور ان کے خلیفہ شیخ نصیر الدین[۵۳] چراغ دہلوی (متوفی ۱۳۵۶ء) نے دہلی کو رونق بخشی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں سے جو کتب خانے ملحق تھے ان میں خواجہ نظام الدین اولیاء کا کتب خانہ بہت عمدہ تھا جس میں تصوف اور مذہب کی بیش قیمت کتابیں جمع تھیں۔ خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ شیخ سراج الدین اس کتاب خانہ کی بہت سی عمدہ

---

۵۱ اس کتاب کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔

۵۲ خواجہ صاحب کے ملفوظات کا مکمل مجموعہ فوائد الفواد ہے جسے ان کے مرید حسن سجزی نے مرتب کیا تھا۔

۵۳ چراغ دہلوی کے ملفوظات کے ایک مجموعہ کا نام "خیر المجالس" ہے۔

کتابیں اپنے وطن لکھنوتی (بنگال) لے گئے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے کتب خانے نے اس زمانہ کی روحانی اور علمی زندگی کو جس طرح متاثر کیا اسے پروفیسر وحید مرزا نے مورخ برنی کے حوالہ سے یوں تحریر کیا ہے[۵]:۔

"زیادہ تر امراء اور بڑے لوگ اور طلاب جو شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے تھے ایسی کتابیں جیسے احیاء العلوم اور اس کا ترجمہ، عوارف، کشف المحجوب، قوۃ القلوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، قاضی حمید الدین ناگوری کی لوائح اور لوائح اور امیر حسن کی فوائد الفواد کے بہت سے گاہک مشتاق رہتے تھے اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوف اور حقائق کی کتابیں تلاش کیا کرتے تھے۔"

خلجی خاندان

۱۲۹۰ — ۱۳۲۰ء

خلجی عہد میں بھی خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو اور دوسرے ارباب علم کی دینی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رہیں جن سے عوام میں کتابیں جمع کرنے کا میلان پیدا ہوا اور کتبخانوں کی تعداد بڑھی۔ بالخصوص انھیں امیر خسرو کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ ہندوستان کی علمی و ادبی اور موسیقی کی تاریخ میں خسرو کو نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ انھیں متفقہ طور پر ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی شاعر

---

[۵] امیر خسرو از پروفیسر وحید مرزا ص ۱۵۰ (ہندوستانی اکیڈیمی۔ الٰہ آباد۔ ۱۹۴۹ء)

مانا گیا ہے انھوں نے ایک طرف اپنی کہہ مکرنیوں، گیتوں، پہیلیوں اور غزلوں سے اُردو زبان کے ابتدائی خاکہ کو دلچسپ اور دلفریب بنایا اور دوسری طرف اپنی کثیر تصانیف سے کتب خانوں کی رونق بڑھائی مورخ برنی کا بیان ہے کہ خسرو کی تصانیف اتنی تھیں کہ ان سے ایک کتب خانہ بن سکتا تھا۔ جامی نے ان کی تعداد ننانوے بتائی ہے۔ اس زمانہ کے ارباب علم میں صرف خسرو ہی ایسے شخص تھے جو اپنی علمی قابلیت، جودت طبع اور دینداری کی وجہ سے مشائخ کے حلقوں اور بادشاہوں کے درباروں میں نگہ محبت واحترام سے دیکھے جاتے تھے خواجہ نظام الدین اولیاء کو ان سے بڑی محبت تھی جلال الدین خلجی نے انھیں اپنا ندیم اور مصحف بردار مقرر کیا تھا لیکن بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شاہی کتب خانے کے مہتمم بھی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو واقعی خلجی عہد کا شاہی کتب خانہ بڑا عالی شان ہوگا ظاہر ہے کہ جس کتب خانہ کے مہتمم امیر خسرو جیسے صاحب کمال ہوں اس کی شوکت اور ندرت سے کون انکار کرسکتا ہے اس عہد میں کتب خانوں کی کثرت کا ثبوت ان علمی ترقیوں سے بھی ملتا ہے جنھوں نے سارے ہندوستان کو درخشاں کردیا تھا۔ خلجی خاندان کا پہلا فرمانروا جلال الدین خلجی (متوفی ۱۲۹۶ء) خود شاعر تھا اور علم وادب سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کا جانشین علاء الدین خلجی (متوفی ۱۳۱۶ء)[1] تعلیم یافتہ

---

[1] عہد علائی کے ابتدائی پندرہ سال کے واقعات امیر خسرو کی "خزائن الفتوح" میں درج ہیں۔

تو نہ تھا مگر خدا کی شان دیکھئے کہ علم وفن کی ترقی کے اعتبار سے اس کا عہد نہایت ممتاز تھا۔ اس دور میں بقول ضیاء الدین برنی چھیالیس علما دلی میں ایسے تھے جو دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ قیاس کہتا ہے کہ ان حضرات کے کتب خانے بھی بے نظیر ہوں گے ان کے علاوہ اور بہت سے کتب خانے ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں اس لئے کہ اس عہد میں اہل علم کی کثرت تھی اور مسلمانوں کی حکومت انتہائی وسیع ہو گئی تھی۔ بنگال تو غلاموں کے عہد میں فتح ہو چکا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں گجرات اور دکن بھی فتح ہو گئے۔ ان فتوحات کا ایک اثر یہ ہوا کہ دہلی کے علمی مرکز کی روشنی گجرات اور دکن میں بھی پہنچ گئی اور مدرسوں اور کتب خانوں کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا۔

تغلق خاندان
۱۳۲۰ - ۱۴۱۴ء

عہد تغلق میں شمالی ہند اور دکن کے علمی رشتے زیادہ مستحکم ہو گئے اور درس وتدریس کی بھی خوب رونق ہوئی۔ ظاہر ہے کہ علم کو جتنا فروغ ہوگا اور تعلیم جتنی پھیلے گی اسی قدر کتب خانوں کی ترقی ہو گی۔ تغلق خاندان کے دوسرے سلطان محمد تغلق نے تخت نشین ہونے کے دوسرے ہی سال ۱۳۲۶ء میں دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت بنایا اور دہلی والوں کو وہاں جانے کا حکم دیا چنانچہ لوگ اپنا ساز وسامان، اپنا اساثہ اندوختہ اور اپنی کتابیں دولت سے کر دولت آباد پہنچ گئے۔ اگرچہ

یہ زیادہ دنوں پایہ تخت نہ رہا لیکن اس دوران میں وہاں علمی و کتابی ذوق کے جو بیج پڑ گئے تھے وہ آگے چل کر برگ و بار لائے اس میں شک نہیں کہ محمد تغلق کے بعض منصوبوں سے عوام کو بڑی تکالیف پہنچیں مگر اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں وہ عربی و فارسی کا عالم اور حافظِ قرآن تھا۔ مورخین اس کی دینداری[1]، فیاضی اور انصاف پسندی کا اعتراف کرتے ہیں، اس نے تعلیم کی توسیع کے لئے جو کام کئے وہ سب کے نزدیک مسلّم ہیں اس کے عہد میں مدرسوں کے قیام سے کتب خانوں کی رفتارِ ترقی بہت بڑھ گئی تھی۔ خود محمد تغلق کا کتب خانہ نہایت نفیس تھا اس کے علاوہ دہلی میں ایک ہزار تعلیمی کتب خانے تھے۔
کہتے ہیں کہ عہد تغلق میں مدرسوں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے جن کے کتب خانوں میں ریاضی، ہیئت اور طب وغیرہ کی ہزارہا کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان تینوں علوم سے سلطان کو خاص ذوق تھا اس کے علاوہ علماء و شعراء کی وہ اتنی قدر و منزلت کرتا تھا کہ اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو خاص طور پر شیراز بھیجا کہ قاضی عضد (مواقف کے مؤلف) کو ہندوستان لائیں۔ اسی زمانہ میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تھا سلطان نے

---

[1] محمد بن تغلق کی دینداری اور مذہبی پالیسی کے متعلق ملاحظہ ہو "سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات" از خلیق احمد نظامی (رسالہ برہان دہلی مارچ سنہ ۱۹۴۶ء)

اُسے انعام واکرام سے سرفراز کیا اور دہلی کا قاضی مقرر کر دیا۔ اس سلطان کی سرکار سے بدر چاچ[1]، عصامی[2]، ضیاء الدین برنی[3] اور مولانا ضیاء الدین نخشبی[4] بدایونی

---

[1] بدر چاچ نے ایک مثنوی "شاہ نامہ" لکھی اور سلطان محمد تغلق کی مدح میں قصائد لکھے۔
[2] عصامی نے بارہ ہزار اشعار کی ایک مثنوی "فتوح السلاطین" لکھی جو مدراس سے شائع ہو چکی ہے۔ [3] برنی نے تاریخ فیروز شاہی لکھی جس میں سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس تک کے واقعات ہیں اور تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) میں فیروز شاہ تغلق کے جلوس سے وفات تک کے واقعات درج ہیں۔ [4] نخشبی کی دو کتابیں تصوف میں "سلک السلوک" اور "کلیات وجزئیات" ہیں۔ ان کی تصنیف "طوطی نامہ" کافی مشہور ہے جس کے ترجمے ترکی، جرمن اور انگریزی میں بھی ہوئے۔ سنہ ۱۷۲۹ء میں اس کا ترجمہ دکنی اُردو میں ہوا اور سنہ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے ایک ادیب سید حیدر بخش حیدری دہلوی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کر کے "طوطا کہانی" نام رکھا۔ رسالہ صحیفہ لاہور ستمبر ۱۹۵۰ء کے ایک مضمون "طوطا کہانی" میں محمد اسمٰعیل پانی پتی لکھتے ہیں کہ طوطی نامہ نخشبی کے دو قلمی نسخوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ ایک برٹش میوزیم لندن میں ہے، جسے ایک پارسی خورشید بن اسفندیار نے کپتان آنجین (Aungien) کے لئے لکھا تھا اور دوسرا نسخہ محمد حسین خاں مالک کتب خانہ افغانی سرکلر روڈ لاہور کے پاس ہے۔

فیضیاب ہوتے تھے۔ پچھلے اوراق میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان محمد تغلق (متوفی ۱۳۵۱ء) کے حضور میں جب کوئی شخص کتاب نذر کرتا تو وہ اس کا دامن زر و جواہر سے بھر دیتا تھا داد و دہش کے ان واقعات کی روشنی میں پردۂ تصور پر یہ نظر آتا ہے کہ محمد تغلق کے دربار میں کتابیں نذر کرنے والوں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا ہے لوگ عمدہ عمدہ کتابیں پیش کر کے بیش قیمت انعام حاصل کر رہے ہیں اور کتب خانوں میں طرح طرح کی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) کے عہد میں کتب خانوں نے ترقی کی طرف اور قدم بڑھایا۔ ایک کتب خانہ تو خود فیروز شاہ کا تھا اس کے سوا اور بہت سے کتب خانے اس عہد میں کھلے۔ ایک دار الترجمہ بھی قائم ہوا جس کے زیر نگرانی سیکڑوں کتابیں فارسی کا جامہ پہن کر کتب خانوں میں داخل ہوئیں. کانگڑہ (نگر کوٹ) کی فتح کے موقع پر جب سلطان کو سنسکرت کی تیرہ سو کتابیں ملیں تو اس نے بعض کا فارسی میں ترجمہ کرایا اور ایک کتاب کا عز الدین خالد خانی نے ترجمہ کیا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا گیا۔[1] اس زمانہ میں فقہ کے متعلق "فتاوی تاتارخانیہ" اور "فقہ فیروز شاہی" جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھی گئیں۔ فیروز شاہ نہایت ذی علم آدمی تھا اس نے

---

[1] یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

"فتوحات فیروز شاہی" لکھی اور اہل علم کی سرپرستی کرنے میں بڑی فیاضی دکھائی۔ لکھا ہے کہ یہ سلطان علمی وظائف و عطیات پر ایک کروڑ[1] چھتیس لاکھ تنکہ[2] سالانہ صرف کیا کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے بہت سی مسجدیں اور مدرسے بھی تعمیر کرائے اور لڑکیوں اور غلاموں کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا۔ تعلیم کی طرف سلطان کی اس قدر توجہ کرنے سے تعلیمی کتب خانوں کی خوب ترقی ہوئی ان میں دہلی کے مدرسہ فیروز شاہی کا کتب خانہ سب سے بڑا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس عالی شان مدرسہ کا کتب خانہ دیکھنے کے لائق ہوگا۔ مورخ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "یہ مدرسہ شان وشوکت، خوبی عمارت وموقع اور حسن انتظام و تعلیم کے لحاظ سے تمام مدارس ہند میں سب سے بہتر اور عمدہ ہے"

لودی خاندان
۱۴۵۱ - ۱۵۲۶ء

لودی[3] عہد کے کتب خانے بتاتے ہیں کہ ان کے قیام کا جو سلسلہ دہلی سلطنت کے اولین دور سے شروع ہوا تھا وہ نامساعد حالات کے باوجود جاری اور ساری رہا۔ لودی خا

---

[1] History of India by H.M. Elliot & John Dowson, v.3 p. 317 (London, 1871)

[2] تنکہ سلاطین دہلی کے زمانہ میں چاندی کے سکہ کا نام تھا جس کے وزن میں مختلف سلاطین کے زمانہ میں تبدیلی ہوتی رہی۔

[3] لودی عہد کے حالات "مخزن افغانی" (خواجہ نعمت اللہ ہروی) اور تاریخ داؤدی (عبد اللہ) میں درج ہیں۔

آخری بادشاہ ابراہیم لودی کے ایک امیر غازی خاں کا کتب خانہ
جو نہایت عمدہ تھا فتح پنجاب کے بعد بابر کے قبضہ میں آگیا تھا۔
ایسے اور بھی ذاتی کتب خانے اس دور میں موجود تھے۔ اور تعلیمی
کتب خانوں کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ سلطان سکندر لودی (متوفی ۱۵۱۷ء)
کے عہد کے ایک عالم سید ابراہیم کی نسبت لکھا ہے کہ "چنداں کتب و
اکثر بخط او از کتب خانہ او بر آمد کہ از حد و حصر خارج" اس بادشاہ کا
عہد احیاء علوم کا دور تھا ۱۳۹۸ء میں تیموری حملہ سے دہلی کے جو علمی
گلستان ویران و برباد ہو گئے تھے ان میں نئے سرے سے بہار سکندری
دور میں آئی۔ ہندوؤں میں فارسی دانی کا رواج اسی زمانہ سے ہوا،
بقول مصنف تاریخ داؤدی و طبقات اکبری ہر ایک کے دماغ میں علم
کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس بیان میں اس قدر اضافہ کر دینا بے محل
نہ ہوگا کہ ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود تھا۔
سکندر لودی نے اشاعت تعلیم کی طرف بڑی توجہ فرمائی۔
ررخا اور متھرا وغیرہ میں مدرسے کھولے۔ ہندی اور سنسکرت کی
کتابوں کے ترجمے کرائے۔ میاں بھوہ نے اپنی کتاب "معدن الشفا"
میں لکھا ہے کہ "ہر طرفے علم و فضل را رونق شدہ در فصحائے روزگار
و علمائے کبار در ہر علمے تصنیف ساختند" معدن الشفا یا طب سکندری
اس عہد کی ایک اہم طبی تصنیف ہے پانچ سو صفحے کی اس کتاب میں
ایک ہزار سے زیادہ امراض اور ان کے علاج کا ذکر ہے اس کی تکمیل کے

سلسلے میں جب علم طب کی بہت سی کتابیں فراہم کی گئیں اور خراسان سے بھی کچھ کتابیں منگائی گئیں تو ان سے شاہی کتب خانہ کو بہت فائدہ پہنچا اور اس میں طب کی نایاب کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

سکندری عہد میں عبداللہ تلبنی، شیخ فتح اللہ اور میاں لاڈن کے کتب خانے بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں ان میں قاضی عضدالدین شیرازی کی مطالع اور مواقف، ابویعقوب یوسف سکاکی کی مفتاح العلوم اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف جیسی کتابیں موجود تھیں ان کتب خانوں کا بھی مورخین نے حسب عادت حال نہیں لکھا مگر ان حضرات کے علمی مشاغل کتب خانوں کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملتان میں سیاسی بحران کے باعث طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور مشائخ اور علماء ملتان چھوڑ کر دہلی اور دوسرے شہروں میں آباد ہو رہے تھے۔ علم کی دولت بھی ہمیشہ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ تیموری حملہ کے اثر سے دہلی کی علمی رونقیں سمٹ کر جون پور پہنچ گئی تھیں اور اب ملتان کی تباہی دہلی کی رونق کا سبب بن گئی۔ اسی زمانہ میں شیخ عبداللہ تلبنی اور ان کے بھائی عزیزاللہ تلبنی نے ملتان سے آکر دہلی اور سنبھل میں علم کی مسندیں بچھائیں۔

دہلی میں شیخ عبداللہ کی درس گاہ اتنا بلند مرتبہ رکھتی تھی کہ سکندر لودی خود درس میں شریک ہوتا تھا۔ لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ کی درس گاہ سے میاں لاڈن، میاں شیخ گوالیاری اور میراں سید جلال بدایونی وغیرہ

جیسے چالیس علمائے متبحر پڑھ کر نکلے[1]

لودی عہد میں ملتان سے آنے والوں میں خاندان زبیری کینو بزرگ حضرت مخدوم شیخ سماء الدین اور شیخ جمالی بھی شامل تھے۔ اس خاندان کے افراد نے اپنے کارناموں سے صرف لودی عہد ہی کو درخشاں نہیں کیا بلکہ سیکڑوں برس تک تدریس و تصنیف کے ذریعے کتب خانوں کی رونق بڑھائی۔ مخدوم شیخ سماء الدین[2] (متوفی ۹۰۱ھ / ۱۴۹۵ء) ساری عمر رشد و ہدایت اور تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ بہلول لودی اور سکندر لودی جس عجز و نیاز کے ساتھ آپ کی خدمت میں آتے تھے اس کا ذکر "مخزن افغانی" وغیرہ میں آیا ہے۔ شیخ موصوف کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ بیابانی عشق الٰہی اور شوق علم دونوں سے سرشار تھے۔ جذبے عالم میں مالوہ کے جنگلوں میں پھرتے رہے مگر کتابیں پاس رہیں "شجرۂ سہروردیہ"[3] میں ان کتابوں کی چوری اور پھر ان کے حصول کی کیفیت درج ہے۔ شیخ

---

[1] حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۳۱ (مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء)
[2] شیخ سماء الدین کی تالیفات۔ مفتاح الاسرار، حواشی بر لمعات شیخ فخر الدین عراقی۔ تذکرہ حضرت مخدوم شمس العارفین صدر الدین محمد ترک بیابانی خلف شیخ مخدوم شہاب الدین سہروردی۔ [3] شجرہ سہرورد کے مصنف میاں احمد خان اکبر شاہی (شیخ جمالی کے پوتے) تھے۔ عہد جہانگیری میں انتقال ہوا ان کی تصنیف معدن اخبار احمدی بھی قابل ذکر ہے۔

سماء الدین کے دوسرے صاحبزادے شیخ نصیر الدین عہد سکندر لودی میں شیخ الاسلام تھے انھوں نے تدریس کی دولت اپنے باپ سے پائی تھی ان کے لڑکے شیخ فتح اللہ شیخ عبدالغفور المعروف بہ میاں لاڈن اور مفتی جمال خاں بڑے پایہ کے عالم و فاضل ہوئے۔ ان تینوں نے اپنے باپ کے علاوہ شیخ تلبنی سے بھی فیض علم پایا تھا۔ شیخ فتح اللہ تو اپنے استاد کے ایسے محبوب شاگرد تھے کہ ۹۲۲ھ میں ان کے انتقال کے بعد وہی ان کی مسند علم اور درس پر متمکن ہوئے۔ اس جانشینی نے شیخ تلبنی کے ذخائر کتب کو بھی شیخ فتح اللہ کے کتب خانے میں شامل کر دیا۔ میاں لاڈن (متوفی ۹۴۵ھ) نے بھی درس و تدریس کے سلسلے میں بہت سی درسی اور مذہبی کتابیں جمع کی تھیں وہ سکندر لودی کے مشیر مذہبی تھے۔ ان کے شاگردوں میں ملا عبدالقادر بدایونی کے استاد شیخ عبداللہ بدایونی اور سید علاء الدین مجذوب المشتہر بہ علاول بلاول بھی شامل ہیں ——
اس طرح مخدوم شیخ سماء الدین کے خاندان میں تقریباً چالیس برس (شیخ سماء الدین تا میاں لاڈن) کے اندر بڑا اچھا کتب خانہ قائم ہو گیا تھا جس کا کچھ نہ کچھ فیض اٹھارھویں صدی عیسوی تک باقی رہا اس خاندان کے ایک فرد نواب مبارک علی خاں میرٹھی (متوفی ۱۸۷۶ء) نے اپنے رسالہ "مبارک" میں لکھا ہے کہ جب غلام قادر خاں کے خلاف مرہٹوں نے میرٹھ پر یلغار کی تو اس وقت خاندان کا قدیم کتب خانہ بھی تباہ ہو گیا۔

لودی عہد کے ایک گوہر آبدار شیخ جمالی[۱] (متوفی ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء)
ہیں۔ جن کو اس عہد کی بلند ترین ادبی شخصیت کہا جاتا ہے۔ انھوں نے علوم
ظاہری و باطنی اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ سماء الدین[۲] سے حاصل کئے تھے
وہ عالم، شاعر اور مصنف ہونے کے علاوہ بہت بڑے سیاح بھی تھے
ان اوصاف کی روشنی میں جمالی کا کتب خانہ دیکھیے اس میں "عوارف"
کا وہ نسخہ بھی موجود تھا جو اس کے مصنف شیخ شہاب الدین سہروردی کے مطالعہ
میں رہ چکا تھا اور ان ہی کے سجادہ نشین نے یہ متبرک تحفہ جمالی کو بغداد
کے دوران قیام میں دیا تھا عوارف جیسی اور بھی نایاب کتابیں شیخ
کو اثنائے سفر میں ملیں ہوں گی اور ان کے پاس بہت سے نوادر جمع ہو گئے
ہوں گے اس سفر میں جمالی کی ملاقات ملا جامی جیسے اکابرین سے ہوئی
اور علمی مباحثے اور پر لطف صحبتیں رہیں حقیقت میں شیخ جمالی کی سیر و
سیاحت سے علم و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا ان کی سیاحت کی کئی یادگاریں ایسی
ہیں جو علمی دنیا میں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کی جائیں گی۔ ان میں ایک مثنوی
"مہر و ماہ"[۳] ہے جو جمالی نے تبریز کے قیام میں اہل تبریز کی فرمائش پر لکھی تھی
اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مضمون[۴] (خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی)

---

[۱] آپ کا نام حامد اللہ بن فضل اللہ اور تخلص جمالی تھا اور آپ شیخ سماء الدین کے
چچازاد بھائی اور داماد تھے۔

[۳] اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے۔

[۴] رسالہ اردو ادب انجمن ترقی اردو ہند جلد ۴ ص ۱۱۱

یہ بڑی سچی بات کہی ہے کہ اہل ایران کا کسی ہندوستانی سے اس طرح فرمائش کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جمالی نے شعر و سخن کی دُنیا میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔" اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی طلب میں سکندر لودی نے شیخ جمالی کو ایک منظوم خط[1] لکھا تھا جو شعری ادب میں خاصہ کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ شیخ جمالی کی تصانیف[2] میں مثنوی " مراۃ المعانی" "سیر العارفین" اور دیوان[3] فارسی قابل ذکر ہیں۔ مثنوی " مراۃ المعانی" کا ایک نہایت خوبصورت قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری

---

[1] سلطان سکندر لودی کا منظوم خط شیخ جمالی کے نام :-

اے مفخر گنج لایزالی	دے سالک راہ دین جمالی
در گرد جہاں بسے زدہ سیر	در منزل خود رسیدہ بالخیر
بودی تو مسافر زمانہ	الحمد کہ آمدی بخانہ
باید کہ کتاب مہر و ماہم	ارسال کنی چنانکہ خواہم
اے شیخ بما برس بزودی	بسیار مسافرت نمودی
یکتا بسوئے درگہم گام	تا در یابی ز گل رخے کام
چشمم بر جمال تو طپان است	دل مرغ مثال در فغان است
من سکندر و تو خضر مائی	باشد کہ بسوئے ما بیائی

[2] ملاحظہ ہو "تصانیف شیخ جمالی" (مقالات شروانی ص ۳۱۲)

[3] دیوان کے قلمی نسخے حبیب گنج اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(موجودہ اسٹیٹ لائبریری) حیدرآباد دکن میں ہے جس کے آخری عنوان کا ایک شعر یہ بھی ہے:-

اے جمالی جملہ دریا نوش باش
چوں صدف پُر دُر شود خاموش باش

لیکن شیخ جمالی کا یہ شعر نعت کا بہترین شعر کہا جاتا ہے اسکی نسبت شیخ عبدالحق محدث نے لکھا ہے کہ بعض اولیاء نے خواب میں اس شعر کی قبولیت کے متعلق بارگاہ نبوت سے بشارت پائی ہے۔

مُوسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پرتوِ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

شیخ جمالی کا علمی فیض ان کے بیٹوں حیاتی اور گدائی نے جاری رکھا ان دونوں کے فضائل علمی کا حال پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے باپ کے کتب خانہ کی رونق قائم رکھی ہوگی بلکہ خود بھی کتابوں کے نہایت قیمتی ذخیرے جمع کئے ہوں گے۔ میاں عبدالحی المتخلص بہ حیاتی سلطان سلیم شاہ سوری کے مصاحب و ندیم تھے ان کی سخنوری، ظرافت طبع اور فیاضی کی شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مصنف "مخزن افغانی" نے تعریف کی ہے۔ عبدالصمد المتخلص بہ گدائی عہد اکبری میں پہلے شیخ الاسلام تھے۔ ان کے کتب خانہ کی کتاب امیر خسرو کا ایک دیوان پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہے جس پر گدائی کی مہر بدیں الفاظ ثبت ہے۔

المفتقر الی الملک المتعالی - الحقیر گدائی بن جمالی

ہندوستان کے مسلم عہد
میں
کتب خانوں کا عروج و زوال

۱۵۲۶ — ۱۸۵۷ء

(۹۳۳ھ — ۱۲۷۴ھ)

شاہانِ مُغلیہ کے کتب خانے

کتب خانوں کی تحریک کے جو پودے دہلی سلطنت میں لگائے گئے تھے وہ مغلیہ عہد میں نشو و نما پاکر تناور درخت بن گئے۔ حقیقت میں مغل بادشاہوں کے ہندوستان پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ ان کے علمی ذوق اور جمالیاتی شعور ان کی ذہانت و ذکاوت، نفاست پسندی اور فیاضی نے ہندوستانی زندگی کے ہر گوشہ میں چار چاند لگادئے تھے۔ علوم وفنون کے سارے شعبوں، ادب، خطاطی، مصوری، موسیقی، تعمیرات، صنعت و حرفت وغیرہ کی ان کے عہد میں ایسی تزئین اور پرورش ہوئی جس کی نظیر ہندوستان نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس عہد میں کتب خانوں کو بھی بڑا عروج حاصل ہوا اور کتابیں جمع کرنے کا ذوق بامِ کمال پر پہنچا۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ہر علمی اور تعلیمی تحریک کو پھولنے پھلنے کے لئے پرسکون فضا درکار ہوتی ہے۔ مغل بادشاہوں کے حسن سیاست و تدبر اور ان کی رواداری سے ہندوستان کو ایسا قرار و امن ملا جو علم و ہنر کی ترقیوں کے لئے بڑا سازگار ہوا اور ملک بھر میں تعلیمی چرچے ایسے عام ہوئے کہ سماج اور علم کے رشتے گہرے اور مضبوط ہو گئے۔ ذوقِ کتب بینی ہر طرف پھیل گیا اور بے شمار کتب خانے منظرِ عام پر آ گئے جن کی رونق و ترقی کا خاص زمانہ اکبر سے لے کر عالمگیر تک ہے۔

ان بادشاہوں کا ذوق کتب بینی، ان کے عہد میں ارباب علم و اہل قلم کی کثرت اور مدرسوں کی بہتات کتب خانوں کے ترقی کرنے کا سبب بنی یہ بادشاہ کتابوں کے معاملے میں عہد جدید سے اتنے قریب تھے کہ اکبر نے معجم البلدان و مہابھارت وغیرہ کے ترجمے کرانے اور عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تالیف کا کام ممتاز مولفین کی ایک جماعت کے سپرد کیا تھا غرض ہندوستان میں اجتماعی تالیف کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا بھی مغلوں کے سر ہے۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کا جانشین تیمور جس نے وسط ایشیا اور ہندوستان کے علاقوں میں انسانی خون کے دریا بہادئے تھے اور جس نے بے شمار خلق خدا کی متاع عافیت کو لوٹ لیا تھا، اسی کی پانچویں پشت میں انسانیت کا محافظ اور علم و ادب کا مربی بابر اُٹھا جس کی اولاد میں علم سے وابستگی اور کتابوں سے شیفتگی برابر منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ مغلوں کے دور زوال میں بھی شعر و شاعری اور کتابی ذوق کے چرچے جاری رہے۔ انسان نہیں رہتا صرف اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ تیموری سلاطین باقی نہیں رہے اور ان کی داستان ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی۔ لیکن علم و ثقافت اور کتب خانوں کی تاریخ میں ان کے نام زرّیں حروف میں ہمیشہ ثبت رہیں گے اور کتابوں کی شکل میں انھوں نے جو خزانہ چھوڑا ہے وہ لازوال رہے گا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

پہلا مغل کتب خانہ

اس کتب خانہ کی بنیاد مغلیہ سلطنت کے بانی محمد ظہیر الدین بابر نے ڈالی جو ایک زبردست فاتح اور عالم ہونے کے علاوہ کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا شائق تھا۔ وہ جب ہندوستان آیا تو اپنے اسلاف کے کتب خانوں سے بہترین نوادر کو منتخب کرکے ساتھ لایا۔ بابر اپنے آبائی ملک کو چھوڑ سکتا تھا لیکن علوم و فنون کے یہ ذخائر اسے چھوڑنے گوارا نہ ہوئے۔ ان ذخائر میں بیشتر مصوّری اور نقاشی کے نوادر تھے جن کا بقول مارٹن ہندی آرٹ نے بہت گہرا اثر قبول کیا۔ ان ہی قیمتی ذخائر سے شاہان مغلیہ کے پہلے کتب خانہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں عہد بہ عہد اضافے ہوتے رہے۔

تزک بابری کے اندراجات ظاہر کرتے ہیں کہ بابر کی کتابوں سے دلچسپی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ سفر اور حضر دونوں میں کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا اس کی عادت یہ تھی کہ مہمات کے دوران میں جب کوئی کتب خانہ ملتا تو وہ اس کی کچھ کتابیں اپنے بیٹوں کے پاس بھی بھیج دیا کرتا تھا چنانچہ فتح پنجاب کے وقت جب امیر غازی خاں کا کتب خانہ اسے ملا تو اس کی کچھ کتابیں منتخب کرکے ہمایوں اور کامران کے پاس بھیج دیں۔ اس طرح بابر کا کتب خانہ دو قسم کی کتابوں پر مشتمل تھا ایک تو وہ جو بابر اپنے وطن سے لایا تھا دوسری وہ جو اسے فتوحات میں دستیاب ہوئی تھیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کتب خانہ میں قرآن پاک، گلستان سعدی، شاہنامہ فردوسی

خمسہ نظامی، مثنوی خسرو اور ظفر نامۂ یزدی کے نسخے موجود تھے۔ کیونکہ یہی بابر کی پسندیدہ کتابیں تھیں مغل خاندان کے اس پہلے بادشاہ کا شوقِ کتب بینی تو دیکھئے، طبیعت ناساز ہے مگر اپنے کتب خانہ میں کتابوں کا مطالعہ کررہا ہے۔ خود بابر کہتا ہے کہ :۔

"جمعہ کے دن تیئیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی۔ ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا بہت دیر تک بے چینی رہی، دوسرے دن ہفتہ کو بخار رہا، کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت (صلعم) کو مقبول ہو۔"

یہ علمی ذوق بابر کو ورثہ میں ملا تھا۔ علم دوست باپ شیخ مرزا نے اسکی تعلیم کے لئے شیخ مزید بیگ باباقلی علی، اور مولانا قاضی عبداللہ جیسے متبحر علماء کو منتخب کیا جن کی صحبت نے بابر کی وہ فطری صلاحیتیں جو علم و ادب کی طرف راغب تھیں یکدم اُجاگر کردیں وہ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ بارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور جب تک زندہ رہا بے رحم رشتے داروں اور ناسازگار حالات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا لیکن پھر بھی علم و ادب کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں جب بھی فرصت ملی تو بیاض نکالی اور شعر پڑھنے بیٹھ گیا۔ طبیعت کو موزوں پایا تو اس بیاض میں اور اضافہ کردیا۔ بابر کی مادری زبان تو ترکی تھی مگر وہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی قادر تھا اور فارسی

ترکی میں شعر کہتا تھا اس کے دیوان کا ایک نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ بابر نثر نگار بھی تھا اور فنون لطیفہ سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ اس نے "تزک بابری" کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی اور اسے چھوٹی چھوٹی تصاویر سے مزین کرایا۔ اس نے خط بابری ایجاد کیا اور اس خط میں قرآن کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجے۔

بابر ۱۵۲۶ء میں ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد وہ صرف چار برس زندہ رہا لیکن اس دوران میں اسے ہندوستان سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ اس نے یہاں کی زبان سیکھی اور اپنی تزک میں جا بجا ہندی کے الفاظ استعمال کرکے اُردو زبان کے ارتقاء پر اپنا نقش ثبت کردیا۔ بابر کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے اس میں ترکی الفاظ کے پہلو بہ پہلو کھڑی بولی کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس وقت اردو زبان کی ساخت میں بنیادی اہمیت حاصل کر رہی تھی بابر اپنے اس شعر میں کہتا ہے "مجھ کو منکا، موتی، لعل و گہر کی کوئی ہوس نہیں ہے۔ فقیر کے لئے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی کافی ہے۔"

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی ✦ فقرا حلیغہ بس بولغوسیتو پانی و روتی

ہمایوں ہمایوں کو تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا خصوصاً اس کے بھائیوں کی مسلسل بیوفائیوں اور بہادر شاہ (والی گجرات) اور شیر شاہ سوری کی پیہم نبرد آزمائیوں نے اس کی زندگی وبال کردی تھی پھر بھی وہ کتب خانوں کے سلسلے میں بڑا کام کر گیا

۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے اپنے سارے دشمنوں کو زیر کر کے دوبارہ ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالی اور ۱۵۵۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا لیکن اس ایک سال کے مختصر عرصے میں اس نے نہایت عمدہ کتب خانہ قائم کر لیا تھا اور اس کے لئے ریاضی و نجوم و ہیئت کی بہترین کتابیں فراہم کی تھیں۔ ہمایوں کو علم ہیئت سے جو اُنس تھا اس کی مناسبت سے اس نے اپنے کتب خانہ کے لئے ایک بلند مقام یعنی شیر منڈل کی تیسری منزل منتخب کی تھی یہ سہ منزلہ عمارت دہلی کے پرانے قلعہ میں شیر شاہ سوری نے اپنے لئے بنوائی تھی۔ ہمایوں کے کتب خانہ کا مہتمم لال بیگ کا باپ نظام الملقب بہ باز بہادر تھا۔

حقیقت میں کتابیں جمع کرنے کے شوق کو فروغ دینے میں وہی صحیح رہبری کر سکتا ہے جو خود علم کا دلدادہ اور کتابوں کا شائق ہو۔ ہمایوں میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان اوصاف جلیلہ کے علاوہ اس میں ہمت و استقلال کی خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ اس کی شہزادگی اور بادشاہت کا تقریباً سارا زمانہ مصائب و آلام میں گذرا مگر ہمایوں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور نہ وہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس ہوا۔ اسکے علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ جنگ و جدل کی مصروفیتوں اور اُلجھنوں سے جو وقت بھی ملتا وہ علمی مباحث اور مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ شاعری ہو یا ریاضیات و نجوم ہو اس کا ذہن رسا سب پر یکساں حاوی تھا شاعری کے تمام اصناف پر اُسے قدرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں

ھمایوں کی لائبریری — پرانا قلعہ۔ دہلی

واقعات کی تصریح، خیالات کی سادگی و برجستگی اور مضمون آفرینی موجود ہے۔ ہمایوں صاحبِ دیوان بھی تھا۔ ابوالفضل کے قول کے مطابق اس کا دیوان اکبر کے کتب خانہ میں موجود تھا اور اب اس کے دیوان کا ایک واحد قلمی نسخہ[1] تھوا ضلع سارن (بہار) کے کتب خانہ میں ہے جس کی دریافت کا سہرا پروفیسر سید حسن عسکری (شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی) کے سر ہے۔

ہمایوں کے محبوب مشغلے دو تھے۔ مطالعہ کتب اور علم ہیئت۔ وہ میدانِ جنگ میں ہو یا قسمت کے ہاتھوں پریشان پھر رہا ہو۔ ہر حال میں کتابیں اس کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ کھمبات کے محاصرے کے دوران میں ہمایوں کے پاس منجملہ اور کتابوں کے "تاریخ تیموریہ" کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا جسے بہزاد نے مصور کیا تھا۔ اور جب وہ شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر ہندوستان سے جا رہا تھا تو اس بے سروسامانی کے عالم اور یاس انگیز حالت میں اس کے کتب خانہ کا مہتمم مع کتابوں کے ساتھ تھا اور اس کے استاد الیاس اردبیلی بھی موجود تھے جن سے وہ ہیئت و نجوم کا درس لے رہا تھا۔

---

[1] اس نسخہ پر ایک مفصل مضمون پروفیسر حافظ شمس الدین احمد سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۳ء میں رسالہ معیار پٹنہ میں لکھا تھا۔ دیوان ہمایوں ڈاکٹر ہادی حسن سابق پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تصحیح و تہذیب کے بعد حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

ہمایوں کے اس علمی شغف نے اس عہد کے نامساعد حالات میں بھی کتب خانوں کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اسباب پیدا کر دیے تھے وہ شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد ایران چلا گیا تھا۔ جب پندرہ برس کے بعد وہاں سے ہندوستان واپس آیا تو میر علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیرازی اور بہت سے ایرانی علماء اور شعراء کو اپنے ساتھ لایا جنھوں نے ہندوستان کو کتابی دولت سے مالا مال کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ خود ہمایوں اپنی پریشاں حالی میں بھی کتابوں کی طرف سے غافل نہیں رہا اسی کی فرمائش پر غیاث الدین محمد المعروف بہ خواند میر[1] نے "قانون ہمایونی" لکھی۔ یوسف بن محمد ہروی نے "ریاض الادویہ" تصنیف کی اور مولانا محمد[2] بن علی بن محمد السکن القاضی السمرقندی نے مختلف علوم وفنون کی قاموس "جواہر العلوم ہمایونی" لکھی۔ لیکن ہمایونی عہد کے متعلق تین کتابیں قابل ذکر ہیں۔ "ہمایوں نامہ" جسے ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے لکھا۔ "تذکرۃ الواقعات" جو ہمایوں کے انتقال کے

---

[1] خواند میر بابر کے زمانہ میں ہرات سے آیا تھا۔ اس کی تصنیف "خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاخیار" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ خواند میر "روضۃ الصفا" کے مصنف میر خواند کا پوتا تھا۔ ص ۳۰۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "بزم تیموریہ" مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ص ۴۵-۴۶

بتیس برس بعد اس کے آفتابچی جوہر نے مرتب کیا اور "تاریخ ہمایوں"
جو بایزید نے اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی۔
ہمایوں "علم ہیئت"، "درس کتابوں" کا ایسا عاشقِ زار تھا کہ ان
دونوں پر اس نے اپنی جان ہی نثار کر دی۔ ایک شام کو وہ اپنے
کتب خانہ کی چھت پر ستارۂ زہرہ کا مشاہدہ کرنے گیا۔ مغرب کی اذان
سن کر نیچے اتر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر سے پھسل کر گر گیا اور اسی صدمہ سے
وفات پائی۔ قاسم کاہی نے یہ تاریخ کہی۔
بے تاریخ اد کاہی رقم زد – ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کتب خانہ مقبرۂ ہمایوں

ہمایوں عمر بھر علم کا شیدائی رہا مگر اس کو
اطمینان کے ساتھ مدرسے قائم کرنے کا
وقت نہ مل سکا پھر بھی اس کے عہد میں دہلی اور آگرہ وغیرہ میں مدارس
قائم ہوئے۔ یہ ہمایوں کی حسنِ نیت کا ثمرہ تھا کہ اس کا مقبرہ ایک مدت
تک علم کی نشر و اشاعت کا مرکز رہا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ دہلی میں
مقبرۂ ہمایوں کی چھت پر ایک زبردست مدرسہ تھا جس میں بڑے
بڑے فاضل اساتذہ درس دیتے تھے۔ وہاں طلباء کے رہنے کا بھی
انتظام تھا۔ مدرسے کے قریب چھوٹے چھوٹے کمرے طلباء کے رہنے
کے لئے بنے ہوئے تھے۔ اس بیان کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی بے محل نہ ہوگا
کہ اس دار العلوم سے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ ملحق تھا۔

اکبر
۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء

اکبر کا عہد ہندوستانی کتب خانوں کی تاریخ میں نشانِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں ان کے استحکام اور ان کی ترقی کے لئے بہترین اسباب فراہم ہوئے۔ اس علم دوست بادشاہ نے کتابی ذوق کو ہمہ گیر بنانے اور اسے فروغ دینے میں ایسا انہماک دکھایا کہ اس زمانہ کے کتب خانے علم پرور ادارے اور علمی تربیت گاہ بن گئے تھے۔ خود اکبر کا کتب خانہ اتنا قیمتی تھا کہ بقول مورخ اسمتھ (SMITH) اس سے پہلے اتنے قیمتی کتب خانہ کا وجود نہیں ملتا۔ اکبری دربار کے ایک رتن عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانہ کو علامہ شبلی نے ایک اکاڈیمی یا دارالحکمۃ بتایا ہے۔

اکبری عہد میں کتب خانوں کی ترقی کا سب سے بڑا سبب اکبر کا کتابوں سے ذاتی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کا بڑا دلدادہ تھا اور ان دونوں کے اشعار نہایت روانی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اس کی علم نوازی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی مملکت کے تمام صوبوں کے لئے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو دنیا میں علم و ہنر کی اشاعت ہوتی رہے تاکہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہو جائیں اور ان کی یادگار صفحہ ہستی پر باقی رہے"۔ اس علم پروری کا شہرہ سنکر ہندوستان اور بیرون ہند کے بہترین دماغ دربار شاہی میں جمع ہو گئے تھے جو دن رات معدنِ علم (کتب خانوں) سے لعل و جواہر نکالتے اور شاہ کے حضور میں نذر کرتے تھے۔

اکبر کے اس کتابی ذوق کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جاہل محض تھا بلکہ وہ پڑھا لکھا انسان تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی[1] میں "ظفر نامہ" کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے جس کے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ " فرور دین " موجود ہے۔ اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے اور پھر اس کے نیچے شاہجہاں کی تحریر ہے۔

اکبر کے ذوق مطالعہ اور اس کے کتب خانہ کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے[2]:-

"جہاں پناہ نے اپنے تبحر علمی سے کتب خانے کو چند حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ایک شاخ قصر شاہی کے اندر ہے اور ایک باہر اور ان ہر دو شاخوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ہمیشہ تمام علوم و فنون کی کتب و رسائل قیمت و فنون کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف مدارج میں شمار کی جاتی ہیں، اور ہندی و فارسی و یونانی و کشمیری و عربی زبانوں کی کتابیں نظم و نثر کے اختلاف کے لحاظ سے ترتیب دار پیشگاہ حضور میں لائی جاتی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو "کیا اکبر محض امی تھا" از زبید احمد، رسالہ جامعہ ۱۹۲۹ء ص ۲ - ۱۱)

[2] آئین اکبری جلد اول از علامہ ابوالفضل ص ۱۹۰ - ۱۹۱ (دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن) اردو ترجمہ۔

علماء و فاضلانِ آگاہ دل کتابوں کی نوعیت کے متعلق جہاں پناہ
سے عرض کرتے ہیں اور بادشاہ علم پرور ہر کتاب کو اول سے
آخر تک سنتے ہیں ہر روز جس صفحے یا سطر تک کتاب پڑھی جاتی
ہے حضرت خود اپنے قلم سے اس مقام پر ہندسہ شمار تحریر فرماتے
ہیں اور پڑھنے والے کو عدد اوراق کے مطابق زر سرخ و سفید
بطور انعام عطا ہوتا ہے"

" شاید ہی کوئی مشہور کتاب باقی رہ گئی ہو جو محفل شاہی میں
پڑھی نہ گئی ہو اور کوئی داستان قدیم و کلمات حکمت و عجائبات
علوم ایسے نہ ہوں گے جو اس پیشوائے عقلا کو یاد نہ ہوں۔
قبلۂ عالم کسی کتاب کو مکرر سننے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتے
بلکہ بے حد شوق کے ساتھ کتابوں کو بہ کرات سماعت فرماتے
ہیں۔ اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ،
مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم،
بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، کلیات خسرو و مولانا
جامی، دیوان خاقانی و انوری و دیگر کتب تاریخ ہمیشہ
محفل مبارک میں پڑھی جاتی ہیں"

بزم تیموریہ کے مصنف کا بیان ہے کہ "قلعہ آگرہ میں مثمن
برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ ہے اس میں شاہی کتب خانہ تھا"
اس میں کتابوں کی کل تعداد ۲۴ ہزار تھی جن کی قیمت کا اندازہ ۶۵ لاکھ

کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی باقاعدہ درجہ بندی کی گئی تھی۔ پہلے حصّہ میں شاعری، طب، نجوم اور موسیقی۔ دوسرے میں تصوف، فلسفہ، علم اللسان اور ہندسہ۔ تیسرے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اکبری کتب خانہ کے نادر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں علمائے ماضی اور علمائے عصر کی خود نوشت کتابیں کثیر تعداد میں جمع تھیں۔

ان نایاب و نادر کتابوں کی نگرانی اور ترتیب و تنظیم کے لئے بہت بڑا عملہ مقرر تھا جس میں نہایت لائق و ذہین اصحاب شامل تھے مثلاً علامہ فیضی مہتمم کتب خانہ رہا تھا۔ کتاب دار کی خدمت عنایت اللہ شیرازی کے سپرد تھی جس کو بہترین خوش نویس ہونے کی بنا پر مکتوب خاں کا خطاب ملا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی بھی کتب خانہ کے نگراں رہے تھے وہ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ شہزادی سلیمہ سلطان بیگم کو کتاب "خرد افزا"[1] کی ضرورت ہوئی۔ شاہی کتب خانہ میں اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ملا صاحب اس وقت بدایوں میں تھے۔ شہزادی نے ان کو بلوایا اور وہ جب آئے تو جائداد ضبط کرنے کی دھمکی دی۔

اکبری کتب خانہ میں آئے دن نایاب و نادر کتابوں کے اضافے بھی ہوتے رہتے تھے۔ اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ شاہی کتب خانہ میں ضرور بھیجتے۔ درباری مصنفین کی تصانیف اور تراجم

---

[1] سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اکبر کو بہت پسند تھی۔

کے متعدد نسخے کتب خانے میں رکھے جاتے۔ فتوحات کے موقع پر جو کتابیں ملتیں وہ کتب خانہ میں داخل کی جاتیں۔ ہندوستان سے جو قافلے حج کے لئے جاتے ان کے سپرد بھی کتابوں کی فراہمی کا کام تھا۔ اکبر کے پاس تحفہ میں عرب سے بھی کتابیں آیا کرتی تھیں۔ ۱۵۷۲ء میں فتح گجرات کے موقع پر اکبر کو جو کتابیں ملیں انھیں شاہی کتب خانے میں داخل کیا گیا۔ ۱۵۹۵ء میں جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کی ۴۳۰۰ منتخب قلمی کتابیں بھی شاہی کتب خانہ میں داخل کردی گئیں۔

ان اضافوں کے علاوہ اکبری کتب خانہ کی ترقی اور رونق کا سبب وہ محکمہ بھی تھا جو کتابوں کے ترجمہ کرانے، انھیں خوش خط لکھوانے اور ان کو نقوش و تصاویر سے مزین کرانے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس محکمہ سے بادشاہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بقول ابوالفضل داروغۂ محکمہ ہر ہفتہ ہر شخص کا کام ملاحظہ عالی میں پیش کرتا اور ہر مصور اپنے کام کے مطابق انعام و اضافہ سے سرفراز فرمایا جاتا۔ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ قبلۂ عالم خود جائے تصویر پر نشان بنا دیتے تھے اور ہنرمند استاد اس مقام پر سحر کاری کرتے تھے۔ اس قدردانی اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوا کہ عہد اکبری میں فن مصوری بام عروج پر پہنچا اور اس محکمہ میں یگانۂ روزگار فنکار جمع ہو گئے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں ملازمت کے لئے مذہب و ملت کی کوئی قید نہ تھی۔ قوم کہار کا لڑکا دسونت بھی

یہاں ملازم تھا جو خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کی تعلیم کی بدولت باکمال مصور بن گیا تھا۔ خواجہ عبدالصمد کو خطاطی اور مصوری میں یہ کمال حاصل تھا کہ وہ خشخاش کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھ دیتا تھا۔ اس نے کہانیوں کی کتاب "داراب نامہ" الفاظ کے بجائے تصاویر میں مرتب کرکے اکبر کے حضور میں پیش کی تھی۔ اس دور کے ایک خوش نویس میر دوری کی نسبت لکھا ہے کہ خط نستعلیق لکھنے میں اس کا ہندوستان میں کوئی ہم مقابل نہ تھا۔ اکبر نے اسے کاتب الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ ایسے باکمال استادوں نے چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اکبر نامہ، رامائن، نل دمن اور کلیلہ دمنہ وغیرہ تصاویر، اور نقش و نگار سے آراستہ کیں۔ "داستان امیر حمزہ" میں ایک ہزار چار سو تصویریں بنائیں۔ "تاریخ خاندان تیموریہ"[1] کو ساٹھ مصوروں نے ایک سو بارہ تصاویر سے آراستہ کیا۔ مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ[2] کے نام سے ہوا جس میں تمام معرکوں کی تصویریں بنوائی گئیں اس کی تکمیل میں پانچ برس لگے اور اس پر دس ہزار روپے صرف ہوئے۔ اسی طرح سنسکرت کی اور کتابوں کے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے اور فارسی کی بہت سی کتابیں سنسکرت میں منتقل ہوئیں

---

[1] یہ نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں ہے۔ (ایک مشرقی کتب خانہ۔ ص ۶۴)

[2] رزم نامہ کا یہ نسخہ جے پور میں ہے۔

یہ سب کتابیں عمدہ نستعلیق میں لکھی گئیں اور انھیں تصاویر و نقوش سے آراستہ کرا کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اکبری کتب خانے میں پندرہ ہزار ایسے قلمی نسخے تھے جنھیں اکبر نے دوبارہ خوشخط لکھوایا تھا۔

کتابوں کے معاملے میں اکبر کا ایسا انہماک کتب خانوں کی ترقی کا جتنا ضامن بنا ہوگا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے، صرف درباری علماء کے کتب خانوں کی تعداد سیکڑوں تک شمار کی جا سکتی ہے۔ خواجہ نظام الدین احمد مصنف "طبقات اکبری" نے عہد اکبری کے علماء اور شعراء[1] کی تعداد ۱۸۱ بتائی ہے اور ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ" کی تیسری جلد میں ۲۲۵ علماء اور شعراء کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے جن کے علمی کام جس قدر عظیم الشان تھے اسی مناسبت سے ان کے کتب خانے اعلیٰ تھے۔ اس زمانہ میں حکیم ابوالفتح گیلانی، شیخ عبد النبی، میر فتح اللہ شیرازی، نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید، قاضی نور اللہ شستری، خواجہ نظام الدین احمد، عبد الرحیم خانخاناں اور

---

[1] عہد اکبری سے شاہ عالم کے عہد تک کے امراء کا حال منشی کیول رام اگروال نے "تذکرۃ الامراء" میں لکھا ہے۔ "مآثر الامرا" (نواب شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) میں اکبر سے لے کر محمد شاہ کے آخر عہد تک کے مشہور امراء کا تذکرہ ہے۔ سلطنت مغلیہ کے ہندو امراء کے حالات "امرائے ہنود" (سعید احمد مارہروی) میں درج ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی کے فضل و کمال اور تصنیفی و تعلیمی خدمات کا شہرہ ہندوستان بھر میں گونج رہا تھا۔ ملک الشعراء علامہ فیضی کی انشا پردازی اور شاعری کے کمال کا ہر شخص معترف تھا۔ اس نے ایک سو ایک کتابیں لکھیں۔ قرآن شریف کی ایک تفسیر "موارد الکلام" اور دوسری "سواطع الالہام" (بے نقط) اس کی یادگار ہیں۔ فیضی کے بھائی ابوالفضل کی علمی قابلیت کی تصدیق اس کی تصانیف "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" کر رہی ہیں۔ ان کے والد شیخ مبارک ناگوری بھی بڑے اہل قلم تھے۔ انھوں نے قرآن شریف کی تفسیر چار جلدوں میں لکھی اور پانچسو ضخیم کتابیں نقل کیں۔ اس زمانہ میں مذہب، اخلاق، فلسفہ، تاریخ، سوانح، نجوم، طب، جغرافیہ اور افسانہ وغیرہ سب ہی پر کتابیں لکھی گئیں اور متعدد کتابیں اجتماعی طور پر بھی تالیف ہوئیں۔ "تاریخ الفی" کئی اہل قلم نے مل کر لکھی۔ اسی زمانہ میں ہندی کے دو نامور شاعر سورداس اور تلسی داس بھی تھے جن کے کلام میں کہیں کہیں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اکبری دور کا ایک ہندو شاعر مرزا منوہر توسنی ہے جسے سید عبداللہ[۵] نے ہندو قوم کا سب سے پہلا فارسی شاعر بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے خیالات اسلامی تخیل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

---

[۵] "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص ۳۰ (انجمن ترقی اردو۔ ہند۔ دہلی۔ ۱۹۴۲ء)

اکبری عہد تعلیمی کتب خانوں کے لئے بڑا سازگار تھا۔ تعلیم او
طریقۂ تعلیم میں اکبر کی ذاتی توجہ کی بدولت بے شمار مدرسے کھلے اور بے شمار
کتب خانے وجود میں آئے۔ مغل سلطنت کا کوئی شہر اور قریہ مدرسوں اور
کتب خانوں سے خالی نہ تھا۔ خود اکبر نے فتحپور سیکری میں ایک مدرسہ قائم
کیا تھا جو بے نظیر کہا جاتا ہے۔ دہلی میں اکبر کی رضاعی بہن ماہم بیگم کا مدرسہ
خیر المنازل بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس عہد میں صرف مدرسوں کی تعداد ہی
نہیں بڑھی بلکہ تعلیم کا معیار بھی بلند ہوا۔ حسب بیان علامہ ابوالفضل
یہ مضامین نصاب تعلیم میں شامل تھے۔ اخلاق، حساب، فلاحت، اقلیدس
ہندسہ، نجوم، رمل، علم الارض، سیاست مدن، طب، منطق، ریاضی،
طبعی، تاریخ، دیاکرن، ویدانت، پاتنجلی۔ چنانچہ درس و تدریس کی
آسانی کے لئے ان سب مضامین کی کتابوں کے کئی کئی نسخے مدرسوں
کے کتب خانوں میں رہتے جس کی وجہ سے یہ کتب خانے بھی مختلف علوم و
فنون کے خزانے بن گئے تھے۔

جہانگیر
۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء

جہانگیر کے عہد میں کتب خانوں کا سلسلہ اور وسیع
ہوگیا۔ اکبر کی طرح وہ بھی کتابیں جمع کرنے کا ذوق
اور مطالعہ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ باپ کے کتب خانہ کے علمی نوادر نے
اس کے مذاق شاعری اور اس کی تنقیدی نگاہ کو اتنا اجاگر کر دیا تھا
کہ وہ علم و سخن کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا۔ ایک تنقید نگار کی حیثیت
سے اس کی نظر اتنی صحیح اور معیاری تھی کہ بقول شبلی اس نے ایک

تزک میں جس شاعر کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ حرف آخر ہے
تزک[1] جہانگیری میں اس نے اپنے مشاغل و حالات اور ملکی واقعات
تاریخ وار بیان کئے ہیں۔ یہ اس کی انشا پردازی اور قوت تحریر
کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم
وفنون کی سرپرستی کرنے میں وہ اپنے باپ سے پیچھے نہیں رہا۔
اس نے کتب خانوں اور مدرسوں کے قیام کی طرف ذاتی توجہ دی
اس کے عہد میں بہت سے نئے مدرسے کھلے اور وہ قدیم مدرسے
جو ویران پڑے ہوئے تھے از سر نو آباد ہو گئے اور یہ قانون بنا دیا
گیا کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مر جائے تو اس کے
مال و متاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوائی جائیں۔ اس طرح
مدرسوں اور ان کے ساتھ کتب خانوں کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔

جہانگیر کو جو کتب خانہ وراثت میں ملا تھا اس کی امتیازی شان
کو نہ صرف اس نے قائم رکھا بلکہ اس میں قابل قدر اضافے کئے۔
علم و ادب، شعر و شاعری اور آرٹ کی کتابوں، تصویروں اور مرقعوں
کا بیش بہا سرمایہ اس میں جمع کیا جس کی تعداد ۶۰ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

---

[1] تزک جہانگیری کے علاوہ اقبال نامۂ جہانگیری (محمد شریف معتمد خاں)
... مآثر جہانگیری (مرزا کامگار حسینی) میں جہانگیر کے عہد کے
... اور واقعات درج ہیں۔

کتابوں کی فراہمی اور نگہداشت میں بھی جہانگیر اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا، اس نے مکتوب خاں کو کتب خانہ کا مہتمم مقرر کیا تھا۔

جس طرح جہانگیر کا کتب خانہ بیش قیمت نوادر سے پُر تھا اسی طرح اس کا دربار شہرۂ آفاق عالموں، شاعروں، خطاطوں اور مصوروں سے بھرا ہوا تھا جن کے دم سے کتب خانوں کی روز افزوں ترقی ہو رہی تھی۔ امراء میں مرزا غازی خاں کا دربار اہل علم کا مرکز تھا۔ شاعروں میں طالب آملی نے ملک الشعراء کا مرتبہ پایا۔ علماء و فضلاء میں مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی، میراں صدر جہاں پہانی ملا محمد جونپوری اور مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی بہت مشہور ہو ئے مگر اکبری اور جہانگیری دور کی بلند ترین ہستیاں دو تھیں، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ - ۱۶۲۴ء) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ - ۱۶۴۲ء)۔ ان بزرگوں نے علم و عمل میں ہم آہنگی پیدا کی اور کتب خانوں کی تحریک کو وسعت بخشی۔ حضرت مجدد کے فیض روحانی، اور دینی و درسی خدمات کا اندازہ آپ کے مکتوبات[۱] سے ہوتا ہے جو آج تک شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ یہ حضرت ہی کی زندگی میں اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ ان کے نسخے ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں کتب خانوں کی زینت بن گئے تھے۔

[۱] یہ مکتوبات امام ربانی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا ترجمہ اردو میں ، ،

شیخ عبدالحق نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ علم حدیث کو ہندوستان میں پھیلایا اور اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ مختلف موضوعات پر آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے جن میں لمعات (شرح مشکوٰۃ) اخبار الاخیار، جذب القلوب فی دیار المحبوب، مدارج النبوۃ، اور "مصنفین دہلی" بہت مشہور ہیں۔ "اخبار الاخیار" کو جہانگیر نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی۔ کتابوں کے متعلق جہانگیر کی رائے اجتہاد کا درجہ رکھتی تھی۔ میر عضد الدولہ کی "فرہنگ جہانگیری" پر اس نے جو رائے دی ہے اس سے بہتر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا۔ جہانگیر کی خدمت میں عضد الدولہ نے جب یہ کتاب پیش کی تو بہت پسند فرمائی۔ ایک ہاتھی انعام میں دیا اور کتاب کو بے مثل بتاتے ہوئے کہا کہ "قدما کے اشعار سے سند لانے کا جو اہتمام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کسی فارسی لغت میں نہیں ملتا۔"[1]

جہانگیر کے اس تبحر علمی میں مصوری کے ذوق نے بڑی دل کشی پیدا کر دی تھی۔ وہ مصوری کا عاشق تھا اور اس عشق نے شاہی کتب خانہ

---

[1] جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے "الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علما و قدما مستشہد آوردہ دریں فن کتاب بے مثل ایں نمی باشد، فیل خاصہ عنایت نمودم" (مقالات شبلی ۱۹۳۴ء) جلد ۴۔ ص ۱۱۳۔

کے حسن میں چار چاند لگا دئے تھے۔ مصور کتابوں، مرقعوں اور تصویروں سے بادشاہ کی محبت کا شہرہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گیا تھا چنانچہ ہر طرف سے کتابیں اور تصویریں آتی رہتی تھیں۔ عبدالرحیم خانخاناں نے جہانگیر کے حضور میں یوسف زلیخا کا ایک مرصع نسخہ نذر کیا۔ یہ وہی نسخہ تھا جسے خطاطوں کے بادشاہ میر علی نے ۱۵۲۳ء میں لکھا تھا اور جس کی قیمت ایک ہزار طلائی مہر قرار پائی تھی[1]۔ ایک عظیم مصور خلیل کا کھینچا ہوا امیر تیمور کے معرکۂ جنگ کا مرقع اصفہان سے جہانگیر کے پاس آیا تھا۔ مقالات شبلی میں ہے کہ[2] "اس مرقع میں ۲۴۰ تصویریں تھیں اور یہ سب ان شہزادوں اور امراء کی تھیں جو اس معرکہ میں شریک تھے ہر تصویر کے نیچے صاحب تصویر کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ مرقع شاہ اسمٰعیل صفوی کے کتب خانہ سے شاہ عباس کے ہاتھ آیا تھا۔ شاہ عباس کے داروغہ کتب خانہ نے اس کو چوری سے بیچ ڈالا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جہانگیر نے خان عالم کو جب ایران بھیجا تو اصفہان میں یہ مرقع بازار میں بک رہا تھا خان عالم نے خرید لیا۔ شاہ عباس کو خبر ہوئی تو خان عالم کو لکھ بھیجا کہ میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں بھیج دو خان عالم نے بہت ٹالا لیکن شاہ عباس کے اصرار سے مجبور ہو گیا

---

[1] یہ کتاب خدابخش لائبریری بانکی پور میں ہے۔ (ایک مشرقی کتب خانہ ص ۲۹)

[2] مقالات شبلی (۱۹۳۴ء) جلد ۴ ص ۹۸

ایک ترکی دیوان کا نسخہ جو سلاطینِ خراسان و ہرات کے کتب خانوں سے منتقل

ہوا آگرے کے کتبخانہ میں پہنچا اسکے سرورق پر جہانگیر کی تحریر

اور پاخر بھیج دیا۔ شاہ عباس کو چونکہ جہانگیر کی تصویر دوستی کا حال معلوم تھا
چندروز اپنے پاس رکھ کر خان عالم کے پاس واپس بھیج دیا۔"

جہانگیر کے مجموعہ تصاویر میں ایک تصویر تھی جس کو اس نے پانچ ہزار روپیہ میں خرید اتھا۔ اس تصویر میں ایک عورت غسل سے فارغ ہو کر بیٹھی ہے اور ایک خادمہ اس کے پاؤں کے تلووں سے میل صاف کر رہی ہے۔ جہانگیر نے اپنی پسندیدگی کی وجہ یہ بتائی کہ اس عورت کے چہرہ پر اس کیفیت کے پورے آثار ظاہر ہیں جو تلووں کو کھجاتے وقت محسوس ہوتی ہے۔

تصویر شناسی[1] میں بادشاہ کی اس مہارت نے فن مصوری کو عروج پر پہنچا دیا تھا اور اس کے دربار میں ایسے باکمال مصور جمع ہو گئے تھے جو یورپ کی بہترین تصویروں کی نقل نہایت کامیابی سے اتار سکتے تھے۔ انگلستان کا سفیر سر طامس رو جب ہندوستان آیا تو اس نے جہانگیر کو ایک

---

[1] جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "اب فن مصوری سے میرے لگاؤ اور شناخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی تصویر میرے سامنے لائی جائے خواہ وہ کسی متوفی مصور کی ہو یا زندہ کی، اور مجھے اس کا نام نہ بتایا جائے تو میں ایک لمحہ میں بتا دوں گا کہ یہ فلاں مصور کے موقلم سے ہے اور اگر کسی تصویر میں بہت سی شبیہیں شامل ہوں اور ہر شبیہ کا چہرہ الگ الگ مصوروں نے کھینچا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ کونسا چہرہ کس مصور نے کھینچا ہے اور اگر کسی دوسرے مصور نے صرف چشم و ابرو ہی بنائے ہوں تو میں بتا دوں گا کہ اس تصویر کا چہرہ کس کے قلم سے ہے اور چشم و ابرو کس نے بنائے ہیں۔"

نہایت عمدہ تصویر پیش کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی متعدد کاپیاں سرطامس کو دکھائی گئیں جو اس کی پیش کی ہوئی تصویر سے اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ وہ انھیں دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ جہانگیر کا ایک مصور منصور جسے نادر العصر کا خطاب دیا گیا تھا پرندوں اور پھولوں کی تصاویر بنانے میں بے نظیر تھا۔ ابوالحسن نے تزک کے لئے جہانگیر کے جلوس کا ایک مرقع تیار کیا تھا اور نادرالزماں کا خطاب پایا تھا۔ بشن داس جو شبیہہ سازی میں کمال رکھتا تھا شاہ عباس صفوی اور اس کے دربار کی تصویریں بنانے کے لئے ایران بھیجا گیا تھا اس طرح جو تصویریں اور مرقعے جہانگیر نے تیار کرائے وہ شاہی کتب خانے کی زینت کا سامان بن گئے۔

جہانگیر کا مصوری کے ساتھ کتابوں سے بھی محبت کرنا کتب خانوں کے لئے بڑا سود مند ہوا اسے کتابوں سے ایسا قلبی تعلق تھا کہ وہ سفر میں بھی اپنے کتب خانے کا ایک حصہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ گجرات پہنچا تو اس نے اپنے سفری کتب خانہ میں سے وہاں کے علماء اور مشائخ کو چند کتابیں عطا کیں اور ان پر گجرات پہنچنے اور کتابیں دینے کی تاریخ اپنے قلم سے تحریر کی تھی۔ ایسی ہی اور بہت سی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جن پر جہانگیر کی تحریریں موجود ہیں۔ کتب خانہ خدابخش بانکی پور میں ہمایوں کے بھائی شاہزادہ کامران کا دیوان ہے جس کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے :-

" اللہ اکبر دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار من است
بخط محمود بن اسحاق شہابی حررہٗ نورالدین محمد جہانگیر شاہ
سنہ ۲ جلوس موافق ۱۰۲۴ھ "

جہانگیر کو اپنے کتب خانہ سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ کتب خانہ کے کارکنوں کو کتابوں کی ترتیب و تنظیم کے متعلق بھی ہدایتیں دے دیا کرتا تھا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں ترکی دیوان کا ایک سرورق ہے جس پر جہانگیر کی مندرجہ ذیل[1] تحریر کے علاوہ اس کے قلم کا " خاصہ اول " بھی لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس اہم کتاب کو درجہ اول کی کتابوں میں رکھا جائے۔

اللہ اکبر
پنجم آذر سنہ داخل کتاب خانۂ
ایں نیاز مند درگاہ الٰہی شد حررہ
نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ
سنہ ۱۰۱۴ھ

---

[1] جہانگیر نے یہ ہی عبارت اسی قلم میں " ترجیعات عراقی " کے پہلے صفحہ پر بھی لکھی ہے۔ یہ قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے نہایت خوبصورت لکھا ہوا۔ اول سے آخر تک مطلا و مذہب ہے۔
(تذکرہ جواہر زواہر مرتبہ محمد ابرار حسین فاروقی صفحہ ۱۸)

شاہجہاں
۱۶۲۷ - ۱۶۵۸ء

کتب خانوں کے سلسلہ میں شاہجہاں اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلا۔ اگرچہ اس کی توجہ اور دلچسپیاں تعمیرات پر مرکوز رہیں تاہم اس کے عہد کی علمی فضا میں کتب خانوں کو فروغ ہوا۔ اس کے علمی شغف، ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضیوں اور اس کے شوق مطالعہ نے کتب خانوں کے قیام میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ شاہجہاں نے اپنے مذاق کے مطابق شاہی کتب خانے میں اضافے کئے۔ فن خوش نویسی سے خاص ذوق رکھنے کے باعث اس نے خوش خط کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا بقول ایک جرمن سیاح جو ۱۰۳۶ھ میں ہندوستان آیا تھا شاہی کتب خانہ میں چوبیس ہزار کتابیں نہایت اعلیٰ جلد کی تھیں۔ اس کتب خانہ کے عملہ میں بہت سے خوش نویس کام کرتے تھے جنھیں کبھی کبھی داروغہ کے عہدہ پر بھی سرفراز کر دیا جاتا تھا۔ اس خدمت پر عبدالرحمٰن شیدائی[۱] اور میر محمد صالح مشکیں رقم جیسے اعلیٰ خوش نویس یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے۔ لکھا ہے کہ میر محمد صالح[۲] کو "مناقب مرتضوی" لکھنے کے صلہ میں بادشاہ نے ایک ہاتھی اور پانچ ہزار روپیہ انعام میں دئے تھے۔

ظفر خاں احسن کا بیٹا مرزا محمد[۳] طاہر آشنا الملقب بہ عنایت خاں بھی شاہی کتب خانہ کا داروغہ رہا۔ اسی زمانہ میں اس نے عہد شاہجہانی کی

[۱-۲] بزم تیموریہ ص ۲۲۰ - [۳] مآثر الامراء ۔ ج ۲ - ص ۷۶۲

بعض تاریخوں کا خلاصہ مرتب کیا جو "ملخص" کے نام سے مشہور ہے۔

شاہجہاں کا شوق مطالعہ بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ حکمرانی کے مشاغل کے باوجود وہ روزانہ کچھ وقت کتابوں کی صحبت میں گذارتا تھا۔ بزم تیموریہ میں لکھا ہے کہ وہ جب تمام کاموں سے فارغ ہوکر رات کو سونے جاتا تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے تھے۔ شاہجہاں کے ذوق مطالعہ کا اندازہ ان عبارتوں سے بھی چلتا ہے جو اس نے شاہی کتب خانہ کی مختلف کتابوں پر لکھی تھیں۔ مثلاً "مجالس خمسہ" کا وہ نسخہ جس پر شاہجہاں کی تحریر ہے کتب خانہ خدابخش بانکی پور میں محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں بھی ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہجہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی میں بادۂ علم سے سرشار تھا۔ تاریخ خاندانِ تیموریہ (نسخہ خدابخش) پر بھی شاہجہاں کی تحریر موجود ہے۔ دیوان مرزا کامران (نسخہ خدابخش) پر جہانگیر کی تحریر کے علاوہ شاہجہاں کی بھی مندرجہ ذیل تحریر ہے:-

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَاب حررہ شاہجہاں بن جہانگیر شاہ"

علم و ادب کے علاوہ شاہجہاں کی ذہنی ذکاوتیں فن تعمیر میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اس کا ذوقِ شاعری اس کے عشق کی واردات کاغذ کے بجائے تاج محل کے گل بوٹوں میں اب تک نمایاں ہیں۔ شاہجہانی عہد کے فنِ تعمیر کا بے مثل نمونہ تاج محل اور صنعتی کارنامہ تخت طاؤس ہے۔ ان نادر

نمونوں کے ساتھ اس دور میں ایسے مدرسے بھی ملتے ہیں جو ایشیا میں مشہور تھے۔ سر سید نے آثار الصنادید میں ایک شاہی مدرسہ **دار البقاء** کا ذکر کیا ہے جو دہلی میں جامع مسجد کے جنوبی رُخ پہ تھا۔ دہلی کے علاوہ جونپور، احمد آباد اور لاہور تعلیم کے مشہور مراکز تھے جہاں ہرات اور بدخشاں تک سے طلبا تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

یہ مدرسے اور ارباب علم اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ شاہجہانی عہد میں کتب خانوں کی کثرت تھی۔ بادشاہ کی بے مثل فیاضیوں نے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کو دربار میں جمع کر لیا تھا لکھا ہے کہ ملک الشعراء ابو طالب کلیم کو شاہجہاں نے ایک قصیدے کے صلہ میں روپیہ کے برابر تلوا دیا تھا۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو دو مرتبہ سونے چاندی سے تلوایا تھا۔ "عمل صالح" کے مصنف محمد صالح کنبوہ کو بھی دو بار سونے میں تلوا کر انعام دیا تھا۔ ایران کے خطاط میر عماد الحسینی کی خطاطی کا نمونہ جب کوئی شاہجہاں کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ اس کو ایک صدی منصب عطا کر دیتا تھا۔ اسی طرح حاجی محمد جان قدسی، ظفر خاں احسن، مرزا صائب، محمد امین قزوینی[۱]، مرزا جلال الدین طباطبائی[۲]، عبدالحمید لاہوری[۳]،

[۱ تا ۳] ان مورخین نے یہ تاریخیں مرتب کیں۔ بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی شاہجہاں نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی۔ بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری۔ بادشاہ نامہ از محمد وارث۔

محمد وارث وغیرہ بھی شاہجہاں کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ شاہجہانی دربار کے ہندو فضلاء میں چندر بھان برہمن ممتاز درجہ رکھتا تھا اور اپنی لیاقت کی وجہ سے وقائع نویسی کے عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہوا تھا۔ یہ داراشکوہ کا بھی منشی رہا۔ اس نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں مثلاً "گلدستہ"، "تحفۃ الانوار"، "مجمع الفقراء" اور "منشآت برہمن" جو اس کے رقعات کا مجموعہ ہے۔ چندر بھان فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ اگرچہ اس وقت سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی مگر بعض شاعر اردو میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی عہد میں اردو کا لقب اردوئے معلیٰ ہوا تھا اور اس نئی زبان سے شاہجہاں کو اتنا انس ہو گیا تھا کہ اپنی قید کے زمانہ میں بھی اس نے جو شقّے داراشکوہ کو لکھے ان میں بعض اسی زبان میں ہیں۔

اس عہد کے کتب خانوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا کتب خانہ نہایت نادر کہا جا سکتا ہے۔ ملا موصوف کی نسبت آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ "اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے موجب افتخار رہیں یقیناً تمام درسی علوم میں ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا اور کمیت و کیفیت اور حسن قبول میں اس قدر علمی یادگاریں ان کی طرح کسی نے دنیا میں نہیں چھوڑیں"۔ ان تصنیفی اور درسی سرگرمیوں کے باعث ان کا وطن سیالکوٹ علم و ثقافت کا مرکز بن گیا تھا انھوں نے ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں وفات پائی۔ ان کی تصانیف نے نہ صرف ہندوستانی کتب خانوں کو وسعت بخشی بلکہ عراق و عجم کے کتب خانوں کی

ترقی کا بھی باعث بنیں۔ لکھا ہے کہ ملا موصوف کی تصانیف ہندوستان سے لے کر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عالمگیر
۱۶۵۹ - ۱۷۰۷ء

عالمگیر کے عہد میں بھی کتب خانوں کی کثرت رہی مگر ان کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ اس بادشاہ کی فطرت صالحہ بچپن ہی سے علماء اور فضلاء کی صحبت میں رہنے کی شائق تھی اور اُسی زمانہ سے اس کو کتابیں جمع کرنے کا ذوق ہو گیا تھا۔ بقول جادو ناتھ سرکار "اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کے آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا" ظاہر ہے کہ کتابوں کی یہ محبت کتب خانوں کی ترقی کا سبب بنی اس سلسلہ میں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ قرونِ وسطیٰ میں بادشاہ کی ذات گرامی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اسی لئے اس عہد کے کتب خانوں میں بھی بادشاہ کے ذاتی ذوق وشوق کا عکس نظر آتا ہے۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں مصوری سے لگاؤ رکھتے تھے چنانچہ ان کے کتب خانے مصور کتابوں اور اعلیٰ تصاویر سے پُر تھے۔ اورنگزیب کو مصوری سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ احکام قرآن وحدیث کی ترویج واحیاء کی طرف زیادہ مائل تھا اسی لئے شاہی کتب خانہ اسلامی علوم وادب کا ایک مخزن بن گیا تھا جس کے لئے اطراف عالم سے کتابیں حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد معاصر تاریخوں میں نہیں ملتی لیکن اس کی وسعت کا اندازہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے ہو سکتا ہے۔

فتاوی عالمگیری اورنگ زیب کے عہد کا ایک فقہی کارنامہ ہے جس کی تدوین کے لئے تقریباً پچاس علماء و فضلاء کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا تھا اور انھیں جن کتابوں کی ضرورت ہوتی وہ شاہی کتب خانہ سے مل جایا کرتی تھیں کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب آٹھ سال میں مکمل ہوئی اور دو لاکھ روپیہ اس پہ لاگت آئی۔ اس کی تالیف سے عالمگیر کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ فتاوی کا ہر صفحہ خود پڑھوا کر سنتا اور حوالوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ کرتا۔ اس سلسلہ میں حدیث و فقہ کی ان گنت کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا جو سب کی سب شاہی کتب خانہ میں موجود تھیں۔

عالمگیر کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ جنگ و جدل کے ہنگاموں میں بھی اس کا کتابی ذوق قائم رہتا تھا۔ اس کی حکومت کے اڑتالیس سالہ دور میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ اس نے فتح کی خوشی میں سرشار ہو کر کتابوں کو برباد کیا ہو بلکہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مہمات کے دوران میں کتابوں کا خاص خیال رکھتا تھا اور مال غنیمت میں جو کتابیں ملتیں انھیں شاہی کتب خانہ میں منتقل کرا دیتا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں "مثنوی گوئے چوگاں" کا ایک نسخہ ہے جو عالمگیر نے فتح گولکنڈہ[1] کے مال غنیمت میں حاصل کیا تھا۔

---

[1] فتح گولکنڈہ کے حالات "وقائع گولکنڈہ" از نعمت خاں عالی میں درج ہیں۔
عالمگیری عہد کے متعلق یہ کتابیں بھی ملاحظہ کیجئے۔ عالمگیر نامہ (مرزا محمد کاظم)، واقعات عالمگیری (میر محمد عسکری عاقل خاں رازی)، مآثر عالمگیری (محمد ساقی مستعد خاں)

ملا عارفی کی یہ تصنیف خطاطی کے استاد میر علی نے ایسی نیک ساعت میں بمقام ہرات لکھی تھی کہ وقت تحریر سے لے کر آج تک چار سو پچپن برس کی طویل مدت میں اسے گردش زمانہ سے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ البتہ اس کی قیمت میں تغیرات ہوتے رہے۔ بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی[۱] عالمگیری کتب خانہ میں اس کی قیمت کا اندراج دو ہزار روپیہ ہے۔ عالمگیر کی وفات کے کوئی پچھتر سال بعد یہ دو سو دس روپیہ میں فروخت ہوئی۔ اس کے بعد ڈھائی سو روپے میں بکی اور مولانا موصوف نے اسے ایک سو ستر روپیہ میں خریدا۔ یہ کتاب ہندوستان میں دکن کے کتب خانوں میں رہی پھر عالمگیری کتب خانہ میں داخل ہوئی اس کے بعد ادھر ادھر ہوتی ہوئی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں پہنچی اور اب کتب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ حبیب گنج میں ہے۔ اس کتاب پر متعدد تحریریں اور مہریں موجود ہیں ایک مدور مہر پر " قابل خاں خانہ زاد بادشاہ عالمگیر ۱۰۹۷ھ "، منقوش[۲] ہے۔

یہ شیخ ابو الولی قابل خاں شاہی کتب خانہ کا ناظم تھا۔ سید علی خاں جواہر رقم بھی کچھ عرصہ تک مہتمم کتب خانہ رہا تھا۔ اس خوشنویس کو میر عماد اور عبد الرشید دیلمی کے طرز پر لکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

---

[۱] مقالات شروانی ص ۴۰۷۔

[۲] مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱۔ ص ۱۳۵ (ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اس زمانہ کے خوش نویسوں میں عبدالباقی حداد خط نسخ کا بڑا ماہر تھا لکھا ہے کہ
اس نے تیس ورق میں پورے قرآن مجید کی کتابت کرکے اسے شاہجہاں
کی خدمت میں پیش کیا اور یاقوت رقم کا خطاب پایا۔ اورنگ زیب نے
فن خطاطی عبدالباقی اور سید علی خاں جواہر رقم سے ہی سیکھا تھا۔
ان باکمال استادوں نے عالمگیر کو نسخ اور نستعلیق لکھنے میں ماہر بنادیا
تھا۔ اس کے علاوہ انشا پردازی میں بھی وہ کمال رکھتا تھا۔ اس نے
اپنے شہزادوں وغیرہ کو رقعات ایسے دل کش ادبی انداز میں لکھے ہیں کہ
وہ فارسی نثر کے شہ پارے بن گئے ہیں خطوط کو سوانح نگاری کی جان کہا جاتا ہے
مگر یہ رقعات[1] عالمگیر کی قادر الکلامی، ذہانت و ذکاوت اور سیاسی بصیرت
ہی کے آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ وہ اس دور کی تاریخی تصویریں بھی ہیں۔
رقعات عالمگیری اور فتاوی عالمگیری کے سوا اس عہد کی یادگار اور
بھی کتابیں ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ عالمگیری دور کے کتب خانوں میں اسلامی علوم
اور ہندوؤں کے علوم دونوں کی کتابیں جمع تھیں۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کے
فن بلاغت و عروض، ہیئت و نجوم اور رسوم و عقائد پر "تحفۃ الہند"[2] "نظام النجم" اور

---

[1] رقعات عالمگیری پر اردو میں مقدمہ اور تفصیلی تبصرہ سید نجیب اشرف ندوی نے اپنی کتاب "مقدمات رقعات عالمگیر" میں کیا ہے جو دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

[2] تحفۃ الہند (مصنفہ مرزا خان بن فخر الدین محمد) پر شبلی کا مضمون مقالات شبلی جلد دوم (ص ۹۲) میں ملاحظہ کیجئے۔

"مت اچھرا" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ عالمگیری دربار کے ہندو فضلا اور امن کھتری، بھیم سنگھ کایستھ (مصنف تاریخ دلکشا) ایشرداس (مصنف فتوحات عالمگیری) سجان رائے کھتری (مصنف خلاصۃ التواریخ) اور لعل بہاری (مصنف مت (چھرا) صاف صاف بتا رہے ہیں کہ عالمگیر اپنے آبا کی طرح ارباب علم کی سرپرستی کرنے میں مذہب و ملت کا کوئی لحاظ نہ کرتا تھا اور مسلم علما و فضلا میر محمد قنوجی، شیخ نظام برہان پوری، قاضی محب اللہ بہاری، نعمت خان عالی، شیخ وجیہ الدین گوپاموی اور شیخ احمد ملا جیون وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہندو فضلا کو بھی انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔

عالمگیری عہد میں بھی مدرسے اور کتب خانے بکثرت ملتے ہیں اورنگزیب نے جبری تعلیم جاری کی تھی جس کی وجہ سے ہر شہر اور قصبہ میں سرکاری و غیر سرکاری مدرسے قائم ہو گئے تھے۔ بعض علاقوں میں تو مدرسوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ بقول ایک یوربین سیاح کپتان ہملٹن سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ میں چار سو مدرسے[۱] تھے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہاں چار سو تعلیمی کتب خانے تھے۔ عالمگیری عہد میں احمد آباد کا ایک مدرسہ نہایت عظیم الشان تھا اس کی عمارت محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار میں بنوائی تھی اور اس کے اخراجات کے لئے عالمگیر نے دو گاؤں وقف کر دئے تھے۔ دہلی میں شاہ ولی اللہ کا مشہور و معروف مدرسہ ان کے

---

[۱] ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ از مولوی ابوالحسنات ندوی ص ۴۔

والد شاہ عبدالرحیم نے اسی زمانہ میں قائم کیا تھا۔ لکھنؤ میں دارالعلوم
فرنگی محل[۱] عالمگیر ہی کی علم پروری کی یادگار ہے۔ عہد عالمگیری کے
"دو پروانے"[۲] دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں دارالعلوم
کے قیام سے کئی سو برس پہلے درس و تدریس کا سلسلہ عہد مغلیہ میں شروع
ہوگیا تھا۔ عالمگیر نے یہاں کی ایک خانقاہ کے اخراجات کے لئے کچھ
جاگیریں عطا کی تھیں اس خانقاہ سے متعلق ایک کتب خانہ بھی تھا
جس میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ خانقاہ کی آتش زدگی
میں یہ ذخیرہ بھی برباد ہوگیا۔

---

۱ دارالعلوم فرنگی محل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی کے
ایک عالم ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ کا وہ محلہ
دے دیا جو ایک فرانسیسی سوداگر کے قبضہ میں تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام
"فرنگی محل" پڑ گیا۔ ملا قطب الدین سہالوی کی اولاد میں ملا نظام الدین
(متوفی ۱۷۴۸ء) وہ نامور عالم تھے جن کے نام سے عربی مدارس کا
نصاب درس نظامیہ منسوب ہے۔ ملا نظام الدین کے صاحبزادوں
میں ملا عبدالعلی بحرالعلوم بڑے نامور عالم ہوئے۔ فرنگی محل کے
علماء میں مولانا عبدالحی (متوفی ۱۸۸۶ء) بھی بڑے مشہور و معروف
عالم گذرے ہیں۔

۲ ملاحظہ ہو رسالہ برہان دہلی۔ اگست ۱۹۴۵ء

اس عہد کے تعلیمی مراکز میں سیالکوٹ کو خاص امتیاز حاصل تھا جہاں ملا عبدالحکیم کی مسند درس پر ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ متمکن تھے۔ اس مدرسہ کی شاہجہاں کے وقت سے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، اور طالبانِ علم کا یہاں ہجوم رہتا تھا۔ ان علمی برکات کی روشنی میں اس مدرسہ کے کتب خانہ کی ندرت کا قیاس بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سیالکوٹ کاغذ سازی کے لئے بھی مشہور تھا۔ یہاں جو کاغذ بنتا تھا ان میں مان سنگھی اور ریشمی کاغذ نہایت عمدہ اور پائدار تھا۔ لکھا ہے کہ سیالکوٹ کے نواح میں تین گاؤں کاغذ سازوں سے آباد تھے یہاں سے کاغذ ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجا جاتا تھا اور شہنشاہانِ دہلی کے دفاتر میں زیادہ تر یہی کاغذ استعمال کیا جاتا تھا[۱]۔ کاغذ سازی کی صنعت کی بدولت ہندوستانی کتب خانوں نے جو وسعتیں حاصل کی ہونگی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

بہادر شاہ اوّل سے بہادر شاہ ظفر تک
۱۷۰۷ء — ۱۸۵۷ء

عالمگیر کے انتقال کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوا تو شاہانِ مغلیہ کے کتب خانوں میں تاریکی پھیلنے لگی۔

عالمگیر کا لڑکا بہادر شاہ اول اپنے باپ کی طرح عظیم بادشاہ نہ بن سکا۔ اگرچہ علم حدیث اور دوسرے علوم میں اس کا پایہ نہایت بلند تھا اور اپنے عہد کے فاضلین نعمت خان عالی، مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹلی

---

[۱] مسلم ثقافت ہندوستان میں از عبدالمجید سالک ص ۲۲۶ (لاہور ۱۹۵۷ء)

اور بندرابن (مصنف لب التواریخ) کی سرپرستی اور قدر دانی کرنے میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس کے جانشینوں میں گو محمد شاہ، شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا درجہ اردو شاعری اور ادب میں بہت اونچا ہے لیکن عالمگیر کے بعد کوئی ایسا بادشاہ نظر نہیں آتا جو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے وسیع نظام کو سنبھالتا اور اس کو قائم رکھ سکتا۔ چنانچہ سلطنت میں زوال آنا شروع ہو گیا اور اس دور میں کتب خانوں کی بھی وہ حالت نہ رہی جو اکبر سے عالمگیر کے عہد تک تھی۔

البتہ محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) میں ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے جن سے کتب خانوں کی تحریک کو کچھ تقویت ملی اس زمانہ میں اردو زبان کی مقبولیت اور رواج بڑھ جانے اور علم ہیئت کے ترقی پانے سے علمی فضاؤں میں رونق و بہار آ گئی تھی ۱۷۲۰ء میں ولی اورنگ آبادی اپنا دیوان لے کر دکن سے دہلی آئے جو اتنا مقبول ہوا کہ اس کے اشعار محفلوں اور بازاروں میں گائے جانے لگے اور اردو شاعری کے چرچے دہلی میں عام ہو گئے۔ محمد شاہ نے بھی اردو میں شاعری کی اور دو کتابیں "بارہ ماسہ" اور "بکٹ کہانی" لکھیں اسی عہد میں اردو نثر کی تصنیف و تالیف کی باقاعدہ ابتدا شمالی ہندوستان میں ہوئی۔ فضلی نے ۱۷۳۲ء میں "دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی)

سے خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کتاب دنیا سے فنا ہو گئی کیونکہ زمانہ حال کا کوئی تذکرہ نویس یا محقق اس کے دیکھنے کا مدعی نہ تھا اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (ریڈر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ۱۹۵۴ء میں ٹوبنگن (جرمنی) کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ اس کتاب کا دنیا میں یہ واحد نسخہ ہے۔

لکھی جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ ہے "دہ مجلس" اردو نثر کی وہ قدیم ترین کتاب ہے جو شمالی ہند میں لکھی گئی یہاں محمد شاہ کے عہد میں بڑے بڑے ارباب علم وفن جمع ہو گئے تھے۔ ایک مصور گوردھن تھا جو بقول انندرام مخلص (مصنف مراۃ اصطلاحات) نرگس کی ایک پتی پر پورے ایک شہر کی تصویر کھینچتا تھا[۱]۔ شاہی دربار کے متوسلین میں لال رام نے ایک کتاب "تحفۃ الہند" لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ محمد شاہ کے ایک محبوب ندیم (امیر خاں نواب عمدۃ الملک) نے "عمدۃ الملکی انجمن" بنائی جس کے متعلق لکھا ہے[۲] کہ "اس انجمن کے جلسوں میں اردو زبان کے مسائل پر بحث کی جاتی تھی اور چیزوں کے اردو نام رکھے جاتے تھے۔ لفظوں اور محاوروں کی صحت وسند پر رد وقدح ہوتی تھی۔ اور بڑی چھان بین کے بعد تحقیق شدہ الفاظ اور محاورے انجمن کے دفتر میں قلمبند کر لئے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کی نقلیں جا بجا ہند کے امراء و رؤساء کے پاس بھیج دی جاتی تھیں جو ان کی تقلید اور نشر واشاعت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے" محمد شاہی دور میں علم ہیئت اور نجوم کی جو ترقیاں ہوئیں اُن میں راجہ جے سنگھ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر رہا

---

[۱] ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۳۶ -

[۲] صحیفۂ تاریخ اردو مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی ص ۳۳ (گیا پرشاد اینڈ سنز آگرہ - ۱۹۴۶ء)

اور پھر جے پور کا راجہ ہوا۔ علم ہیئت سے محمد شاہ بھی خاص ذوق رکھتا تھا اسی کے حکم سے دہلی میں رصد خانہ تعمیر ہوا جس کا مہتمم مرزا خیر اللہ مہندس تھا۔ دہلی کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں رصد خانے بنے اور علم ہیئت کی عربی اور فارسی کتابوں کے ہندی میں ترجمے ہوئے۔ اس وقت علمائے ہیئت نے اس موضوع پر جو معلومات وتحقیقات حاصل کیں ان کی یادگار زیچ محمد شاہی ہے۔ کیا یہ سرگرمیاں اس بات کو ثابت نہیں کرتیں کہ عہد محمد شاہی میں کتب خانوں کی رونق بہت بڑھ گئی تھی خصوصاً "عمدۃ الملکی انجمن اور رصد خانوں" کے کتب خانے شعر ادب اور علم ہیئت و نجوم وغیرہ کی کتابوں سے معمور تھے۔

محمد شاہ کی وفات کے گیارہ برس بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت سے تو بالکل ناکام رہا مگر شاعری کی دنیا میں بڑا نام پایا۔ شاہ عالم فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ آفتاب تخلص کرتا تھا۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد "بڑا مشاق شاعر تھا جس کے چار دیوان اُردو میں موجود ہیں" بابر کا آخری جانشین بہادر شاہ ظفر اردو زبان میں اس پایہ کا شاعر ہوا ہے کہ اہل علم اسے آج تک اقلیم سخن کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ خود کہتا ہے :-

طرز سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے
اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

اگر زمانہ ساز گار ہوتا تو ان بادشاہوں کا علمی ذوق کتب خانوں کی

ترقی میں بڑی معاونت کرتا مگر اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہی غنیمت نظر آتا ہے کہ شاہی کتب خانہ کی بہت سی کتابیں تباہی سے بچ گئیں حالانکہ اسے نادر شاہ کے حملہ اور مرہٹوں وغیرہ کے یلغار کے باعث بڑے صدمے اٹھانے پڑے تھے۔ اس طوائف الملوکی کے دور میں یہ بادشاہ شاہی کتب خانہ کی دل وجان سے حفاظت کرتے رہے اسی وجہ سے مغلوں کے آخری ایام تک اس میں اچھی اچھی کتابیں باقی رہیں۔ مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبد العزیز کو جب "تفسیر فتح العزیز" لکھتے وقت امام رازی کی "تفسیر کبیر" کی ضرورت پڑی اور کہیں دستیاب نہ ہوئی تو بمشکل قلعہ معلٰی کے شاہی کتب خانہ سے چند دن کے لئے عاریۃً ملی۔ بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص اور وزیر حکیم احسن اللہ خاں دہلوی کے کتب خانہ کی ایک نادر کتاب "رسالہائے بو علی سینا" نواب صاحب لوہارو کے پاس ہے اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس قیامت خیز دور میں شاہی کتب خانہ کے علاوہ امراء کے نجی کتب خانے بھی موجود تھے۔

داراشکوہ کا کتب خانہ

مغل بادشاہوں کی علم پرور صحبت نے مغل شاہزادوں میں علمی مذاق اور کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے اکثر نے شعر و سخن کی محفلیں سجائیں اور کتابوں کے ذخیرے جمع کئے مگر یہاں صرف داراشکوہ (متوفی ۱۶۵۹ء) کا ذکر کیا جا رہا ہے جو شاعر، مصنف اور خطاط کی حیثیت سے مغل شہزادوں کا گل سرسبد کہا جاتا ہے۔ شاہجہاں کا یہ بدنصیب لڑکا تخت و تاج کا مالک تو نہ بن سکا مگر علمی قلمرو میں وہ بادشاہی کر گیا۔ دارا کا کتب خانہ بھی بہت نفیس تھا جس کے آثار آج تک دہلی کے کشمیری دروازہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے لدھیانہ (پنجاب) میں درگاہ شیخ چلّی کے پاس ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو مدرسہ شیخ چلّی کے نام سے مشہور تھا۔

داراشکوہ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں "سکینۃ الاولیا" حسنات العارفین اور مجمع البحرین مشہور ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحق (کلکتہ یونیورسٹی) نے مجمع البحرین کو مرتب کر کے اس کے دیباچہ میں دارا کی خطاطی کے بہت سے نمونوں کا ذکر کر دیا ہے۔

زیب النسار کا کتب خانہ

مغل خاندان میں شاید ہی کوئی ایسی شہزادی ہو جو علم و ادب سے لگاؤ اور کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ رکھتی ہو۔ شہزادیوں میں گلبدن بیگم، سلیمہ سلطان بیگم، نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آرا اور زیب النسار کے نام علمی حیثیت سے بہت نمایاں ہیں۔ گلبدن بیگم کی یادگار "ہمایوں نامہ" اور جہاں آرا کی یادگار "مونس الارواح" ہے جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء کے حالات درج ہیں۔ یہ شہزادیاں اپنے علمی مذاق کی تکمیل کے لئے ذاتی کتب خانے بھی رکھتی تھیں۔ ان میں شہزادی سلیمہ سلطان بیگم اور زیب النسار کے کتب خانوں کی مورخین نے تعریف کی ہے۔ مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہے کہ "زیب النسار کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا" اس میں بیشتر کتابیں مذہب اور اخلاق کے متعلق تھیں۔ کتب خانہ کا منتظم ملا شفیع الدین تھا۔

مغل شہزادیوں میں زیب النسار (متوفی ۱۷۰۲ء) کا مرتبہ علم و فضل میں بہت بلند تھا وہ نہایت عمدہ شاعرہ تھی مخفی تخلص کرتی تھی۔ خطاطی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔ کتابیں جمع کرنے اور تصنیف و تالیف سے خاص شغف رکھتی تھی۔ چنانچہ ان مشاغل ہی نے اس کے کتب خانہ کو نادر الوجود بنا دیا تھا اس شہزادی کے دربار کی نسبت کہا جاتا ہے

ہر وہ ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھا جہاں ہر فن کے علماء و فضلاء ہمیشہ
تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ ان علمی کاموں کے سلسلہ میں جن
کتابوں کی ضرورت ہوتی وہ شہزادی کے کتب خانہ سے بآسانی مل جاتی
تھیں۔ اس کتب خانہ کے دروازے شائقین علم کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ

مغل عہد کے علماء اور امراء کی کثرت بتا رہی ہے کہ اس زمانہ میں
کتب خانوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی لیکن افسوس کہ ان
سب علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق میں جگہ نہ مل سکی البتہ بیرم خاں
کے لڑکے عبدالرحیم خانخاناں (متوفی ۱۶۲۷ء) کے کتب خانے کا
مورخین نے نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس کی تعریف بھی کی ہے۔
اکبری دربار کا یہ رتن عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کا عالم تھا اس
نے تزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور بھاشا میں
نہایت اعلیٰ پایہ کی شاعری کی وہ جس طرح علمی قابلیت، سخن سنجی،
علماء نوازی اور فیاضی میں بے مثل تھا اسی طرح اس کا کتب خانہ
بھی اس زمانہ میں بے نظیر تھا اسے جو اہمیت اور خصوصیت حاصل
تھی وہ علامہ شبلی نے یوں بیان کی ہے[1]:-

---

[1] مقالات شبلی (۱۹۳۴ء) جلد چہارم (تنقیدی) ص ۷۲

وہ یہ کتب خانہ اس درجہ کا تھا اور اس قدر علمی ذخیرے اس میں مہیا کئے گئے تھے کہ بجائے خود ایک اکاڈیمی یا دار الحکمت کا کام دیتا تھا۔ عرفی۔ نظیری۔ ظہوری۔ شکیبی، غرض اکثر شعرائے اکبری نے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کتب خانہ میں داخل کئے تھے۔ دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی کتب خانہ کے ترقی یافتہ ہیں۔ اکثر شعراء، خوش نویس، صنّاع، جن کو خانخاناں تربیت دینا چاہتا تھا کتب خانے کے کام پر مقرر ہوتے تھے اور ترقی کرتے کرتے نادر روزگار ہو جاتے تھے۔"

عبدالرحیم خانخاناں نے اپنے کتب خانہ کی دیکھ بھال اور انتظام کے لئے بڑے بڑے اصحاب علم و فن مقرر کئے تھے۔ ہندی کے بے نظیر شاعر شیخ عبدالسلام کتب خانہ کے دارو غہ رہے۔ شجاع جو خط نسخ میں کمال رکھتا تھا کتب خانہ کا افسر مقرر ہوا۔ ان کے علاوہ دوسرے باکمال خوشنویس، مصور اور جلد ساز مثلاً ملا عبدالرحیم عنبریں قلم، مصور محمد امین خراسانی اور ملا محمد حسین وغیرہ کتب خانہ کے عملہ میں شامل تھے۔ ملا محمد حسین کو جلد سازی اور عکاسی کے فن میں کمال حاصل تھا پینتیس برس کتب خانے میں کام کیا۔ لکھا ہے کہ مصنف[1] مآثر رحیمی[2] کے زمانے میں کتب خانہ کا

---

[1] عبدالباقی نہاوندی۔

[2] اس کتاب میں خانخاناں کی زندگی کے مفصل حالات درج ہیں۔

تمام کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھا۔

خانخاناں کے کتب خانے کی تفصیلات اس اعتبار سے بھی اہم اور جاذب توجہ ہیں کہ انھیں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی کتب خانے ترقی کی کتنی اونچی منزل پر پہنچ گئے تھے اور اس ملک میں کتابوں کا استعمال عام کرنے کا رجحان کتنے وسیع پیمانے پر پھیل گیا تھا اس زمانے میں بغداد اور قرطبہ کے کتب خانے تو قصۂ پارینہ بن چکے تھے اور یورپ کے کتب خانے ابھی ترقی کی ابتدائی منزل میں تھے لیکن ہندوستان میں کتب خانے صرف کتابوں کے گھر نہ تھے بلکہ علم کے ایسے فیض رساں اور روح افزا سرچشمے تھے جو علم و ثقافت کے میدانوں کی آبیاری کر رہے تھے۔

دکنی سلطنتیں اور کتب خانے

سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے جہاں کہیں اپنی آزاد سلطنتیں قائم کیں وہاں بھی کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا اور علم وفن نے فروغ پایا۔ چودھویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے جو چند صوبے خود مختار بن بیٹھے تھے ان میں پہلے صوبہ دکن کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں بہمنی اور دوسری سلطنتیں ۳۴۰ برس تک علم وادب کی خدمت اور سرپرستی کرتی رہیں اس طویل مدت میں علم وفن کی ترویج واشاعت جن ذرائع سے کی گئی ان میں کتب خانوں کو اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ ان کا ذکر دکن کی پہلی خود مختار سلطنت بہمنی میں ہی ملتا ہے۔

بہمنی سلطنت

یہ سلطنت ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں قائم ہوئی اور گلبرگہ اس کا پایہ تخت قرار پایا، اس کے بانی علاء الدین حسن بہمن شاہ کا کتب خانہ اتنی اعلیٰ کتابوں سے پُر تھا کہ عہد تغلق کے ایک مورخ عصامی نے فتوح السلاطین لکھتے وقت اس سے استفادہ[1] کیا تھا اس کتب خانہ کو بہمن شاہ کے جانشین[2] ترقی دیتے رہے

---

[1] آب کوثر شیخ محمد اکرام ص ۴۹۰

[2] سلاطین بہمنی کا حال "برہان المآثر" (علی بن عزیز اللہ طباطبائی) میں ملاحظہ ہو۔

کیونکہ ان میں سے اکثر ذی علم اور کتابوں کے شائق تھے۔ ان کے عہد میں دکنی اردو خوب پھولی پھلی اور اس میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز ہوا اس سلسلہ میں پہلا نام شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء) کا آتا ہے جو عہد تغلق میں اپنے وطن دہلی سے نکل کر دولت آباد آگئے تھے انھوں نے مذہبی احکام و مسائل کے متعلق چند رسالے لکھے جن میں سے تین رسائل کا مجموعہ مدراس کے کالج سینٹ جارج کے کتب خانے میں بتایا جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز دہلی سے گلبرگہ آئے اور ۱۴۲۲ء میں وہیں وفات پائی۔ آپ سے احمد شاہ بہمنی کو بڑی عقیدت تھی۔ اس نے گلبرگہ کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ آپ کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ ہمارے خیال میں خواجہ گیسو دراز کا کتب خانہ دکنی کتب خانوں میں نہایت ممتاز ہوگا۔ آپ عربی و فارسی کے عالم تھے اور علم حدیث اور تصوف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ آپ نے دکنی اردو میں تین رسالے (ہدایت نامہ، سہ بارہ اور معراج العاشقین) لکھے ان میں "معراج العاشقین" اردو نثر کی سب سے قدیم کتاب ہے جو شائع ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ خواجہ گیسو دراز کے پوتے سید عبداللہ حسینی نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالہ "نشاۃ العشق" کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا اور شرح لکھی جس کا ایک نہایت نفیس نسخہ سلطان ٹیپو کے کتب خانہ میں موجود تھا۔

بہمنی عہد میں گلبرگہ، بیدر اور دولت آباد علم و ثقافت کے بہت بڑے

مراکز تھے۔ ان شہروں میں دیگر کتب خانوں کے علاوہ مدارس یتامیٰ کے کتب خانے بھی تھے۔ یہ مدرسے محمود شاہ بہمنی (متوفی ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء) نے یتیموں کے لیئے قائم کیئے تھے جو نہایت زبردست عالم تھا اور تبحر علمی و دانشمندی کی وجہ سے ارسطو کہلاتا تھا۔ بہمنی عہد میں جو کتابیں بیدر میں لکھی گئیں ان میں ایک کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" حبیب گنج کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کو محمود شاہ بہمنی (متوفی ۹۲۴ھ/ ۱۵۱۸ء) کی خدمت میں نذر کیا گیا تھا[۱]۔

خاندان بہمنی میں فیروز شاہ بہمنی اور محمد شاہ بہمنی بھی نہایت ذی علم اور معارف پرور بادشاہ ہوئے ہیں۔ فیروز شاہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہر چوتھے روز کاروبار مملکت شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کے سولہ صفحے نقل کیا کرتا تھا۔ ایسے علم دوست بادشاہوں کے عہد میں کتب خانوں نے جو وسعتیں حاصل کیں اس کے ثبوت میں کتب خانہ محمود گاوان کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب محمد شاہ کے وزیر محمود گاوان کے کتب خانے میں پینتیس ہزار کتابیں تھیں تو پھر خود بادشاہ کے کتب خانہ میں اس سے کہیں زیادہ کتابیں ہونگی۔

خواجہ جہاں المعروف بہ محمود گاوان کا شمار چوٹی کے عالموں میں ہوتا ہے نظم و نثر لکھنے میں اسے بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اس کے مکتوبات کا مجموعہ "ریاض الانشاء" کا ایک قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے[۲] جو

---

[۱] مقالات شیروانی ص ۹۰ ۔ [۲] تذکرہ جواہر زواہر ص ۱۶۵

محمود گاوان کی شہادت کے ستر سال بعد لکھا گیا تھا۔ اس علم دوست وزیر کی
یادگار کتب خانہ مدرسہ بیدر بھی ہے جس میں تین ہزار کتابیں تھیں شہر
بیدر احمد شاہ بہمنی نے بسایا اور اپنا پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کر دیا تھا جہاں
محمود گاوان نے ایک نہایت عالی شان مدرسہ قائم کیا اور اساتذہ و طلباء کے لئے
مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی کھولا تھا۔ یہ مدرسہ اس عہد کا ایک بے نظیر مدرسہ تھا
مولوی ابو الحسنات کا بیان ہے کہ "تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ عظیم الشان
اور وسیع سلسلہ عمارت درس گاہ کے لئے کبھی اور کسی دور میں نہیں بنا۔" لیکن
افسوس کہ اس علم دوست وزیر کو بادشاہ نے ۱۴۸۱ء میں قتل کرا دیا۔
اس کے ۴۵ سال بعد بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد پانچ نئی
خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں جن میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے
عادل شاہی سلاطین نے نہایت شاندار علمی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

قطب شاہی سلطنت

اس سلطنت کے بادشاہ علم و ادب کی
سرپرستی کے لئے مشہور ہیں ان کے عہد
میں بہمنی دور سے بہتر کتابیں تصنیف ہوئیں اور نہایت اعلیٰ کتب خانے
قائم ہوئے۔ قطب شاہی سلاطین[۱] میں محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور

---

[۱] قطب شاہی سلاطین کے حالات۔ ان کتابوں میں بھی درج ہیں۔ "تاریخ سلطان محمد قطب شاہ" (ملا عرب شیرازی) "حدیقۃ السلاطین" (ملا نظام الدین احمد شیرازی) "تاریخ ظفرہ" (لالہ گردھاری لال احقر)

عبداللہ قطب شاہ اپنے مذاق کے مطابق شعرو ادب کی نفیس کتابیں شاہی کتب خانہ میں جمع کرتے رہے۔ یہ تینوں بادشاہ شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ خصوصاً محمد قلی قطب شاہ بڑے پایہ کا شاعر اور بہت اچھا خوشنویس تھا۔ اس کی کلیات پچاس ہزار فارسی اور دکنی اشعار پر مشتمل ہے جس میں سارے اصنافِ سخن مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزل اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی "کلیات" اور ملا وجہی کی "سب رس"[1] نظم و نثر کی یہ دو کتابیں قطب شاہی دور کی شاہکار کہی جاتی ہیں۔ اس عہد کے شاعروں میں ابن نشاطی، غواصی، جنیدی اور تحسین الدین بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

قطب شاہی سلطنت میں تعلیمی کتب خانے بہت تھے۔ ایک کتب خانہ مدرسہ چہار مینار حیدرآباد میں تھا محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد بسایا اور چہار مینار کی مشہور عمارت ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے اس میں ایک نہایت عالی شان مدرسہ تھا مورخین کا بیان ہے کہ جنوبی ہند میں قطب شاہی سلاطین نے مدارس بکثرت قائم کیے

---

[1] ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء میں "سب رس" مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھی۔ اس کا دوسرا نام "قصہ حسن و دل" ہے۔ اس میں اخلاق اور صوفیانہ مسائل ایک تمثیلی قصہ کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ کے ساتھ حیدرآباد سے شائع کی تھی۔

مدرسہ اور کتب خانہ بیدر — ۱۴۷۹ء

ابراہیم قطب شاہ نے اپنے دارالخلافہ گولکنڈہ میں متعدد مدرسے تعمیر کرائے اور اس کے بیٹے قلی قطب شاہ نے اپنی مملکت میں بہت سے ابتدائی مدارس قائم کئے جن کے متعلق مورخ شابرل (Sholerl) نے لکھا ہے کہ[ا] :-

" ان مدارس میں لڑکے آلتی پالتی مار کر بینچ یا چٹائی پر بیٹھتے تھے سرکنڈے یا داسطین قلم سے کاغذ پر لکھتے تھے۔ کاغذ زیادہ ترچین سے درآمد کیا جاتا تھا لیکن وہ یورپی کاغذ کے مقابلے میں اچھا نہ ہوتا تھا۔ یورپ کا کاغذ صاف اور پتلا تھا۔"

قطب شاہی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد اس عہد کے کتب خانے ایسے برباد ہوئے کہ تاریخ میں بھی ان کا نام ونشان نہیں ملتا لیکن اُن کا پتہ اس عہد کی وہ کتابیں بتا رہی ہیں جنھیں اب تک خدا نے زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ کے "دیوان" کا ایک بہترین نسخہ قطب شاہی کتب خانہ کا حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود[۲] ہے۔ خدابخش لائبریری بانکی پور میں "دیوان[۳] حافظ" کا ایک نسخہ سلطان محمد قطب شاہ کے شاہی کتب خانے کا ہے اور سلطان محمد قطب شاہ کے ہاتھ کی تحریر اس پر ثبت ہے جس سے

[ا] Promotion of learning in India by Narendranath Law P. 96

[۲] تاریخ زبان اردو از حکیم سید شمس اللہ قادری ص ۵۹

[۳] یہ تفصیلات "ایک مشرقی کتب خانہ" کے ص ۳۲، ۶۴ اور ۸۰ سے لی گئی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حیدرآباد دکن میں سلطان کے لئے محمد محسن نے ۱۰۲۲ھ میں لکھا تھا۔ اس کا پہلا صفحہ بڑا مرقع ہے اور اس پر بیل زمین میں طلاکاری کی گئی ہے جس کاغذ پر یہ لکھا گیا ہے اس کا رنگ گہرا بادامی ہے عنوان سفیدے سے، سرخی سے اور سونے سے لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ نسخہ بھی دکن کے قطب شاہی خاندان پر فتح پانے کے بعد اورنگزیب کے قبضہ میں آیا تھا۔ "جہانگیر نامہ" (نسخۂ خدا بخش لائبریری) پر اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت درج ہے کہ یہ کتاب شہزادہ محمد سلطان کے قبضہ میں گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے کتب خانہ سے آئی تھی۔ یہ مخطوطہ ۱۰۰۲ھ کا مکتوبہ ہے اور اس پر سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔
"غنیۃ الحساب" (نسخۂ خدا بخش لائبریری) پر بھی سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ثبت ہے یہ علم الحساب پر چھٹی صدی ہجری کے ایک ریاضی داں علی بن ثابت کی تصنیف کا دنیا میں واحد نسخہ ۵۸۶ھ کا مکتوبہ ہے۔
قطب شاہی کتب خانوں کی یہ دو کتابیں جے پور میں ہیں "خمسہ نظامی" جس پر

---

[۱] روداد کل راجستھان اردو کنونشن منعقدہ ۲۹-۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء بمقام جے پور مرتبہ احترام الدین احمد شاغل عثمانی ص ۱۰۹ و ۱۱۲۔

[۲] "خمسہ نظامی" کا اس سے بہتر نسخہ (مکتوبہ حسین عبداللہ ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء) کتب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے اور اس سے بھی قدیم نسخہ (مکتوبہ ۶۱۱ھ) جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے۔

سلطان قطب شاہ کی مہر کے علاوہ کفایت اللہ کے نام کی بھی چار مہریں ہیں آخر میں ۱۱۱۷ھ کی حافظ محمد محسن بندۂ عالمگیر کی تحریر و مہر ہے "جواہر التفسیر" مصنفہ ملا حسین واعظ کاشفی جس کے آخر میں عبداللہ قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی مہریں ہیں اس کی تاریخ تحریر و تصنیف کی نسبت لکھا ہے کہ یہ لفظ "فیض" سے نکالی گئی ہے جس سے ۸۹۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں اس حساب سے یہ کتاب چار سو نوے برس پرانی ہوئی۔

مثنوی "مجمع البحرین" کا یہ نسخہ بھی دیکھئے جو اب کتب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ حبیب گنج میں ہے اس پر سلطان محمد قطب شاہ محمد ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان تینوں سلاطین کے کتب خانوں میں رہ چکی ہے۔

عادل شاہی سلطنت

اس سلطنت کے فرماں روا[1] ؤں نے علم و فن کی ایسی فیاضی کے ساتھ سرپرستی کی کہ ان کے دامن دولت سے ابوالقاسم فرشتہ، نور الدین ظہوری، ملا ملک قمی، نصرتی، ہاشمی اور ملک خوشنود جیسے ارباب علم و ادب وابستہ ہو گئے اور کتب خانے خوب چلے۔ بیجاپور کے شاہی کتب خانہ کے علاوہ تعلیمی اور ذاتی کتب خانے بکثرت تھے۔ لکھا ہے کہ تمام ممالک محروسہ کی مسجدوں میں مدرسے قائم تھے جن میں طلباء کے اخراجات کی کفالت

---

[1] سلاطین عادل شاہی کے حالات "بساتین السلاطین" (محمد ابراہیم زبیری) میں درج ہیں۔

حکومت کی طرف سے کی جاتی تھی اور اس زمانہ میں عراق و عجم سے سیکڑوں اہل علم دار الخلافہ بیجاپور میں آکر جمع ہو گئے تھے۔ صرف ایک فرماں روا علی عادل شاہ کے عہد میں جو لوگ شیراز سے آکر انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے۔[۱]

کتب خانہ عادل شاہی

عادل شاہی سلطنت کی ایک بے نظیر یادگار کتب خانہ عادل شاہی ہے جسے سلطان علی عادل شاہ اول (متوفی ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء) نے قائم کیا تھا۔ اس کتب خانہ کو علم و ثقافت کا ایک زندہ مرکز کہنا چاہیے کتابوں سے متعلقہ فنون کے سارے شعبے اس سے ملحق تھے۔ کتابت مصوری، نقاشی، جلد بندی وغیرہ کے لئے ساٹھ آدمی یہاں ملازم تھے اس سلطان کے ذوق مطالعہ کی یہ کیفیت تھی کہ دوران سفر میں کتابوں سے بھرے ہوئے چار سو صندوق اس کے ساتھ رہتے تھے۔[۲]

اس کے بعد ابراہیم عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) تخت نشین ہوا اس کے عہد کے کتب خانوں میں موسیقی کی بہترین کتابیں جمع ہو گئیں۔ اس فن میں یہ بادشاہ ایسا کمال رکھتا تھا کہ لوگ اسے جگت گرو کہتے تھے اس نے فن موسیقی پر ہندی نظم میں کتاب نورس لکھی اس بادشاہ کو خطاطی اور مصوری میں کافی مہارت تھی۔ اس کے عہد کے مشہور خطاط

---

[۱] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۲۰ ۔ ص ۱۶

[۲] دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) ص ۱۰۶ (حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء)

آثار مبارک بیجاپور یعنی کتب خانہ عادل شاہی

خلیل اللہ بت شکن، عبدالرشید اور عبداللطیف مصطفیٰ تھے۔ جن کی خطاطی کے نمونے "کتاب نورس" اور "مرقع عادل شاہی" میں موجود ہیں۔ کتاب نورس کے دس نسخوں[1] کا پتہ ڈاکٹر نذیر احمد کو ملا ہے ان کے بیان کے مطابق نسخہ مملوکہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن بہت قدیم اور مطلّا و مذہب ہے۔ بسرورق کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔

اس مختصر بیان سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں علم کی توسیع اور کتب خانوں کی ترقی خوب ہوئی۔ قطب شاہوں کے زمانہ میں شاہ میراں[2] جی خدانما، مولانا عبداللہ[3]، میراں یعقوب[4] اور عادل شاہی سلطنت میں شمس العشاق[5] شاہ میراں جی، ان کے فرزند شاہ برہان الدین[6] جانم اور ان کے صاحبزادے امین الدین[7] اعلیٰ جیسے اولیا کبار اور

---

[1] ان کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "کتاب نورس" مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ [2] شاہ میراں جی نے "تمہیدات عین القضات" کا ترجمہ "شرح تمہید ہمدانی" کے نام سے کیا۔ [3] مولانا عبداللہ نے ایک رسالہ "احکام الصلوٰۃ" دکنی اردو میں لکھا۔ [4] میراں یعقوب نے "شمائل الاتقیا" (مصنفہ برہان الدین اورنگ آبادی) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ [5] شاہ میراں جی کی تصانیف نثر "شرح مرغوب القلوب"، جل ترنگ اور گل باس ہیں۔
[6] شاہ صاحب نے ایک رسالہ "کلمۃ الحقائق" لکھا۔
[7] شاہ امین الدین نے رسالہ "گنج مخفی" لکھا۔

دیگر اہل قلم کی بدولت کتب خانوں میں دکنی نظم و نثر کا شاندار ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اور مثنویوں کی تو کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ دکن میں شاعری کی اس صنف کو بڑا فروغ ملا۔ اس دور کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے مثنوی نہ لکھی ہو۔ ابن نشاطی کی ایک مثنوی "پھول بن"[1] اتنی مرصع ہے کہ علم معانی کے اصول کے موافق اس میں انتالیس قسم کی خوبیاں پیدا کی گئی ہیں۔ تحسین الدین کی مثنوی "کامروپ کلا" اتنے اعلیٰ پایہ کی مثنوی ہے [illegible] شاعر گوتے نے بھی اسے بہت پسند کیا تھا[2]۔ ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری"، نصرتی کی مثنوی "علی نامہ اور گلدستۂ عشق" ملک خوشنود کی مثنوی "ہشت بہشت"[3] اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

غرض دکن کے اہل قلم اپنی تصانیف سے کتب خانوں کی آبیاری کر رہے تھے کہ اورنگ زیب فتح و نصرت کا پرچم اڑاتا ہوا دکن آپہنچا اس نے ۱۶۸۶ء میں عادل شاہی اور ۱۶۸۷ء میں قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مگر اپنی علم دوستی کی بنا پر ان کے کتب خانوں کو برباد نہیں کیا۔ بے شمار کتابیں گاڑیوں میں بھر کر دارالخلافہ لے گیا۔ بہت سی

---

[1] یہ فارسی کتاب بساطین کا منظوم ترجمہ ہے۔ [2] اردو ادب کی تاریخ (جدید ایڈیشن) از نسیم قریشی ص ۲۰۰ (سرفراز پریس لکھنؤ)

[3] یہ مثنوی حضرت امیر خسرو کی ہشت بہشت کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

کتابیں سلطان ٹیپو کے کتب خانہ اور دوسرے کتب خانوں میں پہنچ گئیں، کتب خانہ عادل شاہی کا کچھ حصہ بیجاپور کے آثار مبارک میں اب تک موجود ہے۔

سلطنت خداداد (میسور)

سلطنت خداداد کے فرمانروا فتح علی معروف بہ ٹیپو سلطان کو خدا نے شجاعت و بہادری کے ساتھ علم دوستی کے جوہر بھی عطا کئے تھے۔ وہ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا لیکن اجل نے اسے کل سترہ برس (۱۷۸۲ - ۱۷۹۹ء) حکومت کرنے کی مہلت دی اور اس زمانہ میں بھی وہ مبتلائے آلام رہا۔ ایک طرف انگریز اسے صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے دوسری طرف خود اس کے ملازم حق نمک ادا کرنے کے بجائے اپنے ولی نعمت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ ایسے سخت اور نازک دور میں بھی اس نے علم و فن کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ مدرسے کھولے، کتب خانے قائم کئے اس کے عہد میں سرنگاپٹم کی یونیورسٹی جمیع الامور کا کتب خانہ مذہب اور دیگر علوم کی کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کتب خانہ فوجی مدرسہ کا تھا۔ یہ مدرسہ فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ خود ٹیپو کا کتب خانہ اس پرآشوب دور میں امن و سکون کا ایسا گہوارہ تھا کہ جب سلطان جنگ کی الجھنوں اور اپنے ساتھیوں کی کم ظرفی سے کبیدہ خاطر ہونے لگتا تو وہ علم کے اس معبد میں آکر سکون قلب محسوس کرتا اور ٹیپو کی محبوب کتابیں اس کی سچی مونس و ہمدم ثابت ہوتیں۔ اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے کتب خانوں کے کچھ ذخائر بھی اس میں محفوظ تھے۔ ادھونی کی فتح کے وقت جب سلطان نواب بسالت جنگ کا

کتب خانہ ملا تو اس کی کتابیں بھی اس کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں۔ اس میں وہ کتابیں بھی داخل ہوتی رہتی تھیں جو وقتاً فوقتاً سلطان کی زیر سرپرستی لکھی جاتی تھیں اس طرح جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں ان میں "مفرح القلوب" اور "تحفۃ المجاہدین" قابل ذکر ہیں۔ تحفۃ المجاہدین کو فتح المجاہدین بھی کہتے ہیں اسے سلطان نے اپنے فوجی محکمہ کے لئے لکھوایا تھا اس میں فوج کے لئے قواعد و ضوابط درج ہیں۔ اس کتاب پر حسب بیان مصنف سلطنت خداداد سلطان کی مہر ثبت ہے اور ہر مضمون کے آخر میں اس کے دستخط ہیں۔

سلطان نے اپنے کتب خانہ کے لئے کتابوں کی فراہمی کا خاص اہتمام کیا تھا اس کی یہ تحریر ظاہر کرتی ہے کہ وہ یورپ تک سے کتابیں منگایا کرتا تھا۔ ۲۹ دسمبر ۸۶ء کو اس نے لکھا کہ "یورپ سے ایک کتاب ابھی آئی ہوئی ہے جس میں "آلہ مقیاس الحرارت" کے متعلق معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے حضوری میں پیش کیا جائے"۔

کتابوں کی جلد بندی، کتابت اور نقاشی کا بھی اسے خاص خیال تھا اور اس میں وہ برابر ہدایتیں جاری کیا کرتا تھا جلد ساز اپنے سلطان کی خوشنودی کی خاطر بہت یون بوٹے بناتے اور کتابوں کا حسن دوبالا کرنے کے لئے اللہ، محمدؐ، علی فاطمہ، حسن اور حسین کے نام لکھتے۔ جلد کے چاروں کونوں پر خلفائے اربعہ کے نام کندہ کرتے بعض پر لفظ ٹیپو سلطان بھی منقش کر دیتے تھے سلطان کی شہادت کے بعد جب شاہی محلات کی تلاشی لی گئی تو بعض کتابیں ایسی بھی نکلیں جن کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔[1]

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد، از محمود خان محمود بنگلوری۔ ص ۳۲۹
(یونائیٹڈ پبلشرز لاہور ۱۹۳۷ء)

کتب خانہ کے کاموں میں سلطان کی خصوصی توجہ کا اندازہ لگانے کے لیے اسکی یہ تحریریں پڑھیے۔ ۱۱ر جولائی ۱۷۸۶ء کو اس نے لکھا تھا:[1]-

"کتاب 'فخر الشیوخ' ایک جلد بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ کاتبوں سے اس کتاب کی دس نقلیں نہایت خوشخط کرائی جائیں پھر آگے اور پیچھے پندرہ پندرہ سادہ ورق لگا کر جلد بندی کرائی جائے۔ تاکید ہے کہ یہ کام جلد کرا کر نقلیں یہاں حضوری میں بھیج دیں اور اپنے محکمہ کے رجسٹر میں اس امر کا اندراج کر لیا جائے۔ چند دن پہلے تم کو یہاں سے کتابیں اور ایک فہرست بھیجی گئی تھی۔ فہرست کے مطابق جائزہ لے کر انھیں ہمارے کتب خانے میں داخل کریں اور اس محکمہ کے رجسٹر میں ان کے نام درج کیے جائیں ان کتابوں میں سے سات کتابیں ہمارے پاس ہیں"

۱۷ر اگست ۱۷۸۶ء کو سلطان نے تحریر کیا تھا:[2]-

"حکم دیا جاتا ہے کہ کتاب 'مفرح القلوب' کی دس نقلیں روانہ کی جائیں۔ ان میں پانچ نقلیں مفصل ہوں ان کی جلد بندی کرتے ہوئے اوپر نقرئی قفل لگائے جائیں اور باقی پانچ نقلوں میں اس کتاب کا صرف اقتباس ہو ان پر قفل لگانے کی ضرورت نہیں۔"

سلطان ٹیپو کی نسبت میجر اسٹورٹ نے لکھا[3] ہے

---

[1] صحیفۂ ٹیپو سلطان از محمود خاں محمود بنگلوری حصہ اول ص ۲۶۹

[2] ایضاً ایضاً حصہ دوم ص ۱۷

[3] سلطنت خداداد ص ۲۹۵

وہ کتب خانہ کی ترتیب وتنظیم کے لئے ایک مہتمم مقرر تھا۔ سلطان کو
تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا۔ سلطان کے حکم اور فرمائش سے بہت سی
کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے
متعلق ہیں، سلطان نے اپنے فرامین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے
جو اس وقت بھی یورپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ سلطان جو کتاب
مطالعہ کرچکتا تھا اس پر مہر لگا دیتا تھا اسطرح اکثر کتابوں پہ مہر ثبت تھیں"

سلطان کی شہادت کے بعد اس کے کتب خانہ کا یہ حشر ہوا کہ سرنگاپٹم کی لوٹ و غارتگری کے وقت سیکڑوں کتابیں تباہ وبرباد ہوگئیں جو بچ رہیں انکی کسی نے چھ برس تک خبر نہ لی اسکے بعد انکی دیکھ بھال کرنل کرک پیاٹرک کے سپرد ہوئی پھر میجر اسٹورٹ نے عربی فارسی اور اردو مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی جو ۱۸۰۹ء میں کیمبرج سے شائع ہوئی اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے ٹیپو کی علمی دولت کو ہندوستان میں رکھنا گوارا نہ کیا۔ چند کتابیں تو کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو دیدیں باقی سب انگلستان بھیج دیں۔ سلطانی کتب خانہ کی جو کتابیں برباد ہونے سے بچ رہی تھیں ان میں ۶۸۷ کتابیں نہایت قیمتی بتائی جاتی ہیں جن کی فن وار تعداد یہ ہے[1] :-

قرآن	۴۴	التفسیر	۴۱	کتب وظائف	۳۵	کتب احادیث	۴۲	الہیات	۴۶
تصوف	۵۶	علم الاخلاق	۲۴	فقہ	۹۵	آرٹس	۱۹	فلسفہ	۵۴
نجوم	۲۰	ریاضی	۷	طب	۶۲	تحقیق زبان	۴۵	فرہنگ ولغات	۲۹
نظم کی کتابیں	۱۹	ہندی وغیرہ	۲۳	ہندی اور دکنی انشا	۴	ترکی نثر	۴	قصص وحکایات	۱۸

---

[1] اس تعداد کو "تاریخ سلطنت خداداد" سے لیا گیا ہے۔

لیکن مقام شکر ہے کہ سلطانی کتب خانہ کے قرآن کا ایک نایاب نسخہ تباہی سے بچ گیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ خط نسخ کا اعلیٰ نمونہ اور جلد بندی کا بہترین شاہکار۔ جلد سازوں نے اسے طرح طرح سے سجایا ہے۔ نازک نازک طلائی پھولوں اور رنگ برنگ کے بیل بوٹوں نے اس کی تقدیس میں ایک دلکشی پیدا کردی ہے۔ اس کی زیب و زینت پر نوے[۱۵] ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ اسے سلطانی کتب خانہ کا ایک انمول موتی سمجھئے۔ صد حیف کہ باد مخالف کے جھونکوں نے اسے ہندوستان سے لندن پہنچا دیا اور یہ اب وہاں ونڈسر کیسل (Windsor castle) کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔

یہ کتابیں سلطان کے علمی ذوق کی روشن یادگاریں ہیں جنھیں دیکھ کر اس کی حب الوطنی اور علمی قابلیت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین یہ واقعہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ جب تک ٹیپو زندہ رہا انگریز ہندوستان میں اپنی سلطنت غیر مستقل اور ناپائدار سمجھتے رہے اور جس دن اس نے جام شہادت پی لیا جنرل ہارس پکار اٹھا "آج ہندوستان ہمارا ہے"

جہاں تک ٹیپو کی علمی قابلیت کا تعلق ہے اس کے دشمن بھی اسے

---

[۱۵] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۲۲ ص ۴

لیک بلند پایہ انشا پرداز تسلیم کرتے ہیں۔ کیمبل نے لکھا ہے کہ "سلطان نہایت آسانی سے نثر و نظم لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک شان پائی جاتی ہے۔"[۱] کرنل کرک پیاٹرک نے کہا ہے کہ "سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ اس قدر مختصر اور پر معنی ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے کئی معنی نکلتے تھے تحریر کا وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے":[۲]

سلطان ٹیپو کے یہی وہ کارہائے نمایاں ہیں جن کا ذکر آج تک فخر و احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی نے اسے خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "اس کے کارنامۂ زندگی کی یادوں کے اندر خوشی اور مسرت کا طوفان پیدا کر دیتی ہے"[۳] علامہ اقبال نے اس عظیم شخصیت کو آبروئے ہند و چین و روم و شام قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے:

رفت سلطان زین سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز

۱-۲ بحوالہ سلطنت خداداد (محمود خاں محمود) ص ۴۹۲-۴۹۳

۳ بحوالہ ٹیپو سلطان مرتبہ ایم۔ محمد اشرف ص ۴۵ (لاہور ۱۹۵۰ء)

کشمیر
مالوہ
گجرات
بنگال
بہار
یوپی

اور کتب خانے

کشمیر جنت نظیر میں جو کتب خانے مسلمانوں نے قائم کیے ان کا پہلا نقش حضرت بلبل شاہ یا بلال شاہ کی خانقاہ میں ملتا ہے۔ ان بزرگ کا اصلی نام شرف الدین سید عبدالرحمٰن ترکستانی تھا اور انھیں کشمیر میں اسلام کا پہلا کامیاب مبلغ کہا جاتا ہے ان ہی کی توجہ سے ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں کشمیر کا راجہ رنجن دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور سلطان صدرالدین[1] کا لقب اختیار کر کے کشمیر کا پہلا مسلم بادشاہ بنا۔ اسی نے آپ کے لئے ایک خانقاہ اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ گو اس خانقاہ کے مدرسہ اور کتب خانے کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ممدوح نے ان دس ہزار آدمیوں کے لئے جو آپ کے روحانی فیض سے مسلمان ہوئے تھے تعلیم اور کتابوں کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ لہٰذا یہ قیاس کر لینا بجا ہوگا کہ اس خانقاہ سے متعلق ایک مدرسہ بھی تھا اور اس کا کتب خانہ بھی حضرت بلبل شاہ اہل کشمیر کو رشد و ہدایت سے فیضیاب کرنے کے بعد ۷۲۷ھ (۱۳۲۶ء) میں انتقال فرما گئے۔ ایک شاعر نے سال وفات کا یہ قطعہ کہا ہے :۔

سالِ تاریخ وصلِ بلبل شاہ ۔ بلبلِ قدس گفت، خاصِ الٰہ

۷۲۷ھ

---

[1] صدرالدین کے بعد میر شاہ نے ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں سلطان شمس الدین کا نام اختیار کر کے عنان حکومت سنبھالی اس کا خاندان "شاہ میری" کہلایا جو ۱۵۶۱ء تک حکومت کرتا رہا اس کے بعد چک خاندان نے ۱۵۸۹ء تک حکومت کی اسی سال اکبر نے کشمیر فتح کر لیا۔

سید ہمدانی کا کتب خانہ

لیکن چودھویں صدی عیسوی میں ہمیں سید امیر کبیر سید ہمدانی کے کتب خانہ کا ذکر ملتا ہے جس کے تحویلدار آپ کے خلیفہ محمد کاظم (سید قاضی)[1] تھے۔ سید ہمدانی بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ وہ چودھویں صدی عیسوی میں ایران سے کشمیر تشریف لائے اور اپنی مساعی جمیلہ سے ۳۰ ہزار کشمیریوں کو مسلمان کیا۔ کشمیر میں ان کی خانقاہ اشاعت اسلام اور اشاعت علم کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ انھوں نے متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں مجمع الاحادیث[2]، شرح فصوص الحکم اور ذخیرۃ الملوک[3] مشہور ہیں۔ سید ہمدانی کی وفات (۱۳۸۴ء) کے بعد ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی کشمیر آئے اور اپنے سیکڑوں رفقا کی مدد سے سارے کشمیر کی مذہبی اور علمی زندگی کو متاثر کر دیا جس کی وجہ سے علم کی اشاعت اور زیادہ ہوئی اور کشمیر کے کونہ کونہ میں کتب خانے پھیل گئے۔

سلاطین کشمیر اور کتب خانے

سلاطین کشمیر نے بھی مدرسے اور کتبخانے قائم کرکے ہر شخص کو علم سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔ ان سلاطین نے علم و فن کی جس اعلیٰ پیمانہ پر سرپرستی کی اور اس مد پر جو بے دریغ روپیہ صرف کیا اس کا ذکر صوفی کی تاریخ کشمیر[2] اور دوسری کتابوں میں

---

[1] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۳۲۲

[2] KASHIR (history of Kashmir) by G. M. D. Sufi 2 vol.
(University of Panjab Lahore - 1948)

[3] مثلاً "واقعات کشمیر" (ملا محمد اعظم)

وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے مگر کتب خانوں کے معاملہ میں بے توجہی برتی گئی ہے۔
جیسا کہ پہلے کئی بار کہا جا چکا ہے کہ اس زمانہ میں ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی ہوا
کرتا تھا اس لئے یہاں یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین کشمیر کے قائم کئے
ہوئے مدارس سے کتب خانے بھی ملحق تھے ان میں مدرسۃ القرآن کا کتب خانہ
ہمارے خیال میں نہایت قیمتی مذہبی کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری خاندان کے
فرماں روا شہاب الدین نے قرآن اور حدیث کی ترویج و اشاعت کے لئے
جو مدارس قائم کئے تھے ان میں مدرسۃ القرآن سب سے زیادہ مشہور تھا۔ ایک نو مسلم
کشمیری ابو المشائخ شیخ سلیمان اسی مدرسہ سے تعلیم پا کر ممتاز قاری بنے
اور امام القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور یہ قریب بہ یقین ہے کہ سلطان
قطب الدین کے عہد میں قطب الدین پور کالج کا کتب خانہ نہایت
نفیس تھا اس لئے کہ یہ کالج اس عہد کا بہترین کالج تھا جو سکھوں کے عہد تک
باقی رہا اور جسے کشمیر کی تعلیمی تاریخ میں ایک نشان منزل کہنا چاہئے۔ یہ پہلی
اقامتی درس گاہ تھی جو کشمیر میں قائم ہوئی تھی۔

سلطان سکندر کے عہد (۱۳۸۹ - ۱۴۱۳ء) میں کتب خانوں کی جو بہتات
ہو گی اس کا اندازہ قارئین سلطان کی علم پرور پالیسی سے لگا سکتے ہیں۔ لکھا
ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر علمی شان و شکوہ میں عراق و خراسان کا ہمسر بن گیا تھا
قیاساً کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے کتب خانوں میں مدرسہ جامع مسجد کا
کتب خانہ حدیث، فلسفہ اور ریاضی کی بہترین کتابوں سے معمور تھا اس
لئے کہ اس درس گاہ کے عملہ میں چند نہایت لائق و فائق اساتذہ شامل تھے۔

ایک نہایت جید عالم قاضی میر محمد علی بخاری اس کے پرنسپل تھے۔ استادوں میں محمد افضل بخاری، ملا محمد یوسف، ملا صدر الدین کاشی اور سید حسین منطقی علی الترتیب حدیث، فلسفہ، ریاضی اور منطق و مابعد الطبیعات کا درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کے ساتھ بھی سلطان نے ایک بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا تھا جس کے مصارف کے لئے اس نے ایک وقف قائم کر دیا تھا۔

اس طرح تعلیمی ترقیوں کے ساتھ کشمیر میں کتب خانوں کا دائرہ بھی بڑھتا رہا یہاں تک کہ سلطان زین العابدین[1] المعروف بہ بڈشاہ تخت نشین ہوا یہ بڑا صاحب علم بادشاہ تھا کشمیری، فارسی اور سنسکرت میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس کا دربار ارباب علم و فن کا مرجع بنا ہوا تھا اور یہ سلطان اپنی علم دوستی اور رعایا پروری کی وجہ سے کشمیر کا اکبر کہلاتا تھا۔ اس کے عہد (۱۴۲۰-۷۰ء) میں علم و ادب اور صنعت و حرفت کی جو ترقیاں ہوئیں ان سے کشمیری کتب خانوں کو بڑا فروغ ملا۔ لکھا ہے کہ بڈشاہ کے پاس باہر سے تحفوں میں کتابیں آیا کرتی تھیں اور وہ بھی اپنے گماشتے کتابوں کی فراہمی کے لئے دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجا کرتا تھا۔ اس کے عہد میں جو کتب خانے قائم ہوئے ان میں بڈشاہ کا کتب خانہ نہایت نفیس اور وسیع تھا بلکہ وہ کشمیر کے سارے کتب خانوں پر سبقت لے گیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مورخین کہتے ہیں کہ اس کا شمار دنیا کے

---

[1] زین العابدین کے دربار کے مسلم اور ہندو فضلا کے حالات صوفی کی تاریخ کشمیر جلد ۱ ص ۱۶۲ پر درج ہیں۔

بہتوں کتب خانوں میں ہوتا تھا اور وہ سو برس تک باقی رہا۔ اس کتب خانہ سے دار العلوم نوشہر کے اساتذہ اور طلبار بھی استفادہ کر سکتے تھے۔ سلطان نے اس دار العلوم کے اخراجات کے لئے کئی گاؤں کی آمدنی وقف کردی تھی اور درس و تدریس کے لئے نہایت لائق و فائق اساتذہ مقرر کئے تھے۔ دار العلوم کے مہتمم اعلیٰ ملا کبیر نحوی تھے۔ اساتذہ میں ملا احمد کشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری، ملا جمال الدین خوارزمی، میر علی بخاری، اور ملا یوسف رشیدی جیسے ممتاز علما و فضلا شامل تھے۔ اس زمانہ میں مدرسہ سیر کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہوگا۔ یہ مدرسہ بڈشاہ نے اسلام آباد کے قریہ ''سیر'' میں قائم کیا تھا جسے علم و فضل کا بہت بڑا مرکز کہا جاتا ہے اس کے مدرس اعلیٰ ملا غازی خاں تھے۔

بڈشاہ نے تاریخ نویسی اور تراجم کے محکمے بھی قائم کئے، جن سے کتب خانوں کی ترقی میں اور مدد ملی۔ اس محکمہ کی سرپرستی میں بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کی گئیں مثلاً دار البرج کے افسر اعلیٰ سومہ نے کشمیری زبان میں بڈشاہ کی سوانح ''بین ناٹک چرت'' لکھی۔ یودھ بھٹ نے موسیقی کی ایک کتاب لکھ کر سلطان کے نام معنون کی۔ ملا احمد کشمیری نے مہابھارت کا فارسی ترجمہ کیا اور تاریخ ''وقائع کشمیر'' لکھی، سری ور نے جامی کی یوسف زلیخا کا فارسی سے سنسکرت میں ترجمہ کیا اور اس کا ''کتھا کوتو کا'' نام رکھا، کشمیر کی مشہور تاریخ ''راج ترنگنی'' کشمیری زبان میں لکھی گئی جس کا فارسی میں ترجمہ ملا احمد کشمیری نے کیا اور اس کا بحر الاسمار نام رکھا،

جب اکبر کشمیر گیا تو یہ کتاب اکبر کی خدمت میں پیش ہوئی اس نے دوبارہ فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا چنانچہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کا ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کا انتخاب ملا عبدالقادر بدایونی نے کیا۔

چک سلاطین کے عہد میں بھی کتب خانے ترقی کرتے رہے اس زمانہ میں اشاعت تعلیم کا جوش و خروش اتنا پھیل گیا تھا کہ سلطان حسن شاہ کی ماں گل خاتون نے بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس سلطان کے عہد میں ایک کتب خانہ مدرسہ دارالشفاء کا بھی تھا۔ حسن شاہ کو اپنے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں مدرسہ دارالشفاء سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے اپنے روحانی پیشوا شیخ الاسلام بابا اسمٰعیل کبروی کو اس کا صدر مقرر کیا اس سلطان کے جانشین حسین شاہ کے دور میں مدرسہ حسین شاہ کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ یہ سلطان بھی اشاعت علوم و فنون میں اپنے پیشروں سے پیچھے نہیں رہا۔ لکھا ہے کہ اس نے ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا' اور بورڈنگ ہاؤس بھی، اس میں طلباء مستقل رہتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات اور کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لیے سلطان نے کئی گاؤں کی آمدنی وقف کر دی تھی۔ اس مدرسے کے معلمین اور منتظمین شیخ فتح اللہ حقانی اور اخوند ملا درویش کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم و تدریس کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ یہاں سے شیخ حمزہ مخدوم جیسے ذی علم درویش تعلیم پا کر نکلے تھے۔

جب کشمیر مغلوں کے قبضہ میں آیا تو ان کے حسن مذاق نے اس جنت ارضی کو باغوں، مدرسوں اور کتب خانوں سے آراستہ و پیراستہ کر دیا۔ ان کے عہد میں نسیم باغ، شالامار باغ اور نشاط باغ کے ساتھ علم و فضل کے ایسے روح افزا چرچے ملتے ہیں جن کے ذکر سے آج بھی شعر و ادب اور کتابی ذوق کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ اکبر کے عہد میں حسین خاں والی کشمیر نے کئی مدرسے قائم کئے۔ جہانگیری دور میں علامہ ملا حیدر نے درسگاہ ملا حیدر قائم کی۔ شاہجہانی عہد میں خواجہ خوند محمود نقشبندی نے مدرسہ خواجگان نقشبندی قائم کیا۔ ان مدارس کے کتب خانے ہر مدرسہ کی حیثیت کے مطابق ہوں گے لیکن کتب خانوں کے حق میں سب سے بڑا کام کشمیر میں یہ ہوا کہ اکبری دور میں یہاں ایک چھاپہ خانہ قائم ہو گیا جس نے ہندوستانی کتب خانوں کی توسیع و ترقی کے لئے راہیں فراخ کر دیں۔

مالوہ

شبِ مالوہ کا ذکر تو آج بھی بڑے مزے لے لے کر کیا جاتا ہے مگر یہاں کے مدرسوں اور کتب خانوں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا حالانکہ ان ہی کی بدولت یہ خطہ شیراز و سمرقند کا ہم سر بن گیا تھا مالوہ میں دلاور خاں غوری نے ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں خود مختار حکومت قائم کی اور مانڈو (شادی آباد) کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ دلاور خاں کا خاندان چوبیس برس حکمراں رہا اس کے بعد محمود خاں خلجی کے خاندان نے ۱۵۳۰ء تک حکومت کی۔ اس ایک سو تیس سالہ دور میں اجین، مانڈو، چیتور، سارنگ پور اور ظفر آباد وغیرہ میں مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے دلاور خاں کے جانشین سلطان ہوشنگ نے مانڈو کو ترقی دی، یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور مدرسہ قائم کیا جس کے ساتھ ہمارے خیال میں کتب خانہ بھی ہوگا۔ اس کے بعد سلطان محمود خاں خلجی اور اس کے لڑکے سلطان غیاث الدین کے عہد میں بے شمار کتب خانے ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ محمود نے اپنی مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے تھے اور اس کے عہد میں علمی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ مالوہ یونان ثانی کہلایا جانے لگا تھا۔ اس دور کے مدرسوں میں مانڈو اور سارنگ پور کے مدرسے اور سلطان غیاث الدین کے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں ظفر آباد کا مدرسہ اور مدارس نسواں بہت مشہور تھے۔ اس بادشاہ نے تعلیم نسواں کی طرف

خاص طور پر توجہ کی۔ اس کے محلات میں تقریباً ایک ہزار عورتیں حافظ قرآن تھیں۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ اس نے عورتوں کو مختلف ہنر مثلاً مخمل بافی، کوزہ گری اور خیاطی وغیرہ سکھانے کا خاص اہتمام کیا تھا انھیں حکیم، مدرس اور مفتی کے عہدوں پر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ انسانی ترقی کی تکمیل کے لئے عورتوں کو علمی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا نہایت ضروری خیال کرتا تھا۔

غیاث الدین خلجی کے بعد ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں مالوہ خلجی خاندان کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس پر شاہان گجرات کا قبضہ ہوگیا پھر ۱۵۶۹ء میں اکبری سلطنت میں شامل ہو جانے کے بعد مالوہ کے کتب خانوں نے جو ترقی کی ہوگی اس کا اندازہ سرا اس نظر کر سکتے ہے۔

——•——

گجرات

کتب خانوں کے اعتبار سے قرون وسطیٰ کے گجرات کو بڑی فضیلت حاصل تھی یہاں کتب خانوں اور مدرسوں کے قیام کی ابتداء علاءالدین خلجی کی فتح گجرات سے ۲۵۹ برس پہلے ایک بزرگ باوا ریحان کے ہاتھوں ہو چکی تھی جو اشاعت اسلام کی خاطر چالیس فقراء کے ساتھ بغداد سے بھروچ آئے تھے۔ انھوں نے ۴۳۰ھ (۱۰۳۸ء) میں یہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر کی تھی۔[1] ظاہر ہے کہ انھوں نے درس و تدریس کی خاطر کتابوں کا کچھ ذخیرہ بھی جمع کیا ہوگا جسے گجرات کے کتب خانوں کی بنیاد کہا جا سکتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی تعمیر و ترقی میں ان بزرگوں کا بھی ہاتھ ہے جو گجرات کی بندرگاہوں سورت، کھمبات وغیرہ سے مکہ مدینہ اور مصر و ایران وغیرہ آیا جایا کرتے تھے۔ ان تعلقات نے اس خطہ کو ارباب علم و فضل کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب علاءالدین خلجی کے سپہ سالار الغ خاں نے ۱۲۹۷ء میں گجرات فتح کر کے اسے دہلی سلطنت کا صوبہ بنایا اس وقت دہلی میں علم و فضل کے دریا موجزن تھے جن سے اب گجرات کی سرزمین بھی سیراب ہونے لگی اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ سلاطین گجرات کے عہد میں ان علمی سرگرمیوں کو

---

[1] آب کوثر شیخ محمد اکرام ص ۲۷۵

اور ترقی ملی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اس خطے میں تحصیل علم اور کتابیں جمع کرنے کا شوق دن بدن ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ گجرات کی خود مختار سلطنت کے دوسرے سلطان احمد شاہ کے عہد میں ہی کتب خانوں کا قیام باقاعدہ طور پر عمل میں آگیا۔ اس سلطان کا دادا ظفر خاں گجرات کا گورنر تھا مگر اس نے دہلی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۷۹۹ھ (۱۳۹۶ء) میں مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور یہ علاقہ اکبر کی فتح گجرات (۱۵۷۲ء) تک خود مختار رہا۔ مظفر شاہ کے جانشین سلطان احمد شاہ اول نے ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) سے ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) تک حکومت کی۔ اس عرصہ میں اس نے شہر احمد آباد بسایا، مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، احمد شاہ کے عہد میں کتب خانے بھی قائم ہوئے۔ علماء و فضلاء اور کتابوں کے ذخیرے باہر سے آئے۔ خود سلطان کی سرپرستی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں اسی کی فرمائش پر امام بدرالدین دمامینی نے صحیح بخاری اور مغنی اللبیب کی تعلیقات لکھیں۔ یہ بزرگ ۸۰۰ھ میں مصر سے گجرات آئے تھے ان کے علاوہ اور بہت سے علماء و محدثین احمد شاہ کے سایۂ عاطفت میں اطمینان و فراغت کے ساتھ علمی و تصنیفی کاموں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

سلاطین گجرات کا شاہی کتب خانہ

ابھی گجرات کی خود مختار سلطنت کو قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ احمد شاہ کی علم نوازی کی بدولت گجرات کے

شاہی کتب خانہ میں کتابوں کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا۔ لکھا ہے کہ
سلطان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ نے شاہی کتب خانہ کی
بہت سی کتابیں شیخ محمد عثمان کے مدرسہ کو اس لئے دے دیں کہ وہ شیخ
موصوف سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اس قسم کے اور نہ معلوم کتنے
صدمات اس کتب خانہ کو اپنی زندگی میں اٹھانے پڑے ہوں گے لیکن
پھر بھی وہ اکبر کی فتح گجرات تک باقی رہا۔

گمان غالب ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ کے عہد میں اس شاہی کتب خانہ کو
بے حد ترقی ملی ہوگی۔ سلاطین گجرات میں محمود بیگڑہ بڑا با [illegible] کیا جاتا
ہے اس نے باون برس (۱۴۵۸ء [illegible] ۱۵۱۱ء) نہایت شان وشوکت کے
ساتھ حکومت کی وہ علم دوست مصنف مزاج اور فیاض تھا۔ اس کے
عہد میں بقول مصنف یادِ ایام[1] سارا ملک [illegible] سبزی و شادابی میں باغِ بہار
نظر آنے لگا۔ دیہات اور قصبے آباد و معمور ہوگئے۔ احمدآباد صنعت وحرفت
کا مرکز بن گیا۔ ہر ایک جگہ مدرسے اور خانقاہیں جا بجا کھل گئیں۔ ایسے علم نواز

---

[1] یادِ ایام یعنی تاریخ گجرات مصنفہ سید عبدالحی (لکھنؤ ۱۹۲۰ء) اس کتاب کے علاوہ گجرات
کی تاریخ کے متعلق یہ کتابیں دیکھئے "مرآت سکندری" (سکندر بن محمد عرف شیخ منجھو)
"تاریخ گجرات" (شاہ ابوتراب ولی) "مرآت احمدی" (مرزا محمد حسن علی محمد خاں بہادر)
"خاتمہ مرآت احمدی" مصنفہ مرزا محمد حسن علی محمد خاں بہادر بہ تصحیح سید نواب علی
(بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۹۳۰ء)

سلاطین کے دور میں احمد آباد، سورت، نہروالا پٹن، ماہم، بھروچ، کھمبات، چمپانیر وغیرہ میں کتب خانے قائم ہو گئے تھے ان میں سے چند کتب خانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شاہ عالم کا کتب خانہ

یہ بھی گجرات کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کی سرزمین پر مشائخ اور علماء کثرت سے جمع ہو گئے تھے انھوں نے مذہب اور علم کی اشاعت کے سلسلے میں جو مدرسے اور کتب خانے قائم کئے ان سے گجرات کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ ایک بزرگ بوداریجن کے گجرات آنے اور خانقاہ و مدرسہ قائم کرنے کا ذکر پہلے آچکا ہے ۸۰۲ھ (۰۰ ۱۴ء) میں ایک اور بزرگ سید برہان الدین عبد اللہ بن محمود الملقب بہ قطب عالم اہل گجرات کو راہ حق دکھانے کے لئے پٹن تشریف لائے تھے اور جب سلطان احمد اول نے احمد آباد بسایا تو وہ پٹن سے احمد آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے ان کا وصال ۸۵۳ھ ۱۴۴۹ء میں ہوا۔ اس ۵۳ سال کے عرصے میں حضرت قطب عالم نے اپنے تبلیغی مشن کی خاطر کتابوں کے جو ذخیرے جمع کئے ہوں گے ان کا ذکر اہل قلم نے نہیں کیا۔

البتہ قطب عالم کے فرزند اکبر سید سراج الدین محمد الملقب بہ شاہ عالم کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا کتب خانہ بہت بڑا تھا[۱] جس میں نادر اور نایاب کتابیں بھی تھیں اور جس کو شاہ عالم کے جانشین برابر ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ گیارھویں صدی ہجری میں وہ انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا[۱]۔

---

[۱] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) جلد ۱۹۔ ص ۳۴۱۔ ۳۴۲

حضرت شاہ عالم درویش کامل اور عالم متبحر تھے اور ذوق کتب بینی بھی رکھتے تھے۔ آپ کے ملفوظات کا ایک قلمی نسخہ جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے جو غالباً دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے اس میں آپ کے اقوال و کرامات اور اس زمانہ کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ حضرت کا وصال ۱۴۷۵ء میں ہوا اور احمد آباد میں دفن ہوئے۔

شیخ محمد بن طاہر[1] کا کتب خانہ

گجرات کے کتب خانوں میں یہ نہایت مشہور اور بہت وسیع کتب خانہ تھا جس کے لئے شیخ موصوف نے عرب اور ایران تک سے کتابیں فراہم کی تھیں[2]۔ گجرات کے یہ جلیل القدر محدث قوم کے بوہرے اور پٹن کے باشندے تھے۔ علم حدیث کی ترویج میں نہایت سرگرم رہے۔ حدیث کا درس بھی دیا کرتے تھے اور مرشد کی ہدایت کے مطابق اپنے طالب علموں کے لئے سیاہی بنایا کرتے تھے اور درس کے دوران میں بھی سیاہی گھسنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شیخ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں "مجمع بحر الانوار" بہت مشہور ہے۔ ان علمی کاموں کے علاوہ شیخ موصوف نے ان بدعتوں کو مٹانے کی بھی سخت کوشش کی جو اُن کی قوم میں پھیلی ہوئی تھیں اور بالآخر اسی سلسلہ میں ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں شہادت پائی۔

---

[1] شیخ محمد بن طاہر کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کا ایک مضمون مقالات شروانی (ص ۳۹۵) میں ملاحظہ کیجئے۔ [2] رسالہ اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) جلد ۱۹۔ ص ۳۴۲

شیخ عبدالقادر خضری کا کتب خانہ

بقول مصنف یادِ ایام یہ نہایت عالیشان کتب خانہ تھا۔ شیخ عبدالقادر بن شیخ خضری اپنے عہد کے جید علماء میں سے تھے۔ انھوں نے بہت سی مفید کتابیں لکھیں جن میں "الحدائق الخضرۃ" (سیرت آنحضرت صلعم) اور "النور السافر فی اعیانِ القرنِ العاشر" (تاریخ) نہایت مشہور ہیں ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ علی مہائمی کا کتب خانہ

یہ نہایت عظیم الشان کتب خانہ تھا جسکی ندرت شیخ موصوف کے تبحر علمی سے ظاہر ہوتی ہے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں" ۸۳۵ھ (۱۴۳۱ء) میں انھوں نے وفات پائی۔ بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ مثلاً محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم" اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف" پر شرحیں بھی لکھیں مگر انکی تصنیف میں قرآن مجید کی تفسیر "تبصیر الرحمٰن" نہایت مشہور ہے۔ بقول مصنف یادِ ایام "تفسیریں تو سیکڑوں لکھی جا چکی ہیں مگر جس بات سے ان کی تفسیر کو امتیاز و خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ قرآن پاک کی آیات کریمہ کو باہم دگر مربوط ہونے کو ایسے دل نشین طریقہ سے بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے اور بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے۔"

مفتی رکن الدین کا کتب خانہ

اس کتب خانہ کے وجود اور اس کی وسعت کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ مفتی صاحب نے اپنی کتاب "فتاوی حمایہ" دو سو چار کتابوں کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کی تھی۔ مفتی رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نہروالہ کے مفتی تھے اور علم حدیث و فقہ میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

قاضی برہان الدین کا کتب خانہ

افسوس کہ اس کتب خانہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا حالانکہ قاضی موصوف بقول مصنف یاد ایام کثرت افادہ میں یکتائے روزگار تھے اور گجرات میں علم ان ہی کی وجہ سے پھیلا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممدوح نہایت عمدہ کتب خانہ رکھتے تھے۔

اسی طرح گجرات کے دوسرے مشائخ اور علماء مولانا راجح بن داؤد (متوفی ۹۰۴ یا ۹۱۴ھ) قاضی جگن (متوفی ۹۲۰ھ) مولانا علاء الدین (متوفی ۹۴۹ھ) مولانا عبدالملک (متوفی ۹۷۰ھ) شیخ حسن محمد (متوفی ۹۸۲ھ) مفتی قطب الدین (متوفی ۹۹۹ھ) مولانا احمد کردی (متوفی ۱۰۸۰ھ) سید محمد زنعونی (متوفی ۱۱۱۱ھ) مولانا نیرالدین سورتی (متوفی ۱۲۰۶ھ) وغیرہ کے کتب خانے تاریکی میں ہیں حالانکہ یہ حضرات[1] ایسے جلیل القدر عالم، محدث، فقیہ اور مصنف تھے جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کیا کرے گا۔

مدرسہ وجیہ الدین کا کتب خانہ

تاریخ کہتی ہے کہ گجرات میں مدارس اور تعلیم گاہیں بکثرت تھیں بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ علم و فضل کے لحاظ سے احمد آباد کو دہلی پر فضیلت

---

[1] ان حضرات کے مفصل حالات کے لئے دیکھئے "یاد ایام" ص ۵۱

واصل ہوگئی تھی اس بیان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گجرات میں کتب خانے بکثرت تھے ان میں مدرسہ وجیہ الدین کا کتب خانہ بہت بڑا تھا[1]۔ لکھا ہے کہ اس میں مختلف مضامین کی بہت سی کتابیں تھیں۔ یہ مدرسہ بقول مصنف یاد ایام احمد آباد میں سب سے زیادہ مشہور تھا اسے علامہ وجیہ الدین نے ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں قائم کیا تھا جہاں وہ خود تادم وفات (۹۹۸ھ) تعلیم دیتے رہے۔ اس مدرسہ کا فیض ان کے بعد ۲۳۸ برس تک جاری رہا۔ علامہ وجیہ الدین کا علمی مرتبہ علمائے گجرات میں نہایت بلند تھا۔ انھوں نے بہت سی کتابیں[2] بھی لکھیں اور علامہ کے شاگرد جس طرح احمد آباد سے لاہور تک پھیلے ہوئے تھے اسی طرح ممدوح کے مدرسہ اور اس کے کتب خانہ کا شہرہ احمد آباد سے لاہور تک گونج رہا تھا۔

مدرسہ شیخ الاسلام کا کتب خانہ

یہ اس اعتبار سے نہایت ممتاز تھا کہ اس کا استعمال صرف مدرسہ کے طلباء تک محدود نہ تھا بلکہ ہر اہل ذوق اس سے استفادہ کرسکتا تھا۔ یہ مدرسہ قاضی اکرام الدین خاں المعروف بہ شیخ الاسلام نے احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی عمارت تین سال (۱۱۰۲ - ۱۱۱۰ھ) میں تیار ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مدرسہ مولانا نور الدین کے لئے تعمیر ہوا تھا جنھوں نے اپنی زندگی علم کی خدمت میں صرف کردی تھی اور علامہ وجیہ الدین کے

---

[1] رسالہ سب رس کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۱۵۔ ص ۲۴۳۔

[2] ان کتابوں کے نام یاد ایام کے ص ۵۸ پر درج ہیں۔

بعد گجرات میں باعتبار درس و تدریس و کثرت تصانیف کے ان سے بڑھ کر کوئی اور عالم نہیں ہوا۔[1] انھوں نے ۱۱۵۵ھ (۴۲-۱۷۴۱ء) میں وفات پائی اور اسی مدرسہ میں دفن ہوئے۔

مدرسہ عثمان پور کا کتب خانہ

یہ وہی کتب خانہ ہے جس کے لئے سلطان محمد شاہ نے شاہی کتب خانہ کی کتابیں عنایت کی تھیں اس مدرسہ کے بانی شیخ محمد عثمان (متوفی ۸۶۳ھ ۵۹-۱۴۵۸ء) اپنے مدرسہ کے کتب خانہ سے اتنی دلچسپی رکھتے تھے کہ ایک عرصہ تک وہ خود اس کے نگراں رہے۔

مدرسہ سرخیز اور شیخ احمد کھتو کے کتب خانے

اس مدرسہ کا کتب خانہ کافی بڑا تھا۔ لکھا ہے کہ سرخیز میں جہاں شیخ احمد کھتو گنج بخش کا مزار ہے وہاں ایک بڑا مدرسہ تھا۔[2] شیخ ممدوح کا شمار اکابر اولیائے کرام میں ہے حضرت شاہ عالم نے بھی آپ سے فیض حاصل کیا تھا۔ ۸۴۹ھ (۴۶-۱۴۴۵ء) میں وصال ہوا۔ شیخ ممدوح اپنا ذاتی کتب خانہ[3] بھی رکھتے تھے۔

مدرسہ فیض کا کتب خانہ

یہ مدرسہ نہر والا پٹن میں ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں قائم ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی تھی۔ لکھا ہے کہ اس سے ایک بڑا کتب خانہ[4] ملحق تھا۔

[1-2] یاد ایام - ص ۳۳، ۶۲

[3-4] رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) ج ۱۸ ص ۲۴۱، ۲۴۳۔

مدارس سورت کے کتب خانے بھی ہمارے خیال میں بہت نفیس تھے یہاں کے مدارس میں ایک مدرسہ سید محمد بن عبداللہ العیدروس کے مزار کے پاس ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں تعمیر ہوا تھا اور سورت میں مرجان شامی کی مسجد ہمیشہ مدرسہ کا کام دیتی تھی اسی طرح سورت اور دوسرے شہروں کی بہت سی مسجدوں میں درس کے حلقے اور کتابوں کے ذخیرے طالبان علم کو فیض پہنچا رہے تھے۔

اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ گجرات کا یہ بھی وہ بلند پایہ کتب خانہ تھا جس میں نہایت نفیس نادر کتابیں جمع تھیں اور جو اکبر کی فتح گجرات تک موجود تھا۔ اکبر نے اس کتب خانہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی کچھ کتابیں شاہی کتب خانہ میں داخل کردیں اور کچھ ارباب علم کو دے دیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ "انوار المشکوٰۃ" کا نسخہ ان کے حصہ میں آیا تھا۔

گجرات مغلیہ سلطنت میں شامل ہونے کے بعد مغل بادشاہوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ عالمگیر کا اسے "زیب و زینتِ ہندوستان" کہنا ظاہر کرتا ہے کہ گجرات نے اکبر سے لے کر عالمگیر کے عہد تک علم و ادب اور صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی کی تھی۔

لیکن گجرات کے علاقہ میں جو کچھ علمی اور ثقافتی سرمایہ مسلم عہد میں جمع ہوا تھا اس کا بہت بڑا حصہ مرہٹوں کی تاراجی کے زمانہ میں برباد ہوگیا۔ پھر بھی گجرات کے کتب خانوں کے کچھ باقیات احمد آباد، بھڑوچ اور کھمبات وغیرہ کے صوفیوں، قاضیوں اور عالموں کے گھرانوں میں ابھی تک موجود ہیں۔ لکھا ہے کہ کچھ کتابیں احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں بھی محفوظ ہیں۔

ملخص مولوی ابوالحسنات ندوی کی کتاب ص ۷۷

بنگال

قیاس کہتا ہے کہ بنگال میں تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدرسے اور کتب خانے قائم ہو گئے ہوں گے کیونکہ اسی زمانہ میں محمد بختیار خلجی نے بنگال فتح کر کے شہر رنگ پور آباد کیا تھا اور یہاں مساجد، مدارس اور خانقاہیں بنوائی تھیں اس کے بعد گورنر بنگال غیاث الدین (۱۲۰۲-۱۲۲۷ء) نے لکھنوتی میں ایک عالیشان مسجد اور ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا لیکن یہاں کتب خانوں کی ترقی کی بنیاد ان کتابوں سے پڑی تھی جو شیخ سراج الدین عثمان متوفی ۷۵۰ھ) اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاء کے کتب خانے سے لائے تھے۔ شیخ سراج کے علاوہ اور بہت سے مشائخ مثلاً جلال الدین تبریزی، شیخ علاء الدین علاء الحق، ان کے صاحبزادے نور الحق المعروف بہ نور قطب عالم اور شیخ جلال مجرد سلہٹی نے اخلاق و علم کی شمعیں سارے بنگال میں روشن کر دیں اور اس علاقہ کی مذہبی اور سیاسی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بنگالہ میں اولیاء اور غازیوں کی اتنی بڑی تعداد آگئی تھی کہ قیاس ہوتا تھا کہ یہ صورت حال ضرور سلاطین دہلی کے بنگالہ کے متعلق کسی خاص سوچی ہوئی پالیسی[۱] کا نتیجہ تھی، اگر ان اولیائے کرام کے کتب خانوں کا ذکر مل جاتا تو ہم

---

[۱] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۳۶۳

یقین کے ساتھ یہ کہہ دیتے کہ چودھویں صدی عیسوی کے بنگال میں ۱۵۰ خانقاہی کتب خانے تھے کیونکہ اس وقت یہاں ۱۵۰ فقرا و صوفیہ[1] کی گدیاں موجود تھیں۔ ان باخدا لوگوں نے بقول ڈاکٹر ہنٹر اسلامی توحید و مساوات کا مژدہ اہل بنگال کو سنایا اور ایسی قوم کو بلا تامل اسلامی اخوت کے دائرے میں شامل کرلیا جو صدیوں سے ذلت و خواری کے دن کاٹ رہی تھی۔

دوسرے صوبوں کی طرح بنگال کے حکمراں بھی بدلتے رہے۔ محمد تغلق کے زمانے میں یہ صوبہ بھی دہلی کی مرکزی حکومت سے الگ ہوکر آزاد ہوگیا۔ اس کی خودمختاری کا خاتمہ شیر شاہ کے ہاتھوں ہوا اور ۱۵۷۶ء میں اکبر نے اسے سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا لیکن ہر دور میں یہاں مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے۔ ان میں ایک مدرسہ اور اس کا کتب خانہ موضع عمر پور کے قریب اس جگہ تھا جو اب "درس باڑی"[2] کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آثار باقیہ میں ایک کتبہ بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ یوسف شاہ کے زمانہ (۸۴۶ھ) میں تھا۔ اسی طرح ایک کتب خانہ مدرسہ استھی پور سے بھی ملحق ہوگا

---

[1] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۳۴۳

[2] بنگال کے مدارس کا حال نریندر ناتھ لا کی کتاب پرموشن آف لرننگ ان انڈیا ص ۱۰۶ سے لیا گیا ہے۔

اس مدرسے کے نشانات کا نام اب تک "مدرسہ ٹیلہ" ہے۔[۵۱]

لیکن مدرسہ گور کا کتب خانہ نہایت وسیع معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ مدرسہ بہت بڑا تھا اور اس کی خوبصورت عمارت سنگ مرمر و سنگ خارا سے بنی ہوئی تھی۔ مدرسہ کا بانی حسین شاہ تھا اس کے عہد (۱۴۹۳ - ۱۵۱۸ء) میں اور بھی مدرسے گور میں قائم ہوئے جن میں ایک مدرسہ کی نسبت خورشید جہاں نامہ کے مصنف الٰہی بخش حسینی نے لکھا ہے کہ وہ ریاض السلاطین کے مصنف غلام حسین کے مکان کے قریب تھا۔[۵۲]

بنگال کے خود مختار سلاطین میں حسین شاہ اور نصرت شاہ علم و فن کے بہت بڑے مربی تھے۔ ان کے عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کی بھی بڑی ترقی ہوئی۔ حسین شاہ نے بھگوت گیتا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ بنگالی میں کرایا۔ لیکن ایک قول یہ ہے کہ مہابھارت کا بنگالی میں سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ والی بنگال (۱۲۸۲ - ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا تھا۔ اور سے بنگال کے شاعر اعظم ودیا پتی نے اپنا ایک گیت منسوب کیا تھا۔ یہاں اس نکتہ کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بنگالی زبان کی ترقی کا سنگِ بنیاد بنگال میں مسلم دورِ حکومت میں رکھا گیا تھا ورنہ اس سے پہلے یہ زبان بقول سید سلیمان ندوی کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی

[۵۱-۵۲] نرندرا ناتھ لا کی کتاب ص ۱۰۶

جعفر خاں کا مدرسہ (کٹرہ) مرشد آباد

اور مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی نہ بویا گیا تھا۔

ڈھاکہ میں مدرسہ **شائستہ خاں کا کتب خانہ** بھی نہایت مشہور ہوگا اس لئے کہ امیر الامرا شائستہ خاں کا قائم کیا ہوا یہ مدرسہ اس زمانہ کے ممتاز مدارس میں شمار ہوتا تھا۔ شائستہ خاں یمین الدولہ آصف خاں وزیر کا لڑکا تھا۔ مختلف صوبوں میں وہ ناظم رہا۔ عالمگیر کے عہد میں بنگالہ کا حاکم ہوا جہاں کیا وہاں مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ڈھاکہ میں لب دریا ایک مدرسہ مع مسجد بنوایا جو ایک عرصہ دراز تک قائم رہا۔

مرشد آباد میں مدرسہ **جعفر خاں کا کتب خانہ** نہایت عالیشان ہوگا کیونکہ یہ مدرسہ بھی نہایت عالیشان کہا جاتا ہے اسے نواب مرشد قلی جعفر خاں (م ۱۷۰۴-۱۷۲۵ء) بانی شہر مرشد آباد نے قائم کیا تھا جو اپنی علمی قابلیت اور اہل علم کی سرپرستی کے لئے مشہور تھا لکھا ہے کہ ہر صبح قرآن کی کتابت کرتا اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے مکہ مدینہ اور دیگر مقامات مقدسہ بھیجتا تھا۔[1]

مرشد آباد میں علی وردی خاں کے زمانہ میں بہت سے کتب خانے ہوں گے اس لئے کہ وہ اہل علم کا بڑا مربی تھا اور اس کے دربار میں بہت سے علما و فضلا جمع ہوگئے تھے جن میں میر محمد علی، حسین خاں، علی ابراہیم خاں اور حاجی محمد خاں اور تقی قلی خاں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں

---

[1] نریندرا ناتھ لا کی کتاب ص ۱۱۲

میر محمد علی خاں کا کتب خانہ بہت بڑا تھا، جس میں دو ہزار[1] کتابیں تھیں۔

مرشد آباد میں نواب معین الدولہ کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا جس کے مہتمم احمد اللہ[1] اور تحویلدار اسد اللہ[2] تھے۔ اس کتبخانہ کی ایک کتاب شانتی نکیتن میں موجود ہے یہ معین الدین جوینی کی کتاب "نگارستان" کا قلمی نسخہ ہے جسے محمد حسین ابن محمد مظفر نے ۹۵۳ھ (۱۳۴۶ء) میں لکھا تھا۔

غرض اسی طرح عہد مسلم میں بنگال کے کونہ کونہ میں مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے اور جیسا کہ تاریخی حوالوں کے ساتھ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ایک لاکھ مدرسے گویا ایک لاکھ کتب خانے تھے۔

---

[1] نرندر ناتھ لا کی کتاب ص ۱۱۲

[2] رسالہ اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) ج ۲۰ ص ۱۲

بہار

بہار[1] زمانہ قدیم سے علوم ظاہری و باطنی کا مرکز رہا ہے۔ اسی سرزمین پر گوتم بدھ کو صداقت کا جلوہ نظر آیا تھا اور یہاں سے ہمہ گیر اور اس روحانی نہ وہ تحریک اٹھی تھی جو بدھ مت کے نام سے مشہور ہے۔ اس صوبہ کا دارالحکومت شہر پاٹلی پترہ (پٹنہ) بدھ مت کا وہ مقدس شہر ہے جو اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل شہنشاہ اشوک کے عہد میں مذہب اور علم کا بہت بڑا گہوارہ بنا ہوا تھا اور آج بھی یہاں کتب خانہ خدا بخش کی شکل میں علم و ادب کا وہ بیش بہا خزانہ موجود ہے جو ساری علمی دنیا کے لئے باعث افتخار ہے۔

جب بختیار خلجی نے بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بہار فتح کیا تو اس وقت اس کی علمی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی۔ اس عظیم فاتح نے یہاں متعدد مسجدیں اور مدرسے قائم کئے جن کے اثر سے اس علاقے میں توحید اور علم کے چرچے ہونے لگے اور درس و تدریس اور کتابیں جمع کرنے کے شوق کو پھولنے پھلنے کے لئے ایسی فضا مل گئی جس کی تصویر اس تحریر میں نظر آتی ہے:-

---

[1] بہار کی مفصل تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بہار، مرتبہ مولوی فصیح الدین بلخی، شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۶۳ء۔

"بہار میں عموماً یہ صورت رہی ہے کہ اکثر رؤسا و امراء علم و فن کی دولت کے ساتھ زر و مال سے بھی مالا مال ہوتے تھے اور وہ ضروریات دنیوی سے بے نیاز رہ کر اپنے کاشانوں میں بیٹھے ہوئے تعلیم و تدریس کے ذریعہ سے علم و فن کی بہترین خدمات انجام دیتے تھے اور جو امراء اہل علم نہ تھے وہ اپنی معاصرانہ عزت برقرار رکھنے کے لیے علما اور فضلا کو اپنے دامن دولت سے وابستہ رکھتے تھے۔ طلبا کے لیے وظائف اور جاگیریں مقرر کرتے تھے اور وہ اس کار خیر کو نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ آج بھی اس مقدس رسم کی یادگاریں بہار میں موجود ہیں۔"

ایسے ماحول میں کیسے کیسے اہل علم، اور کتنے مدرسے اور کتب خانے ہوں گے ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ مولوی ابوالحسنات ندوی نے اپنی کتاب میں ان ممتاز علما و فضلا کے نام دیے ہیں جو بہار کے مختلف شہروں میں علم کی خدمت کر رہے تھے۔ مثلاً بہار میں شاہ شرف الدین احمد یحییٰ، سہسرام میں مولوی سلیم اللہ اور شاہ کبیر الدین، ڈیانواں میں مولوی شمس الحق محدث، محی الدین پور میں مولانا تلطف حسین، نگرنہسہ میں مولانا علیم اللہ اور مولانا علیم الدین، استھانواں میں مولانا حافظ وحید الحق، دیسنہ میں مولانا مصطفےٰ شیر اور مولانا محمد یعقوب سرچشمۂ علوم تھے لیکن افسوس کہ ان کے کتب خانوں کو اہل قلم قید تحریر میں نہ لائے اور بہار کے قدیم مدارس وغیرہ کے کتب خانوں کا حال بھی انھوں نے نہیں لکھا۔

مثلاً مدرسہ داناپور اور اس کی مسجد کی عمارتوں کے متعلق تو لکھا ہے کہ شان کی خوش وضعی کو وہاں کی کوئی دوسری عمارت نہیں پہنچ سکتی مگر اس مدرسہ کے کتب خانہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

خانقاہ شاہ کبیر کا کتب خانہ

لیکن سہسرام کی خانقاہ شاہ کبیر الدین کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے ایک عظیم الشان مدرسہ ملحق ہے جس کے کتب خانہ کی مالیت تخمیناً یک لاکھ روپیہ تھی یہ کتب خانہ تو اب اتنا وسیع نہ رہا لیکن مدرسہ اب بھی باقی ہے اور سیکڑوں طالب علم اس سے فیض پا رہے ہیں۔

خانقاہ منیر کا کتب خانہ

یہ کتب خانہ اب بھی اہل ذوق کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے اس میں عربی اور فارسی مخطوطات کافی تعداد میں ہیں خصوصاً تصوف کی کتابوں کا نہایت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ مرزا غالب کے دوست اور شاگرد شاہ فرزند علی صوفی منیری کی کئی تصانیف بھی یہاں محفوظ ہیں۔

خانقاہ اسلام پور کا کتب خانہ

اسلام پور ضلع پٹنہ میں ایک مشہور مردم خیز قصبہ ہے یہاں کی خانقاہ کے کتب خانہ میں ہزاروں کتابیں مدت دراز سے محفوظ چلی آرہی ہیں۔ قلمی کتابوں کی تعداد بھی کئی ہزار کے قریب ہو گی۔ شاہ حمید الدین احمد عرفان وہاں کے مشہور علم دوست سجادہ نشین گذرے ہیں جو نہایت اچھے شاعر تھے ان کی علم نوازی سے اس کتب خانہ کو بہت فائدہ پہنچا۔

خانقاہ پھلواری کا کتب خانہ

پھلواری شریف میں یہ خانقاہ علم و معرفت کا بہت بڑا سرچشمہ ہے جس کی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ اس کے سجادہ نشین ہمیشہ صاحب درس علماء رہے جن کی وجہ سے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسی اعتبار سے یہاں کے کتب خانہ کی وسعت اور خوبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس میں ہزاروں نفیس قلمی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پھلواری شریف میں اور بھی کتب خانے ہیں مثلاً کتب خانہ شاہ سلیمان قادری اور کتب خانہ شاہ محمد شعیب۔

بہار شریف کے کتب خانے

بہار شریف کا ذکر کاغذ سازی کے سلسلے میں پہلے آچکا ہے۔ کاغذ سازی کے علاوہ تعلیم کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی تعلیم گاہوں میں مدرسہ عزیزیہ اور مدرسہ اسلامیہ بہت مشہور ہیں۔ ان مدرسوں کے ساتھ وسیع کتب خانے بھی ہیں۔ بہار شریف میں چھوٹی بڑی کئی خانقاہیں ہیں، اور ہر خانقاہ میں ایک کتب خانہ ہے جو قلمی کتابوں اور نوادر سے بھرا ہوا ہے۔

پٹنہ کے کتب خانے

صوبہ بہار کا مرکزی شہر پٹنہ جو عظیم آباد کے نام سے بھی موسوم ہوا اپنے کتب خانوں اور مدرسوں کے باعث بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے پرانے اداروں میں مدرسہ پٹنہ اور سعید خاں کا مدرسہ مشہور ہیں۔ اول الذکر کے متعلق لکھا ہے کہ عظیم آباد میں ایک محلہ ہی مدرسہ مسجد کے نام سے موسوم ہے

مسجد کی عمارت اب تک قائم ہے جس سے مدرسہ کی وسعت و شان کا پتہ چلتا ہے ان مدارس کے علاوہ پٹنہ کے خانقاہی اور ذاتی کتب خانوں میں بھی ایک زمانہ سے نفیس و نادر کتابیں محفوظ چلی آرہی ہیں مثلاً **کتب خانہ خانقاہ عمادیہ** (منگل تالاب پٹنہ سٹی) اپنے عربی و فارسی مخطوطات کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ **کتب خانہ درگاہ حضرت عشق** (میتن گھاٹ پٹنہ سٹی) میں بڑی علمی اور نفیس کتابیں محفوظ ہیں۔ **کتب خانہ شاہ محمد قائم قتیل** داناپوری میں تصوف کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ **کتب خانہ مولانا ظفر الدین** قادری اسلامیات کا بڑا نادر اور نفیس خزانہ ہے۔ پٹنہ میں **خدا بخش لائبریری** کے علاوہ ایک مارواڑی **جالان صاحب کا میوزیم** بھی ہے جس میں نہایت قیمتی مخطوطات اور تاریخی و علمی نوادر محفوظ ہیں۔

اور لائق ذکر بات یہ ہے کہ مغلوں کے دور زوال میں بھی پٹنہ کی علمی اور ادبی رونقیں نتی بڑھ گئی تھیں کہ اورنگ زیب کا پوتا شہزادہ محمد عظیم الشان اسے سلطنت مغلیہ کی دوسری دہلی بنانا چاہتا تھا اگر اس عہد کی علم دوست شخصیتوں اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو پٹنہ کے ہر بڑے لکھے شخص کے پاس ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ ملے گا جس میں ادب اور شعر و شاعری کی کچھ کتابیں ضرور ہوں گی اس زمانہ میں دہلی کے پرآشوب ماحول سے تنگ آکر بہت سے شعرا اور ادیب وغیرہ دہلی سے مرشد آباد اور عظیم آباد آگئے تھے جہاں علی وردی خاں[1]

---

[1] عظیم آباد کی چند گراں قدر شخصیتوں کا حال ڈاکٹر سید محمد حسین کی کتاب "مرزا محمد علی فدوی" میں ملاحظہ کیجئے (مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ ۱۹۵۶ء)

اور اس کا داماد زین الدین احمد ہیبت جنگ ان کے سرگرم معاون اور سرپرست
ہیں یہ دونوں اپنی علم دوستی اور فیاضی کے لئے مشہور تھے۔ لکھا ہے کہ ہیبت جنگ
کا کتب خانہ نہایت اچھا تھا اور اس کی کتاب داری کی خدمت لالہ اجاگر چند
الفت کے سپرد تھی۔ ہندوؤں میں مہاراجہ شتاب رائے کا کتب خانہ بھی
بہت عمدہ تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کتب خانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ ہندو اور مسلمان کتابیں جمع کرنے کی کیسی لگن رکھتے تھے اس زمانہ میں ان دونوں کے
تعلقات بھی اس قدر خوشگوار تھے کہ جب ایک شاعر راجہ رام نرائن نے ہیبت خاں کے
لڑکے سراج الدولہ کے دردناک قتل کی خبر سنی تو نہایت متاثر ہو کر کہا: ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی ÷ دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

شیرشاہ سوری اور کتب خانے | صوبہ بہار کے شہر سہسرام کے ساتھ
شیرشاہ سوری (متوفی ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء) کا ذکر بے محل نہ ہوگا اس لئے کہ یہی شہر اس کا
مولد و مدفن ہے۔ شیرشاہ نے اپنی پانچ سالہ حکومت میں بھی مدرسوں اور کتب خانوں
کو فراموش نہیں کیا۔ ہمارے خیال میں خود شیرشاہ کے پاس تاریخ کی کتابوں
کا نہایت اعلیٰ ذخیرہ ہوگا۔ اس علم دوست فرماں روا کو عربی، فارسی،
فقہ اور تاریخ میں مہارت تامہ حاصل تھی مگر تاریخ سے اس کو خاص شغف
تھا۔ شیرشاہ نے نارنول میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جسکی عمارت بہت بڑی اور
شاندار تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدرسہ نارنول کا کتبخانہ نہایت عالیشان تھا۔ شیرشاہ
کے دادا ابراہیم سوری کی قبر نارنول میں ہے۔ لکھا ہے کہ انکے انتقال کے موقع پر بطور کار خیر یہ مدرسہ
شیرشاہ نے بنوایا تھا اور مقبرہ و مدرسہ کی تعمیر پر ایک لاکھ سے زائد روپیہ صرف کیا تھا۔

۵؎ نارنول اب ریاست پٹیالہ میں شامل ہے۔

یوپی

یوپی کی صبح بنارس اور شام اودھ تو آج تک مشہور ہیں لیکن نوابین اودھ کے کتب خانوں اور امان اللہ بنارسی کی درس گاہ کو دنیا بھولتی جا رہی ہے۔ اس زمانہ کے تعلیمی نظام اور کتب خانوں کے قیام میں حکومت اور اشخاص دونوں کا ہاتھ تھا بادشاہ اور امراء کی طرف سے ایسے علماء کی قدر و منزلت اور مالی امداد کی جاتی تھی جو اپنی زندگیاں تعلیم کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ چنانچہ سرکاری مدرسوں کے علاوہ ہر صاحب درس عالم ایک دار العلوم تھا۔ الہ آباد میں شیخ محب اللہ، قاضی محمد آصف، شیخ محمد افضل؛ بنارس میں مولوی امان اللہ؛ غازی پور میں مولانا فصیحی اور مولانا عبد اللہ؛ جائس میں ملا محمود؛ چڑیا کوٹ میں مولانا عنایت رسول؛ خیرآباد میں مولانا فضل امام اور ان کے صاحبزادے مولانا فضل حق؛ دیوا میں مولانا عبد السلام؛ سندیلہ میں مولانا حمد اللہ؛ گوپامئو میں شاہ خیر اللہ اور قاسی مبارک وہ گراں قدر شخصیتیں تھیں جن کے دماغ کتب خانوں کی طرح علم و فضل کے خزانے تھے۔

قرونِ وسطیٰ کے یوپی میں جابجا مدرسوں کا ہونا کتب خانوں کے وجود کی بہت بڑی دلیل ہے اس سلسلہ میں پہلی نظر بدایوں پر پڑتی ہے جو عہد قدیم سے مرکزِ علم رہا ہے۔ یہ ہندوؤں کے عہد میں وید کی تعلیم گاہ

ہونے کی بنا پر وید امئو کے نام سے موسوم تھا۔ عہد اسلام کے اولین دور میں ہی یہاں سلطان التمش نے جامع مسجد اور مدرسہ معزی تعمیر کرائے تھے اس شہر کی خاک سے بڑے بڑے صلحا اور ممتاز فضلا مثلاً حضرت نظام الدین اولیا، ان کے استاد علاء الدین اصولی، ضیاء الدین نخشبی، شہاب الدین مہرہ، ملا عبد القادر بدایونی اور دوسرے اکابر اٹھے جو اپنے فیض سے تعلیم گاہوں اور کتب خانوں کو مالا مال کر گئے۔

یوپی کے علمی مراکز میں آگرہ، جونپور، بلگرام، لکھنؤ، رام پور، اعظم گڑھ فرخ آباد اور بریلی وغیرہ نے بھی بڑا نام پایا۔ عہد مغلیہ میں آگرہ تعلیم کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اس کی تعلیم گاہوں کے لئے فاضل اساتذہ شیراز تک سے آیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہاں بکثرت مدرسے قائم ہوئے جن میں مدرسہ شیخ زین الدین خوافی، مولانا علاء الدین لاری کا مدرسہ خس مدرسہ جہاں آرا بیگم، فتح پور سیکری میں مدرسہ اکبر بادشاہ اور مدرسہ ابو الفضل بہت مشہور ہیں۔ اسی قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس یوپی کے تقریباً ہر شہر میں موجود تھے مثلاً غازی پور میں مدرسہ چشمۂ رحمت، رامپور میں مدرسہ عالیہ، امروہہ کے قریب دارانگر میں مدرسہ نجیب الدولہ، فرخ آباد میں مدرسہ فخر المطابع و مدرسہ نواب محمد خاں بنگش اور بریلی، شاہجہاں پور، پیلی بھیت وغیرہ میں حافظ الملک رحمت خاں کے مدارس کا فیض جاری تھا۔ یہ سب درس گاہیں علم کے طلبگاروں اور کتابوں سے بھری

ہوئی تھیں. صرف حافظ رحمت خاں کے مدارس میں درس و تدریس کے لئے پانچ ہزار علماء مقرر تھے اور ان سب اساتذہ اور طلباء کی علمی ضرورتیں مدارس کے کتب خانے پوری کر رہے تھے۔

جون پور یو پی کا تاریخی شہر جونپور کتب خانوں کے لحاظ سے بھی نہایت ممتاز رہ چکا ہے۔ "ریاض جونپور" اور دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد بہ عہد بہت سے مدارس قائم ہوئے جن کے ساتھ کتب خانے اور بورڈنگ ہاؤس بھی تھے ان میں سے ۲۹ مدرسے گویا **۲۹ کتب خانے** محمد شاہ کے زمانہ تک تھے۔ جن میں پہلا نام ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۹ھ۔ ۱۴۴۵ء) کے مدرسہ کا ہے آپ تیموری حملہ کے بعد دہلی سے جونپور آگئے تھے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی آپ کے فیض کمال سے پورب کی ساری زمین لہلہا اٹھی تھی قاضی صاحب نے درس دئے "بدائع البیان" اور "حاشیہ کافیہ" جیسی کتابیں لکھیں۔ جونپور کی مشہور و معروف مسجد اٹالہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہی قاضی موصوف کا مدرسہ تھا اس مسجد کی تعمیر خواجہ کمال خاں نے ۱۳۷۷ء میں شروع کرائی اور اس کی تکمیل ۱۴۰۸ء میں ہوئی۔

جون پور فیروز تغلق نے اپنے چچازاد بھائی فخر الدین جونا (سلطان محمد بن تغلق) کے نام پر آباد کیا تھا جب ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں ملک سرور المعروف بہ خواجہ جہاں نے ایک آزاد خود مختار ریاست "شرقی سلطنت" کے نام سے قائم کی تو یہ شہر اس کا پایہ تخت بنا۔ خواجہ جہاں

محمود تغلق کی طرف سے اس کی سلطنت کے شرقی علاقہ کا گورنر تھا۔ اسی نے "ملک الشرق" کا خطاب اسے عطا کیا تھا۔ تیموری حملہ کے بعد وہ خود مختار ہوگیا اس کے جانشینوں میں سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے محمود شرقی کا زمانہ (۱۴۰۱ء - ۱۴۵۰ء) شرقی سلطنت کا سنہرا عہد ہے۔ اس دور میں نہ صرف جونپور ہندوستان کا بغداد بن گیا تھا بلکہ پوری سلطنت کتب خانوں، مدرسوں اور مسجدوں سے معمور ہوگئی تھی۔ سلاطین شرق کے بعد جونپور لودیوں کے قبضہ میں آیا جنھوں نے اسے خوب تباہ و برباد کیا مگر مغلیہ عہد میں اس علاقہ کا علمی مرتبہ پھر اتنا اونچا ہوگیا کہ شاہجہاں اسے شیراز ہند کہا کرتا تھا۔ اکبری عہد میں جونپور کے گورنر **منعم خاں کا کتب خانہ** بھی بہت سی نفیس کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس علم دوست شخص نے رفاہ عام کے کام بھی انجام دیئے۔ جب اکبر جونپور سے گذرا تو اس کی یادگار میں گومتی کا پل تعمیر کرایا جو اب تک اکبری پل کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کتابیں جمع کرنے کا بڑا شائق تھا اور اس مد پر نہایت فیاضی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے "کلیات سعدی" کے ایک نسخہ کے بدلے میں پانچ سو روپیہ انعام میں دیئے تھے اس سلسلے میں منعم خاں خود لکھتا ہے:-

"ایں کلیات حضرت شیخ سعدی قدس سرہ را آں عزیز بہادر خاں
در بلدۂ پر سرور جونپور بدیں فقیر فرستادہ بود، پانصد روپیہ انعام شد"

لہ اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) ج ۱۹ ص ۳۳۷

در تاریخ نہ صد ہفتاد و شش (۹۷۶) عدد اوراق ایں کتاب سی صد و نود و چہار است عدد ابیات و سطورش از متن و حاشیہ نوزدہ ہزار و ہفت صد، حاشیہ چہار ہزار و ہفت و صد و بست و ہشت است، مشتمل بود دائم و دیباچہ مصور و چہار لوح شیرازی۔"

شاہجہاں کے عہد میں جونپور کے قاضی **ابوالبقیٰ کا کتب خانہ بھی** نہایت قیمتی کہا جاتا ہے۔ انھیں خدا نے کتابیں جمع کرنے کے شوق کے ساتھ غیر معمولی حافظہ بھی عطا کیا تھا۔ ایک مرتبہ شاہجہاں نے انھیں ایک ایسی کتاب اصلاح کے لئے دی جس کے حرف جگہ جگہ سے خراب ہو گئے تھے، قاضی صاحب نے اسے پڑھ کر اپنے کتب خانہ میں کہیں رکھ دیا۔ جب بادشاہ نے کتاب طلب کی اور تلاش کرنے کے بعد بھی کہیں نہ ملی تو انھوں نے صرف اپنے حافظہ کی مدد سے ساری کتاب از سرِ نو لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دی۔

غرض ایسے اہل کمال اس زمانے میں جونپور میں جمع ہو گئے تھے جن کے دماغ حقیقتاً کتب خانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ دورِ آخر کے کتب خانوں میں **مولوی معشوق علی خاں کا کتب خانہ** نہایت اعلیٰ تھا اس میں پانچ ہزار کتابیں تھیں جن میں زیادہ تر فقہ اور اخلاقیات پر تھیں چونکہ ان ہی دو مضامین سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ باعتبار درس و تدریس مولوی صاحب کا مرتبہ نہایت بلند تھا ان کے پاس ہر وقت طالب علموں کا مجمع لگا رہتا تھا انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں

ایک کا نام "تحفہ طفیفہ" ہے۔ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں معشوق علی وفات پا گئے مگر ان کا کتب خانہ جون پور کی گذشتہ علمی شان و شوکت کی ایک اہم یادگار تھا جسکی تعداد کتب آج تک بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کے دور زوال میں بھی جونپور کے کتب خانے ہزاروں نایاب کتابوں سے معمور تھے۔

کچھوچھا فیض آباد کے ضلع میں کچھوچھا ایک مشہور قصبہ ہے جہاں آج سے سیکڑوں برس پہلے تقریباً ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء) میں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی ؒ متوفی (۱۴۰۵ء) نے کتب خانۂ اشرفیہ قائم کیا تھا جو آپ کی حیات ہی میں علم معقول و منقول سے مزین در تاریخ و تصوف کی بیش بہا کتابوں سے آراستہ ہو گیا تھا۔ حضرت اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم اور برگزیدہ صوفی تھے۔ آپ نے ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) میں اخلاق و تصوف پر ایک رسالہ لکھا۔ یہ قلمی کتاب بقول حامد حسن قادری ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کم و بیش بارہ کتابیں تصنیف کیں جن کا ذکر "لطائف اشرفی" میں ملتا ہے۔ آپ کے خلفاء نے بھی آپ کی اس سنت کو اپنایا اور "بحر مواج" اور "بحر ذخار" جیسی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔

حضرت مخدوم نے اپنی سو سالہ زندگی میں خوب سیر و سیاحت کی۔ ہندوستان اور بلاد شرقیہ کے گوشے گوشے میں علم و معرفت کی روشنی پہنچائی اور ہر جگہ سے علمی نوادر جمع کرتے رہے۔ علم کی جستجو اور حقیقت کی

تلاش نے حضرت کے ذہن میں کتب خانے کے قیام کا خیال پیدا کیا چنانچہ آپنے ہندوستان کے علاوہ سمنان، بغداد، دمشق، یمن، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بصرہ سے کتابوں کا خاصا ذخیرہ فراہم کیا۔ امراء حضرت کے مذاق علمی کو دیکھ کر اہم کتابوں کا تحفہ بھیجتے تھے اور علماء اصلاح و نظر ثانی کیلئے اپنی گراں قدر تصانیف کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ایک موقع پر اپنی تصنیفات کے علاوہ بعض نادر کتابوں کو بھی حضرت مخدوم کی خدمت میں بھیجا اور ایک عرصہ تک مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا جس کی چند جھلکیاں "مکتوبات اشرفی" میں بھی ملتی ہیں۔

حضرت مخدومؒ کی وفات کے بعد حضرت عبدالرزاق نورالعین (المتوفی ۸۷۲ھ) منصب سجادگی پر فائز ہوئے۔ انھوں نے اپنے عہد میں کتب خانہ اشرفیہ کی خاص طور پر توسیع کی اور اس میں بیشتر کتب تاریخ و تصوف کا اضافہ کیا۔ حضرت نورالعین کے زمانہ میں لوگ دور دور سے تحصیل علم و معرفت کے لئے جمع ہونے لگے جس کی بناء پر کتب خانہ کی افادی حیثیت اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب حضرت شاہ حسن خلف اکبر حضرت نورالعین (المتوفی ۸۹۸ھ) نے لباس سجادگی زیب تن فرمایا تو اس وقت کتابوں کی مجموعی تعداد ساڑھے چھ ہزار تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کتب خانہ زمانے کے الٹ پھیر کے ساتھ مختلف سجادگان میں منتقل ہوتا رہا اور اسی درمیان میں ایک ایسا بھی وقت آیا کہ حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کی شاندار روایت کی روشنی مدھم پڑ گئی اور کتبخانہ کا

بڑا حصہ ناقدری اور ناشناسی کا شکار ہو گیا۔ اور ایک طویل مدت تک یہ حفاظت و نگرانی سے محروم رہا۔

تیرھویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں حضرت مولانا سید شاہ علی حسین اشرفی سجادہ نشین سرکار کلاں نے ایک بار پھر خاندانی وقار کو بلند کیا اور حضرت مخدوم کی سنت عالیہ کو زندہ کرنے میں پوری تن دہی کے ساتھ دلچسپی لی۔ بقول میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم "حضرت اشرفی میاں کی تاریخی اہمیت خانوادۂ اشرفی میں وہی ہے جو بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کو حاصل تھی"۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت اشرفی میاں نے خاندانی اختلال وجمود کو دور کرنے کے جو عملی منصوبے بنائے اور جس طرح عامۃ الناس کو صراط مستقیم پر لانے کے لئے ان کی قیادت و رہنمائی کی اور جس انداز سے انھوں نے قومی کردار و سیرت کی تعمیر و تخلیق میں حصہ لیا وہ مقدمۂ لطائف اشرفی، وظائف اشرفی، صحائف اشرفی اور مجلہ اشرفی کے مختلف شماروں کے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے تحصیل علم کے لئے "جامعہ اشرفیہ" کی بنیاد رکھی اور لوگوں میں دینی تعلیم کا جذبہ پیدا کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے کتبخانہ اشرفیہ کی بھی اصلاح فرمائی اور مختلف مقامات سے نادرات منگوائے۔ حضرت اشرفی میاں نے اپنے ذاتی مصارف سے اشرفی پریس قائم کیا جس میں بعض نادر کتابیں طبع ہوئیں اور ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۸ء اسی پریس سے "مجلہ اشرفی" نکلتا رہا، جس کی ادارت کے فرائض حضرت مولانا ابو المحامد سید محمد محدث نے بحسن وخوبی

انجام دئے۔ اسی مجلہ کے ذریعہ لطائف اشرفی کا اردو ترجمہ بالاقساط پیش کیا گیا ترجمہ کا کام حکیم مولانا سید نذر اشرف فاضل نے کیا بعض ناگزیر حالات کی بنا پر وہ صرف نو لطائف کا ترجمہ کر سکے جو آج ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی موجود ہے۔ حضرت اشرفی میاں نے والیان ریاست کو بھی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی جانب متوجہ کیا چنانچہ انھیں کی تحریک پر نواب کلب علی خاں ریاست رام پور نے ۱۲۹۷ھ میں "لطائف اشرفی" کی طباعت کرائی اور نواب میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد نے چند نادر کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ غرض کتابوں کی اصلاح و نقل اور طباعت سے کتبخانہ اشرفیہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا۔ حضرت اشرفی میاں کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے عربی اور فارسی کی طرح اردو سیکشن کو بھی ترقی دی چنانچہ اردو کے شعراء کے دواوین کے علاوہ مذہب، تصوف، فلسفہ، کلام، تاریخ اور طب کا بھی جس قدر سرمایہ انھیں اردو زبان میں دستیاب ہوا وہ سب کتبخانے کی زینت بن گیا۔ غالباً یہ بات لطف سے خالی نہ ہوگی کہ دیوان ولی کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۰ھ جو اس کتبخانہ میں ہے اپنے بعض اندرونی شواہد کی بنا پر ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک دیوان ولی کو مولانا احسن مارہروی اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مرتب کیا ہے۔ ان دونوں مطبوعہ دیوان میں ولی دکنی کے درج ذیل شعر کا اندراج اس طرح ہے:

"مرد کا اعتبار کھوتی ہے ● مفلسی سب بہار کھوتی ہے"

لیکن کتب خانہ اشرفیہ کے قلمی نسخۂ دیوان ولی میں مرد کے بجائے عشق لکھا ہے۔ اس طرح کے اور بھی تھوڑے بہت اختلافات ہیں جو قلمی نسخۂ ہذا کی شعری بلاغت کو نمایاں کر کے اس کی صحت کی غمازی کرتے ہیں۔

حضرت اشرفی میاں کے وصال کے بعد جب منصب سجادگی حضرت مولانا محمد مختار اشرف کو ملا تو انھیں یکایک زمانے کی مختلف کش مکش سے دوچار ہونا پڑا اور ان گوناگوں افکار و علائق نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کتب خانے کی طرف ملتفت ہوتے۔ بہرحال انکا یہی اقدام کیا کم اہم ہے کہ انھوں نے کتب خانے کو "قومی ملکیت" قرار دے کر اپنے ذاتی تصرفات سے اسے علیحدہ کردیا ہے۔ ان کے فرزند مولوی سید اظہار اشرف نے ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی جس میں بلاتفریق مذہب و ملت لوگوں کو شریک کیا۔ رائے عامہ نے انھیں کتب خانے کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا ہے اور اب وہ اس کمیٹی کے ذریعہ ترقی کے منصوبے بناتے اور انھیں عمل میں لاتے ہیں۔

کتب خانہ اشرفیہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مجموعی تعداد کم و بیش دس ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ قلمی کتابوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ ہے جن میں اکثر نہایت نادر ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ادب اور طب کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے اور ان حقائق کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مشائخ کرام نے اپنی خانقاہی زندگی میں دین و مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ علم و ادب کی کیسی کیسی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں۔

لکھنؤ

آج سے تقریباً پانچ سو برس پہلے جون پور کی بزم علم کے ایک فاضل شیخ اعظم نے لکھنؤ میں مسند درس بچھا کر اسے علم و فضل کا مرکز بنایا تھا اور اسی زمانہ میں یہاں کتب خانوں کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کے قیام نے ان کو نمایاں ترقی دی اور پھر نوابین اودھ کے عہد میں یہ شہر کتابوں کا مخزن و ماٗمن بن گیا اس زمانہ میں چاروں طرف سے کتابی دولت سمٹ کر یہاں پہنچ رہی تھی۔

شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کے بیش بہا ذخائر لوٹ مار سے بچ بچا کر یہیں آ گئے تھے نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کا کتب خانہ بھی یہاں منتقل ہو گیا تھا۔ اس پُر آشوب دور میں ہر کس و ناکس لکھنؤ کی طرف کھچا چلا آتا تھا، اس لئے کہ یہاں امن و امان تھا، دولت کی فراوانی تھی اور نوابین اودھ فیاض اور علم و فضل کے قدردان تھے۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے جو لوگ لکھنؤ آئے وہ اپنا کتابی سرمایہ بھی ساتھ لاتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ دہلی سے بہت سی نادر کتابیں اپنے ساتھ یہاں لائے اور اپنا ایک ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ لکھا ہے کہ سلیمان شکوہ نے لکھنؤ کی سرزمین میں چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی۔ دلی سے جو جاتا پہلے اسی سرکار میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ غرض لکھنؤ میں شاہی ذاتی اور تعلیمی کتب خانے بے شمار تھے مثلاً فرنگی محل کا کتب خانہ، مولوی سبحان علی خاں اور دیگر اکابر کے کتب خانے، علمائے شیعہ میں سید دلدار علی اور علامہ تفضل حسین خاں کے کتب خانے ہر اعتبار سے بے نظیر کہے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ شہر کتب خانوں کے اعتبار سے اتنا ممتاز ہو گیا تھا کہ علامہ شبلی نے لکھنؤ کے ایک حکیم مسیح الدولہ علی حسن خاں بہادر کے کتب خانہ کی باقیات دیکھ کر کہا تھا کہ ایسا نایاب ذخیرہ مصر و شام میں بھی نہ ہوگا۔

لکھنؤ کی زرخیز سرزمین میں کتب خانوں کے ساتھ کتابت کا فن بھی خوب پھولا پھلا۔ نوابین اودھ کے عہد میں عبدالرشید دیلمی کے شاگرد حافظ نور اللہ اور قاضی نعمت اللہ کی استادی کا سکہ لکھنؤ میں جاری تھا اور ان کے شاگردوں میں ایسے باکمال خطاط پیدا ہوئے جو خود استاد کہلائے۔ ان میں حافظ نور اللہ کے بیٹے حافظ ابراہیم کے دو شاگرد

منشی سنسارام کشمیری اور منشی ہادی علی بہت نامور ہوئے۔ اس زمانہ میں کتابت کے لیئے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے گلستاں کا ایک نسخہ لکھوانے کے لیئے حافظ نور اللہ کو ۸۰ گڈی (رم) کاغذ، ہزاروں قلموں کے نیزے اور ایک سو قلم تراش دیئے تھے۔ حافظ نور اللہ کی نسبت عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ "لکھنو والے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعوں کو موتیوں کے داموں مول لیتے یہاں تک کہ ان کی معمولی مشق بازار میں صرف ایک روپیہ کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی"۔

کتب خانوں کے علاوہ لکھنؤ میں شعر و شاعری اور بالخصوص مرثیے نے بڑا فروغ پایا۔ نوابین اودھ کے زیر سایہ یہاں کی سرزمین شاعروں کے دلکش ترانوں اور پُرلطف نواسنجیوں سے مست و معمور ہو رہی تھی اور یہ شہر ارباب نشاط کی وجہ سے باغ رہا بنا ہوا تھا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ان فرماں رواؤں نے اپنے مشاغل نشاط کے ساتھ ساتھ علم و فن کی بھی دل کھول کر سرپرستی کی اور کتابیں جمع کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ کہا ہے کہ نوابین اودھ کے کتب خانوں میں مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات کی تقریباً تین لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سات سو کتابیں تھیں۔ ان کے علاوہ ہندوستانی، ایرانی، ترکی اور یوروپی تصاویر کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے اتنی کثیر تعداد میں تھے کہ ان کے دیکھنے کے لیئے عمر نوح درکار تھی۔

شاہی کتب خانے کے علاوہ واجد علی شاہ کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جو فرح بخش محل میں تھا اس میں مصوری، نقاشی اور خطاطی کے رنگارنگ نمونے واجد علی شاہ کے حسن ذوق کی عکاسی کر رہے تھے۔ لیکن اودھ کے اس آخری تاجدار کے معزول و جلاوطن ہو جانے کے بعد نوابین اودھ کے کتب خانوں میں ابتری پھیل گئی اور غضب یہ ہوا کہ خود انکے

ناظم و نگراں ان کی بربادی کا سبب بن گئے۔ ان کارکنوں کی خیانت کا یہ عالم ہو گیا کہ وہ کتب خانہ سے قیمتی کتابیں نکال لیتے اور ان کی جگہ معمولی کتابیں داخل کر کے تعداد کتب پوری کر دیتے تھے۔ ایک ناظم نے تو اپنی لڑکی کی شادی کے وقت کچھ کتابیں دس ہزار روپے میں فروخت کر دیں اس کے بعد جو کتابیں بچ رہیں ان میں سے بہت سی سیاسی ہنگاموں میں تلف ہو گئیں اور کچھ اِدھر اُدھر چلی گئیں۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔ یہ کم نصیب نواب اپنے باپ امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ۱۸۴۷ء میں اودھ کے تخت سلطنت پر بیٹھا اور نو سال حکومت کرنے کے بعد مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا اور وہیں ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔ واجد علی شاہ اختر شعر و شاعری، رقص و موسیقی کا بے حد شائق اور فطرتاً حسن پرست تھا۔ اگرچہ وہ عیش و عشرت کی طرف بہت زیادہ مائل رہا لیکن اس کے باوجود اس کا اردو ادب میں بڑا درجہ ہے اس نے شعرا اور اصحاب فن کی سرپرستی کی۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، سلام، مرثیہ، رباعی سب ہی کچھ لکھا۔ اس کی ٹھمریاں آج بھی اودھ میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ غزلوں کے چھ دیوان اور بہت سی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ مثنوی "حزن اختر" سب سے بہتر ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنی تصانیف کی تعداد ۱۴ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں" اس فرماں روا کے کتابیں تصنیف کرنے کا طریقہ "مرزا محمد علی نے اپنی کتاب چند ہمعصر میں یوں بیان کیا ہے:-

"واجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے وہاں اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لئے اسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ

نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیے ہیں غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز انکے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں خیال کرتے تھے۔"

لیکن موصوف کی کتاب "بنی" کو نہایت نایاب تصنیف کہا جاتا ہے۔ ۱۴۰ صفحات کی یہ کتاب مختلف موضوعات[۱] پر مشتمل ہے اس میں واجد علی شاہ نے لکھا ہے:-

"... خیر شاہ و آخر او دھ۔ یہ فقیر حقیر راقم و مصنف و مولف سراپا تقصیر ہے پندرہ برس کے سن میں والد جنت مکان نے ولیعہد اور وزیر کیا۔ بیس برس کے سن میں تخت اودھ بجائے حضرت اعلیٰ قائم ہوا۔ تیس برس کے سن میں بلا سبب در ظلم و ناانصافی و بے آزاری رعیت بے سبب تخت سے محروم کیا گیا۔ بیس برس سے کلکتہ محلہ موچی کھولہ ملقب بہ مٹیا برج میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا چھبیس مہینے قلعہ ولیم فورٹ کلکتہ میں ناحق قید رہا۔ ساٹھ سے اوپر اوپر ماشاء اللہ چشم بد دور ذکور و اناث ہیں۔"

اس کے علاوہ واجد علی شاہ کی بہترین تصنیف وہ خطوط ہیں جو انھوں نے جلاوطنی کے زمانہ میں کلکتہ سے اپنی پیاری بیوی اکلیل بیگم معروف بہ ممتاز جہاں کو لکھے جو خلوص حقیقت اور زبان کی چاشنی سے لبریز ہیں یہ مکاتیب ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں مرتب ہوئے اور

---

[۱] ان موضوعات کی پوری تفصیل ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی) کے اس مضمون میں ملاحظہ کیجئے "واجد علی شاہ کی ایک نایاب تصنیف" (اردو ادب کے آٹھ سال۔ مرتبہ عشرت رحمانی۔ ص ۱۴۱۔ کتاب منزل لاہور)

بیگم موصوف نے جو نسخہ اکبر علی خاں توقیر کے بیش بہا مقدمہ کے ساتھ واجد علی شاہ کو بھیجا تھا وہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس کا نمبر بقول ڈاکٹر محمد اشرف (oriental 5288) ہے۔ برٹش میوزیم نے ایک خاتون (Mrs. L. Heilgers) سے خریدا تھا مہتمم کتبخانہ کا خیال ہے کہ اس کی تیاری پر تقریباً آٹھ سو روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ یہ خوبصورت چمڑے کی جلد کا مخطوطہ ۸۰ مطلا اوراق پر مشتمل ہے دو ورق سادہ ہیں ہر صفحہ پر شاہ اودھ کا نشان یعنی دو مچھلیاں اور اوپر تاج منقش ہے۔ مہتمم کتب خانہ ذوالفقار الدولہ کی مہر کے علاوہ خود واجد علی شاہ کی سرکاری مہر ہے اور ورق نمبر ۱۲ ب پر واجد علی شاہ کی شبیہ بھی ہے جس کے سرنامہ پر عنوان کے طور پر درج ہے :-

شبیہ حضرت سلطان عالم
کہ ہے تصویر گویا جانِ عالم

رام پور ۱۸۵۷ء میں دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد یو۔ پی کی ایک ریاست رہ گئی تھی جو شرفاء اور اہل علم و ہنر کی جائے پناہ بن گئی تھی۔ والیٔ رام پور نواب یوسف علی خاں (متوفی ۱۸۶۵ء) کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ نواب کلب علی خاں (متوفی ۱۸۸۷ء) کے عہد میں تو ایسے نامور شعراء خوش نویس اور مصور جمع ہو گئے تھے جس کی نظیر شاید ہی کسی اور ریاست میں ملے گی۔ غرض نوابین رام پور نے ادب علم کی سرپرستی اور قدر و منزلت کی اور مختلف کتب خانوں کی جو کتابیں زمانے کے دستبرد سے بچ بچا کر رام پور پہنچیں انکی حفاظت کر کے جس علم دوستی کا ثبوت دیا اس کی زندہ یادگار رضا لائبریری رام پور ہے جس کی داغ بیل نواب فیض اللہ خاں

(متوفی ۱۷۹۴ء) نے ڈالی تھی ان کے جانشینوں کے عہد میں یہ کتب خانہ برابر ترقی کرتا رہا اور آج اس کا شمار ہند و پاک کے ممتاز کتب خانوں میں ہوتا ہے۔

بلگرام بلگرام (ضلع ہردوئی) کے مردم خیز قصبہ میں علمی سرگرمیاں قاضی یوسف گازرونی (فاتح بلگرام) کے زمانہ (۴۰۹ھ - ۱۰۱۸ء) سے شروع ہو کر صدیوں تک جاری رہیں، اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے صوفی عالم اور صاحب قلم اُٹھے جنھوں نے اس علمی مرکز میں نہایت قیمتی کتب خانے قائم کئے ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے :-

کتب خانۂ قاضی ابوالفتح بلگرامی مرید شیخ کمال (متوفی ۱۰۰۱ھ) میں فلسفہ، منطق خصوصاً تفسیر کی بہت سی کتابیں جمع تھیں۔ آپ اکبر کے عہد میں بلگرام کے قاضی تھے۔ اس اہم عہدہ کی مصروفیات کے باوجود کتابیں لکھنے اور کتابیں جمع کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ قاضی صاحب کو خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں اپنے قلم سے لکھیں۔ وہ صرف کتابیں نقل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر جامع اور واضح حاشیے لکھ کر ان کی قدر و قیمت بھی بڑھا دیتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ کتاب میں کہیں ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں ملتی۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ان کتابوں کو "صحف آسمانی کا نمونہ اور الواح ربانی" کا نسخہ کہتے ہیں۔

کتب خانہ سید عبداللہ بلگرامی (متوفی ۱۱۳۲ھ) بھی بہت نایاب تھا۔ آپ بہترین شاعر ہونے کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فن کتابت میں مہارت حاصل تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہفت قلم تھے۔

کتب خانۂ شاہ طیب (متوفی ۱۱۵۲ھ) میں بہجۃ المحافل جیسی نادر کتابیں موجود تھیں۔ شاہ صاحب ایسے زود نویس کاتب تھے کہ چار سو پانچ سو صفحات کی کتاب

شرح ملا جامی ایک ہفتہ میں نقل کر دی تھی۔ آپ کی نسبت علامہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"کتب خانۂ عظیمے از خوش خط خود یادگار گذاشت"

ایسے ہی کتب خانے سید عبدالواحد بلگرامی اور دوسرے اکابرین کے پاس تھے

ان میں **سید عبدالجلیل کا کتب خانہ** بھی بہت مشہور ہے۔ آپ بڑے عالم و فاضل

بزرگ تھے۔ فن کتابت میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ حیات جلیل (سید مقبول احمد صمدنی) میں

درج ہے کہ خط نسخ اور نستعلیق اتنا پختہ، پاکیزہ اور شیریں لکھتے کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں

روشن ہو جاتی تھیں، کتابیں جمع کرنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کتابیں خود لکھتے اور

جہاں کہیں کوئی اچھی کتاب دستیاب ہو سکتی اس کی فکر و تلاش میں رہتے۔ کتابوں کی

نگہداشت اور حفاظت کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اپنے

بیٹے میر سید محمود کو لکھتے ہیں:-

"برخوردار کتاب روضۃ الناظر (منتخب شعر عربی و فارسی) اس صندوق
میں رکھی ہے جو گجرات سے گھر بھرنے آیا تھا۔ یہ کتاب کمیاب ہے اس کی
نفاست کے سبب براہ احتیاط میں اس کو ہمراہ نہیں لایا تھا اس وقت
اس کتاب کی ضرورت لاحق ہے۔ کتاب کو صندوق سے نکال کر اور
مخدومی میاں محمد طفیل کو دکھا کر ان سے التماس کیجیے کہ اگر فرصت ہو
تو چند ورقوں پر اس کی نقل کر دیں ورنہ آپ خود ہی اس کی نقل احتیاط
کے ساتھ کریے اور مقابلہ کرکے اپنے خط میں ملفوف کرکے بھیج دیں کہ
ضرورت شدید ہے۔ کتابوں کی احتیاط کے بارے میں کیا لکھوں۔
آپ پر ظاہر ہے کہ میں کتابوں کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں اور کتنی محنت و

تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے۔ آپ مجھ سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں گے اور حزم و ہوشیاری رکھیں گے تاکہ کتاب بے جا نہ جانے پائے۔ کبھی کبھی دھوپ بھی دکھا دیا کریں۔ مخدومی میاں محمد طفیل نے رسالہ کلمہ طیبہ فقیر سے نقل کرنے کے لئے لیا تھا جب فارغ ہوجائے تو احتیاط کے ساتھ کتابوں میں رکھ دیجئے گا۔"

جن کتابوں کی علامہ عبدالجلیل نے بڑی احتیاط اور توجہ کے ساتھ حفاظت کی تھی وہ سب ان کے انتقال (۱۷۲۵ء) کے بعد محفوظ نہ رہ سکیں کچھ ضائع ہوگئیں لیکن خدا کے فضل سے ان کے کتب خانہ کا بہترین حصہ کتبخانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں پہنچ کر محفوظ و مامون ہوگیا۔

اسی طرح بلگرام کے کتب خانوں کی کتابیں انقلاب زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگئیں اس کے باوجود انگریزوں کے ابتدائی دور تک نایاب کتابوں کے کچھ ذخیرے باقی رہ گئے تھے جن کی بدولت بلگرام انگریز سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ وہ یہاں آتے اور انمول قلمی کتابوں کو حاکمانہ اثر و رسوخ سے ردی کے مول خرید کرلے جاتے۔ بعض ناقدرشناس حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے اسلاف کی کتابیں تحفتاً بھی پیش کر دیتے تھے۔

مگر قاضی ابوالفتح کے کتب خانے کے ذخائر میں سے خندان قضاۃ بلگرام کے متعلق قدیم سجلات اور شاہی فرامین بربادی سے بچ رہے۔ ان کو قاضی موصوف کے ورثا نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے رکھا ہے کہ ابتک ان کے خاندان میں قاضی شریف الحسن بلگرامی (اڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ)

کے پاس محفوظ ہیں ان میں قاضی محمد یوسف گازرونی کا ایک دستخطی سجل[۱] مرقوم ۵ جمادی الاول ۴۳۰ھ بھی ہے جو قدامت اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور قابل قدر دستاویز ہے۔ ان تمام سجلات اور فرامین کو دیکھ کر بے اختیار وہ مرثیہ میری زبان پر آگیا جو کسی نے قاضی ابوالفتح کے کتبخانہ کی بربادی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

دردا و حسرتا کہ زوالِ کمال شد ٭ بطالبان حیاتِ دو روزہ وبال شد

مارہرہ بلگرام سے جن آبادیوں نے فیض پایا ان میں راقم کا وطن مارہرہ (ضلع ایٹہ) بھی شامل ہے۔ اس قصبہ کی موجودہ حالت دیکھ کر کون یقین کر سکتا ہے کہ یہ کبھی فخر روزگار مشائخ، علماء اور اطباء کا مسکن تھا جن کے روحانی و علمی فیض کا دائرہ نہایت وسیع تھا متعدد مکاتب قائم تھے اور ذی علم اصحاب اپنے گھروں پر بھی تعلیم دیتے تھے ان سرگرمیوں کے سلسلہ میں کتابوں کے جو ذخیرے جمع کئے گئے تھے وہ زمانہ کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوتے رہے اور اب اس گئی گذری حالت میں بھی خاندان سادات کے ایک بزرگ سید محمد میاں مرحوم کے گھرانے میں ایسی نایاب کتابیں موجود ہیں جن کے تحفظ کا اگر کوئی بندوبست ہو جائے تو اسے علم و ادب کی بہت بڑی خدمت سمجھا جائے گا۔ سید محمد میاں کے مورث اعلیٰ شاہ عبد الجلیل رح (بن میر عبد الواحد) بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے تھے

---

[۱] بقول پروفیسر نذیر احمد چیرمین شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ "فارسی خط کی قدیم ترین دستیاب کتاب "کتاب الابنیہ" ہے جس کا ایک نسخہ ۴۴۷ھ کا یا نا میں موجود ہے" لیکن گازرونی کا سجل مرقومہ ۴۳۰ھ جو کتاب مذکورہ سے متقدم ہے۔ دنیا میں فارسی خط کا سب سے قدیم تحریر ہے۔ (ملاحظہ ہو "رسالہ فکر و نظر" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ج ۱ شمارہ نمبر ۳)

اور انھوں نے ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں یہیں وفات پائی۔ لیکن سید صاحب کی آمد سے پہلے خاندان زبیری کنبوی[۱] یہاں آباد ہو چکا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد چودھری وزیر محمد خاں نے ان کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جس میں وہ مدفون ہیں۔

---

[۱] یہ خاندان حضرت زبیر بن العوام کی اولاد ہے اس خاندان کے بزرگ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے تقریباً ۵۰ سال بعد ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) میں ہندوستان میں پہلے پہل سندھ آئے اس کے بعد ملتان میں آبسے پھر دہلی میں سکونت اختیار کی اور وہاں سے نقل مکانی ہوتا رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ جہاں گئے وہاں انھوں نے اپنے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے تشنگانِ علوم کو سیراب کیا۔ اس خاندان میں جو اہل قلم گذرے ہیں ان میں سے بعض مصنفین کے نام مع ان کی تصانیف کے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ شیخ عنایت اللہ (میر منشی شاہجہاں) مصنف بہار دانش اور اشرف الصحایف شیخ محمد صالح (مورخ شاہجہانی) مصنف عمل صالح۔ نواب خیر اندیش خاں (فوجدار شہنشاہ عالمگیر) مصنف خیر التجارب۔ محمد شفیع سنبھلی مصنف شرح قصائد عرفی ۱۶۹۹ء۔ نظام الدین حسین مارہروی، مصنف سلسلۂ نظامیہ، ۱۸۰۵ء۔ چودھری بہاء الدین مارہروی، مصنف اخبار المارہرہ ۱۸۶۰ء۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین امروہوی (آنریری سکریٹری ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ) مترجم فرنچ ریوولیشن اینڈ نپولین (سرگذشت نپولین بوناپارٹ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۱ء) حکیم نواب علی خاں امروہوی، مصنف شمس التواریخ، ۱۸۹۶ء۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مصنف سسٹم آف ایجوکیشن اور سسٹم آف اکزامینیشن۔ مولوی سعید احمد مارہروی (بانی شعیبیہ محمدیہ کالج آگرہ) مصنف امرائے ہنود۔ مولوی محمد امین مارہروی مصنف تذکرہ وقار اور ضیائے حیات وغیرہ۔ (باقی صفحہ ۳۱۷ پر)

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خاندان زبیری کے بزرگ حضرت مخدوم شیخ سماء الدین، میاں لاڈن اور شیخ جمالی وغیرہ نے دہلی میں تیموری حملہ کے بعد مسند علم و فضل بچھائی تھی اور مدرسوں و کتب خانوں کے احیاء میں خصوصی حصہ لیا تھا۔ دہلی سے یہ خاندان مختلف شہروں (میرٹھ، مارہرہ، سنبھل، امروہہ، مرادآباد، بریلی وغیرہ) میں پھیل گیا۔ زبیری خاندان کے جو افراد مارہرہ کی خاک سے اُٹھے ان میں اکثر قلم کے بڑے دھنی ہوئے۔ اسی لئے ان کے ہر گھر میں ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ موجود تھا۔ جن میں مولانا حافظ خلیفہ محمد نصر اللہ کے گھرانے کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا۔ خود حافظ صاحب بڑے پایہ کے عالم تھے۔ پچاس برس کامل تشنگان علوم کو سیراب کیا اور مختلف علوم کی تین سو کتابیں نقل کیں۔ آپ کے پوتے حکیم عنایت حسین[1] فن طب کے امام تھے۔ انھوں نے "کاشف الاخبار"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۶) محمد حسین خاں میرٹھی مصنف مشاہیر کے تعلیمی نظریئے۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی مترجم کلام مجید۔ جو حدیث کی ایک کتاب "جمع الفوائد" نقل کرنے کی خاطر چھ ماہ دمشق کے ایک گاؤں میں رہے۔ اسی خاندان کے ایک فرد شاہ گلشن زبیری نے اپنے مرید ولی دکنی (متوفی ۱۷۴۴ء) کو اردو دیوان مرتب کرنے کی ہدایت فرماکر شمالی ہند میں اردو شاعری کو رواج دیا تھا۔

[1] حکیم عنایت حسین کے صاحبزادے حکیم امداد حسین نے بھی کئی کتابیں لکھیں مثلاً "میلاد شریف" رسالہ منظومہ توضیح القرآن، درود وظائف احمدی۔ حکیم امداد حسین کے پانچ فرزندوں میں سے حکیم الطاف احمد، حکیم دلدار احمد اور حکیم احمد سعید بڑے نامی گرامی طبیب ہوئے۔ حکیم امداد حسین کے فرزند حکیم دلدار احمد نے فن طب میں "گلزار احمدی اور گلشن احمدی" تصنیف کیں۔ حکیم دلدار احمد کے چھوٹے بیٹے حکیم ابو سعید احمد نے تصوف میں ایک رسالہ "مصباح الحق" لکھا اور بڑے بیٹے منشی فیض احمد نے اپنے پردادا حکیم عنایت حسین کی کتاب (باقی ص ۳۱۸ پر)

"آثار احمدی اور سلسلہ عالیہ" کے علاوہ طب نظری اور عملی پر نہایت جامع اور مبسوط کتاب "ریاض احمدی" دو جلدوں میں لکھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی یہ قلمی نسخہ میرٹھ میں مولوی حسین احمد زبیری کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔
حکیم صاحب کی تاریخ وفات مرزا غالب کے "پیر و مرشد" حضرت سید صاحب عالم مارہروی نے کہی تھی۔ "رفتہ بقراطِ دہر وادیلاہ"
۱۲۶۵ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۷) "سلسلہ عالیہ" کو اضافہ کے ساتھ شائع کرایا اور ایک کتاب "المشاہیر" بھی لکھی ان کے بڑے صاحبزادے حاجی انوار احمد مرحوم (سفیر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) نے متعدد کتابیں لکھیں مثلاً "خطبات عالیہ" کی کئی جلدوں میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چالیس سالہ خطبات کو جمع کر دیا ہے اور ہر خطبہ کے شروع میں صدر کی زندگی کے حالات اور ان کا فوٹو بھی ہے۔ "مرقع کانفرنس" میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی شروع سے تمام کار روائیاں اور ہر سال کے ریزولیشن درج ہیں منشی فیض احمد کے دوسرے صاحبزادے مولوی حسین احمد زبیری کی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں "خاندان زبیری کنبوہ" (دو حصے) اور "الزبیر" یعنی سیرت مبارک سید نا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ امداد احمد سپر خورد منشی فیض احمد کا ایک مضمون "اصول صدقات و خیرات اسلام"، انجمن اسلامیہ سکندرآباد (دکن) نے کتابی شکل میں شائع کرایا۔

حکیم احمد سعید کے فرزند حکیم محمد ابو صالح (راقم کے دادا) بڑے حاذق طبیب تھے ان کو میری پیدائش سے جو غیر معمولی مسرت ہوئی تھی اسکی مناسبت سے موصوف نے میرا نام "فرحت" تجویز کیا تھا لیکن عین عقیقہ کے موقع پر ان کے ایک دوست سے کسی بزرگ نے عالم رویا میں کہا کہ حکیم جی کے پوتے کا نام محمد زبیر رکھنا چاہیئے چنانچہ اسی بشارتی نام پر عقیقہ ہوا۔ (باقی صفحہ ۳۱۹ پر)

راقم کے اجداد میں مولوی بزرگ علی اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے انکی جلالت علمی کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں انکی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی بہت سی کتابیں جمع تھیں مولوی بزرگ علی ابن حسن علی مارہرہ میں پیدا ہوئے اور اپنے زمانہ کے بڑے بڑے فضلاء سے تحصیل علوم و تکمیل فنون کر کے حضرت شاہ عبد العزیز رح دہلوی کی درسگاہ سے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸) میرے والد حکیم محمد اصلح کو طبی صلاحیتیں ورثہ میں ملی تھیں وہ دس برس تک شدید بیمار رہے لیکن اس حالت میں بھی جب کسی مریض کو دوا تجویز کر دیتے تو وہ تیر بہدف ثابت ہوتی تھی۔ والد مرحوم کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بھی بڑا شوق تھا۔ انھوں نے چیچک کے متعلق ایک کتابچہ بھی لکھا تھا جب دار الکتب مفید الاطبا لاہور نے شائع کیا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اگر میرے باپ کو اجل مہلت دیتی تو ان کے ہاتھ سے فن طب کے سلسلہ میں بڑے بڑے کام انجام پاتے۔ غرض میرے گھرانے میں طبابت کا جو سلسلہ حکیم عنایت حسین سے شروع ہوا تھا وہ مسلسل سوا سو برس تک جاری رہ کر میرے باپ پر ختم ہو گیا۔ والد مرحوم کی خواہش تھی کہ میں طب پڑھوں اور میرا دل ڈاکٹری پڑھنے کو چاہتا تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میری تعلیم کے دوران میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں جاری ہوگئی تھیں جنھوں نے میری تعلیم اور میری زندگی کا رُخ بالکل پلٹ دیا لیکن پڑھنے لکھنے کا جو ذوق مجھے ترکہ میں ملا تھا وہ میں فطرت اور گرد و پیش کی زندگی کے مدرسے میں پورا کرتا رہا۔ مارہرہ کے اکثر حضرات نے مجھے طبابت کا آبائی پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا میں اگر چاہتا۔ تو اپنے بزرگوں کے نام سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا مگر میں نے طب پڑھی نہ تھی اس لئے مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں اپنے نامور اجداد کے نام بیچ کر روزی کماؤں۔ اس طویل داستان کو مختصر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ آخر کار تقدیر مجھے علی گڑھ لے آئی اور سنہ ۱۹۲۰ء میں (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

سند حدیث لی اور تمام عمر خدمت علم میں بسر کردی۔ وہ علی گڑھ میں منصف ہو گئے تھے لیکن اس کے ساتھ تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور وہاں کی جامع مسجد کے اس مدرسہ کا احیاء کیا جو بانی مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں قائم کیا تھا۔ آپ ٹونک میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر بھی رہے وہیں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں وفات پائی اور سرونج میں دفن ہوئے موصوف کے چشمہ فیض نے سیکڑوں کو

(بقیہ حاشیہ صد ۳۱۹) مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف میں شامل ہو گیا اس تینتیس برس کے عرصہ میں لائبریری کی مختلف خدمات انجام دینے کے علاوہ تقریباً چالیس ہزار انگریزی کتابوں کی درجہ بندی اور فہرست سازی کی کیٹلاگر اسسٹنٹ لائبریرین اور لائبریرین کے عہدوں پر مامور رہا اور لائبریری سائنس کلاس کو فہرست سازی کا مضمون برسوں پڑھایا اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو عرض کروں کہ میرے اس درس سے تقریباً ایک ہزار طلباء نے فیض اٹھایا ہے جن میں بہت سے ہندو پاک کی لائبریریوں میں اعلیٰ عہدہ پر مامور ہیں ان ہی خدمات کی یادگار میری یہ دو تصانیف ہیں "پریکٹیکل کٹلاگنگ اور کتاب نمبر کیا ہے؟" پہلی انگریزی میں کٹلاگنگ (فہرست سازی) پر ہے اور دوسری میں بک نمبر (کتاب نمبر) بنانے کے قاعدے اور اصول بتائے گئے ہیں یہ دونوں کتابیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ میری یہ دو کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں "چند دن حجاز میں" یہ میرے سفر حج کی یادگار ہے "اردو نثر کا تاریخی سفر" اس میں اردو نثر کی چھ سو سالہ تاریخ اور بہت سی نثری تصانیف کا سن وار ذکر ہے۔ یہ [illegible] اردو علی گڑھ اور گورکھپور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے اس کتاب کو لکھتے وقت میرے پیش نظر ادارہ تعلیم اردو کے طلباء رہے جن کو میں کئی برس سے اعزازی طور پر درس دے رہا ہوں میری ان کتابوں کی اہل نظر نے جس طرح قدردانی کی وہ اس کتاب (اسلامی کتب خانے) کی تکمیل میں معاون ہوئی ہے۔

ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی کو لوٹا۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں اور قرآن کے بہت سے نسخے اور بہت سی نادر کتابیں بھی کتب خانۂ شاہی سے لوٹیں۔ اس کے علاوہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی شورش و لوٹ مار اور ۱۸۵۷ء کی خوں ریزیوں کے ساتھ جو غارت گری ہوئی اس میں بے شمار کتابیں ضائع ہوگئیں۔ دہلی کے کتب خانوں کی جیسی بربادی ہوئی اس کی ایک جھلک شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی اس تحریر میں دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں[1]:۔

"بارہ بجے کالج کے کتب خانے لٹنے شروع ہوئے۔ پہلے عربی فارسی اردو وغیرہ کی کتابوں کے گٹھر باندھ کر کتب فروشوں، مولویوں اور طالب علموں کے پاس بیچنے کے لئے لے گئے۔ بعض طلبا بھی کتابوں کے شوقین خود شریک ہو کر اچھی اچھی کتابیں لے گئے۔ لوگوں نے کتابوں کے اچھے اچھے پٹھے اتارنے کو جلد سازوں کے ہاتھ بیچیں گے باقی کو پھاڑ کر پھینک دیا اور احاطہ میں کئی انچ موٹا فرش ردی کا بچھ رہا غرض کالج میں سوائے ردی ...... کے کچھ نہ تھا۔"

اسی طرح دہلی کے اور کتب خانے بھی لوٹے اور جلائے گئے جو کتابیں بچ رہیں وہ کوڑیوں کے مول بکیں۔ کچھ انگلستان وغیرہ پہنچ کر وہاں کے کتب خانوں کی زینت بنیں۔ اس منظر سے متاثر

[1] تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند (۱۹۰۴م) ص ۴۲۴

نظر آئیں گے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو گا۔ اسلامی
کتب خانوں اور مدرسوں کی تاریخ کا سب سے اہم اور لائق ذکر پہلو یہ ہے
کہ مسلمانوں کی حکومت کے دور زوال میں بھی کتب خانوں اور مدرسوں
کی افراط رہی اور ان کا ارتقاء عوام کے ہاتھوں ہوتا رہا۔ حالانکہ
اس زمانہ میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور شاہجہاں و عالمگیر
کی دہلی کو بقول خدائے سخن میر تقی میر فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا تھا۔ یہاں
آئے دن قتل و غارتگری کا بازار گرم رہتا تھا اور آزادی ہند کے شیدائی غدار اور
باغی قرار دے کر پھانسیوں پر لٹکائے اور گولیوں کا نشانہ بنائے جا رہے[۱] تھے۔
علم کے اس معدن اور سخنوران باکمال کے اس مسکن کی بدحالی کا ماتم
حالی نے اس طرح کیا ہے:۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

۱؎ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جو بزرگ شہید ہوئے ان میں سرسید کے جگری دوست اور دہلی کالج کے استاد فارسی مولانا امام بخش صہبائی بھی تھے۔ انھوں نے فارسی میں بہت سی کتابیں لکھیں اور منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق البلاغت کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب کہی جاتی ہے۔

فنِ نقادی میں نہایت بلند درجہ ہے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص تھا۔ انھوں نے اپنی علمی اور دنیوی وجاہت کی وجہ سے تاریخ اور شعر و شاعری کی بہت سی کتابیں جمع کرلی تھیں جن میں اکبر کے رضاعی بھائی مرزا عزیز کوکہ کے کتب خانے کا ایک مخطوطہ (حکیم ناصر خسرو بلخی کے سفرنامہ کا قلمی نسخہ) بھی تھا۔
جس پر مرزا کی ایک قلمی سطر موجود ہے یہ اب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں ہے۔

مدرسہ غازی الدین کا کتب خانہ

دہلی کے تعلیمی کتب خانوں میں یہ وہ کتب خانہ ہے جس کا فیض آج تک جاری ہے۔ اس مدرسہ کی ابتداء ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور یہاں قدیم دہلی کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اس ادارے نے اسلامی علوم کی اشاعت، انگریزی علوم کی ترویج اور اردو زبان کی ترقی میں بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اسکی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب اسی کالج کے مایۂ ناز طالب علم تھے۔ جب ۱۸۲۸ء میں یہاں انگریزی تعلیم جاری ہوئی اور ۱۸۴۲ء میں ایک علمی انجمن ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور سائنس، جغرافیہ، ریاضی وغیرہ کی سیکڑوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر یہاں سے نکلنے لگیں تو اس وقت مدرسہ اور اس کے کتب خانہ کی اہمیت اور افادیت بہت بڑھ گئی تھی۔
اس مدرسہ کے علاوہ اور بہت سے مدرسے دہلی میں تھے بقول حضرت شاہ عبدالعزیز دہلی میں "جس طرف نکل جائیے مدارس

آزردہ کا کتب خانہ مرحوم دہلی کے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ (متوفی ۱۸۶۸ء) کا کتب خانہ تین لاکھ روپیہ کی مالیت کا تھا۔ آزردہ نہایت ذی علم انسان اور قادر شاعر تھے۔ تین زبانوں (اردو، فارسی اور عربی) میں شعر کہتے تھے۔ درس و تدریس کا بھی شوق تھا۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور، نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال اور سر سید ان کے شاگردوں میں تھے۔ کثرت درس کی وجہ سے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی لیکن یہ نفیس کتب خانہ بھی غدر میں نہ بچ سکا۔ مفتی صاحب پر غدر کے فتوے پر دستخط کرنے کے اتہام میں مقدمہ چلایا گیا وہ تو بری ہو گئے مگر انکی کتابوں کو رہائی نہ ملی۔

رخشاں کا کتب خانہ عجب اتفاق ہے کہ رخشاں کے زمانہ میں مغل سلطنت کی شوکت و عظمت تو بالکل سرد پڑ گئی تھی مگر دہلی میں شعر و شاعری اور علم و ادب کی محفلیں گرم تھیں اور یہ شہر مومن، غالب، ذوق، شیفتہ اور صہبائی جیسے شعرائے کامل کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ان فضلائے روزگار کے کتب خانوں میں غالب کے محبوب شاگرد نواب ضیاء الدین خاں رئیس لوہارو (متوفی ۱۸۸۳ء) کا کتب خانہ نہایت نفیس تھا اس سے مشہور مورخ الیٹ نے اپنی کتاب "تاریخ ہندوستان" کی تیاری میں بڑی مدد لی تھی۔ نواب صاحب کا شاعری اور

اسلامی تعلیم کے احیاء اور مسلمانوں کی اصلاح کی بہت کوشش کی اور ان مقاصد کی تکمیل کی خاطر متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں "ازالۃ الخفا" اور "حجۃ البالغہ" سب سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ "او بود امام اعظم دیں" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز کا کتب خانہ

حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ان کے عالی مرتبت بیٹوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی نے اپنے مقتدر باپ کے دینی، تدریسی اور تصنیفی کاموں کو جاری رکھا۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر نے قرآن شریف کا ترجمہ آسان اور سادہ اردو میں کرکے قرآن کے مطالب کو عوام تک پہنچانے کا سامان فراہم کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز نے "سر الشہادتین، بوستان محدثین، تحفۂ اثنا عشریہ" جیسی کتابیں تصنیف کیں اور علم حدیث کی ترویج و اشاعت عمر بھر کرتے رہے۔ ان چاروں بھائیوں کے کتب خانوں میں شاہ عبدالعزیز کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ لکھا ہے کہ اس میں[1] پندرہ بیس ہزار کتابیں تھیں اور ان سب کا آپ نے مطالعہ کیا تھا۔
شاہ صاحب کی وفات (۱۸۲۳ء) پر مومن خاں دہلوی نے جو تاریخ کہی ہے اس میں آپ کی زندگی کی پوری تصویر پیش کر دی ہے۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

---

[1] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حاشیہ ص ۳۴

کی چولیاں چڑھی ہوئی تھیں جو مختلف رنگوں کی تھیں۔ ہر فن
کے لئے ایک قسم کی جھینٹ یا جامہ وار مخصوص تھی، ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ایک خوشنما گلزار ہے جس میں مختلف رنگ وبو
کے پھول کھلے ہوئے ہیں الماریوں پر رنگین اور خوبصورت
پردے آویزاں تھے اور پٹیوں پر جو پوشش تھی وہ بھی دیدہ
زیب اور خوشنما جھینٹ کی تھی۔ کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ
کرنے سے قبل ہی ان کے ظاہری حسن سے جو خوشگوار اثر قلب و
نظر پر پڑا اس سے ایک خاص سرور حاصل ہوا۔ بہت دیر تک
تو مجھے اس دل فریب نظارہ ہی سے فرصت نہ ملی۔ اس کے
بعد جب کتابوں کا مطالعہ کیا تو ہر فن میں بیسیوں نوادر نظر آئے
...... اور کئی گھنٹے اس علمی گلزار میں گذارے جس سے روح و
دماغ کو تازگی و بالیدگی حاصل ہوئی۔"

شاہ ولی اللہ کا کتب خانہ

یہ کتب خانہ دہلی میں ایک ایسا چراغ تھا جو اٹھارویں صدی کی
تیرہ و تاریک فضا میں نہ صرف روشن رہا بلکہ اس سے بہت سے
چراغ جلے۔ اُس قیامت خیز دور میں حضرت شاہ ولی اللہؒ ($\frac{۱۷۰۳ء}{۱۱۱۴ھ}$ –
$\frac{۱۷۶۲ء}{۱۱۷۶ھ}$) نے مذہب اور علم کی جس طرح خدمت کی وہ کبھی فراموش
نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے اپنے باپ کے مدرسہ رحیمیہ کی رونق اور
علمیت قائم رکھی۔ درس و تدریس کی دولت سے طالبانِ علم کو مالا مال کیا

چند متفرق کتب خانے

نواب وزیر الدولہ کا کتب خانہ مغل بادشاہوں کے بعد جن والیان ریاست نے مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی روایات کو برقرار رکھا ان میں ریاست ٹونک کے نواب وزیر الدولہ اور ان کے بیٹے و جانشین نواب محمد علی خاں کے نام بھی جلی حروف میں ملتے ہیں ان علم نواز نوابین نے جو کتب خانے قائم کئے وہ نہایت اہم اور نفیس کہے جاتے ہیں۔ نواب وزیر الدولہ کے کتب خانہ کا حال مولوی سید منظور الحسن نے اس طرح بیان[1] کیا ہے۔

"اس کتب خانہ کو جب وہ قلعہ کہنہ کی ایک شاندار عمارت میں سجا ہوا تھا میں نے بھی دیکھا تھا۔ کتابیں فن وار الماریوں میں بڑے سلیقے سے جمی ہوئی تھیں کتابوں کی کئی فہرستیں تھیں ..... ان میں کتاب کے نام اور فن کے ساتھ صاحب تصنیف کا بھی مختصر حال درج تھا۔ کتابوں پر خوبصورت اور پھولدار کپڑے

[1] ملاحظہ ہو رسالہ معارف ج ۸۴ ص ۱۲۰

۱۷۷۰ء میں اس کا ترجمہ آسان فارسی میں کرایا تھا۔

غرض اس آخری دور میں یوپی کا بھی ہر علاقہ علوم وفنون کا مرکز اور علماء کا مرجع بنا ہوا تھا اور ایسے علم دوست اصحاب موجود تھے جو علمی ترقیوں کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں علم کو صرف علم کی خاطر حاصل کیا جاتا تھا اور مادی منفعت سے کوئی سروکار نہ ہوتا بلکہ تعلیمی نظام میں خلوص کا جذبہ اور رفاہِ عام کا ولولہ کارفرما رہتا تھا گو اس گذشتہ علمی عظمت کی اب صرف داستان باقی رہ گئی ہے لیکن اس کے غیر فانی نقوش ہمیشہ اس زاویہ نظر کی طرف رہنمائی کرتے رہیں گے جو انسانوں میں حقیقی انسانیت اور اخلاقی قدریں پیدا کرتا ہے۔

———— ✻ ————

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات شبلی از علامہ سید سلیمان ندوی۔

ان مدارس کے کتب خانوں کے علاوہ حافظ الملک رحمت خاں کا کتب خانہ بھی تھا جسے ان کی شکست و شہادت (۱۷۷۴ء) کے بعد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ لے گیا تھا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کی فہرست مرتب کی تھی جس کی ایک جلد ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس نے لکھا ہے[1]:-

"مجھے اسلحہ خانہ میں چالیس صندوق خراب و خستہ حالت میں رکھے ہوئے ملے۔ ان میں حافظ رحمت خاں کا تمام علمی خزانہ موجود تھا۔ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض پشتو کی تصانیف تھیں جو بڑی کاوش کے ساتھ بکمال حسن و خوبی بہادر اور صاحب علم و فضل روہیلہ سردار کے لئے لکھی گئی تھیں"

حافظ رحمت خاں کے کتب خانہ کی ایک کتاب "تواریخ رحمت خانی" خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے اس میں یوسف زائیوں کے کابل پر قبضہ کرنے اور ان کے ہندوستان آنے کے مفصل حالات درج ہیں۔ یہ ۱۶۲۲ء میں پشتو میں لکھی گئی تھی اور حافظ رحمت خاں نے

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں مولفہ سید الطاف علی بریلوی ص ۲۹۰ - اس کے علاوہ حافظ رحمت خاں کے حالات "گل رحمت" (محمد سعادت یار خاں) میں بھی درج ہیں۔

بالضوں نے "شرح درد التقرب، حزب التوسل الی جناب سید الانبیاء والرسل، تفسیر نظم الجواہر اور تاریخ فرخ آباد" جیسی کتابیں لکھیں خود سید صاحب تفسیر مذکور کے متعلق لکھتے ہیں۔ "تفسیر نظم الجواہر دیدنی است و دیدہ و دل سپردنی" لیکن موصوف کی تصانیف میں جو کتاب نہایت مقبول ہوئی وہ "تاریخ فرخ آباد" ہے۔[1] مورخ اِروِن نے فرخ آباد کے بنگش نوابوں پر مقالہ لکھتے وقت اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ اس کے متعدد نسخے ہندوستان اور انگلستان کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تین قلمی نسخے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

روہیلکھنڈ اسلامی سلطنت کے عہد آخر میں بھی جابجا کتب خانے اور علم و فضل کے چرچے پھیلے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں نواب حافظ الملک رحمت خاں نے روہیلکھنڈ کے مشہور شہروں کو رشک دہلی بنا دیا تھا۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں بریلی، شاہجہاں پور اور پیلی بھیت وغیرہ میں جو مدارس قائم کئے تھے ان میں طلبار کے لئے وظائف مقرر تھے اور عورتوں کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام کیا تھا۔ شہر کے ہر محلہ میں لڑکیوں کے مدرسے جاری تھے۔

---

[1] اس کتاب پر ڈاکٹر مختارالدین احمد کا ایک مضمون انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے رسالہ اردو ادب ج ۴ نمبر ا میں ملاحظہ کیجئے۔ آپ نے ایک [illegible] فصل جو فرخ آباد کے شعراء پر مشتمل ہے ایڈٹ کرکے شائع بھی کی ہے۔

کتب خانوں کی باقیات کا بہت بڑا حصہ محفوظ ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ سید محمد موسیٰ مارہروی نے اپنے خاندانی کتب خانے کی ۷۰۹ قلمی اور مطبوعہ کتابیں اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ کو دے دیں۔ دوسرے بزرگ سید محمد احسن مارہروی (سابق ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اپنے والد مرحوم سید علی احسن المتخلص بہ احسن مارہروی کا ذخیرۂ کتب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔

فرخ آباد اور شمس آباد

بلگرام کے نواح میں جو قصبات مردم خیزی کے لحاظ سے مشہور ہوئے ان میں فرخ آباد اور شمس آباد بھی شامل ہیں۔ ملا قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ ۱۷۰۹ء) کے علم و فضل کی نسبت لکھا ہے[1] کہ "در شمس آباد مسند افادہ گسترد جمّ غفیر را بہ افاضۂ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود۔" لیکن موصوف کے کتب خانہ کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔

البتہ فرخ آباد کے ایک بزرگ **سید ولی اللہ کے کتب خانے** کا ذکر ملتا ہے۔ موصوف نے ایک مدرسہ "فخر المرابع در ربیع المفاخر" بھی قائم کیا تھا اس مدرسہ کے علاوہ ایک مدرسہ نواب محمد خاں بنگش (متوفی ۱۷۴۳ء) نے فرخ آباد میں تعمیر کرایا تھا۔ لیکن اس دور میں سید ولی اللہ (متوفی ۱۷۷۳ء) نے علم کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

---

[1] مآثر الکرام از علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۱۰

شاعری جمالیت کے شرروں کے ساتھ فلسفیانہ افکار کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے غیر معمولی سرور بھی حاصل ہوتا ہے اور بے ساختہ زبان سے واہ بھی نکلتی ہے۔ شاہ برکت اللہؒ کے خاندان کے ایک بزرگ حضرت سید صاحب عالم[1] سے مرزا غالب کو اتنی عقیدت و شیفتگی تھی کہ عالم خیال میں حضرت کے آستانہ پر سر نیاز جھکایا کرتے تھے۔ غالب اپنے ایک خط میں چودھری عبدالغفور زبیری مارہروی کو لکھتے ہیں "جناب چودھری صاحب آؤ ہم تم حضرت صاحب کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کی کف پا سے ملیں"۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ ایک بار غالبؔ نے سید صاحب عالم سے ان کی تاریخ پیدائش دریافت کی۔ موصوف نے جواب دیا کہ لفظ تاریخ کے عدد سے ولادت کا سن نکلتا ہے۔ اس کے جواب میں غالبؔ نے اپنا سن ولادت اس شعر میں لکھ کر حضرت کے پاس بھیج دیا۔ ؎

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا ۔ ان کی تاریخ میرا تاریخا
(تاریخ: ۱۲۳ھ — تاریخا: ۱۲۱۷ھ)

سید صاحب عالم صاحب کے پوتے سید افتخار عالم بھی شعر و سخن کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے ان کی تصانیف میں "حیات النذیر" (سوانح شمس العلماء مولوی نذیر احمد) ایک نہایت جامع کتاب ہے۔ اس موقع پر خاندان سادات کے دو بزرگوں کے نام بھی قابل ذکر ہیں جن کی بدولت مارہرے کے

---

[1] سید صاحب عالم نے ایک رسالہ "تحفۃ المورخین" فن تاریخ گوئی کے متعلق لکھا تھا جو اب جواہر میوزیم اٹاوہ میں ہے۔

مارہرہ کے خاندان سادات میں بڑے بڑے مشائخ، عالم اور اہل علم گزرے
ہیں جنہوں نے اپنی خانقاہ برکاتیہ کے ساتھ ایک مدرسہ اور کتب خانہ بھی قائم کیا تھا
جس کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ہزاروں کتابیں قیمتی[1] تھیں اور اس خاندان
کے ایک بزرگ سید شاہ حمزہ[2] (متوفی ١١٩٨ھ / ١٧٨٤ء) نے اس کا متعدد بار مطالعہ کیا تھا۔
آپ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ دوپہر کا کھانا تناول فرمانے کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب
کتب خانہ سے نکلوا کر مطالعہ فرماتے تھے۔ آپ کی تصانیف "فص الکلمات" اور
"کاشف الاستار" ہیں۔ آپ کے صاحبزادے سید شاہ آل احمد عرف اچھے میاں[1] اپنے
زمانہ کے قطب الاقطاب تھے۔ لکھا ہے کہ وہ سب سے کتب سے مستغنی کر دیا تھا۔ علما کے دقیق
مشکل مسائل اس سہولت و آسانی سے حل فرماتے کہ عقل حیران ہو جاتی۔ آپ نے خانقاہ
برکاتیہ کے کتب خانہ کے متعلق فرمایا کہ اگر اسے کوئی مکمل طور پر دیکھنا چاہے تو بڑا وقت
درکار ہوگا چنانچہ اپنے خلفاء و مریدین میں سے جماعت علما کو ہدایت کی کہ کتب خانہ
سے متفرق علوم و فنون کی کتابیں منتخب کر کے ان کا ایک خلاصہ مرتب کریں جس کا حکم ایک مجموعہ
تیس اور بروایتے ساٹھ جلد کا تیار ہوا اور اس کا نام "آئین احمدی" رکھا گیا جس پر کہیں کہیں شاہ
صاحب کے دستخط اور ہدایات بھی موجود ہیں۔ سید شاہ اچھے میاں (متوفی ١٢٣۵ھ / ١٨١٩ء) کے
بزرگوں میں سید شاہ عبد الجلیل[2] کے پوتے سید شاہ برکت اللہ (متوفی ١١٤٢ھ / ١٧٢٩ء)
فارسی اور ہندی کے عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص تھا
دیوان فارسی اور مجموعہ اشعار ہندی "پیم پرکاش" آپ کی یادگار ہیں۔
"پیم پرکاش" کی نسبت پنڈت لچھمی دھر (صدر شعبہ سنسکرت دہلی
یونیورسٹی) نے لکھا ہے کہ "یہ ہندی شاعری کا لافانی شاہکار ہے۔ ان کی

١؎ [illegible] ٢؎ رسالہ برہان دہلی، ستمبر ١٩٥٠ء

درکار ہے لیکن ہم نے اپنے قارئین کی دلچسپی اور واقفیت کے لئے کچھ کتابوں کا ذکر کر دیا ہے۔ چند کا تذکرہ پچھلے اوراق میں آچکا ہے اور چند کا یہاں کیا جارہا ہے۔ پہلے اکبر کے رتن فیضی کے کتب خانے کی کتاب "موارد الکلم" ملاحظہ کیجئے جو نہ معلوم کہاں کہاں ہوتی ہوئی برلن کے کتب خانہ میں پہنچ گئی۔ "موارد الکلم" کا یہ نسخہ فیضی نے مولانا صدر الدین شیرازی کو پیش کیا تھا اسکے سرورق پر فیضی نے

حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ۔ اچھی رقم دے کر واپس لے لیجئے گا۔ لیکن وہ مرید زیادہ چالاک نکلا، مصحف عثمانی کے ہاتھ آتے ہی وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوگیا۔ تین دن بعد اس کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا کہ سمرقند جا چکا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب ترکستان کے علاقے روسی سلطنت میں شامل کر لئے گئے تو ۱۸۶۲ء میں اس علاقے کے روسی گورنر کی نظر خواجہ احرار کی مسجد میں مصحف عثمانی پر پڑ گئی۔ اس نے مسجد کے لئے ستو روبل دیے اور مصحف عثمانی کو سنٹ پیٹرس برگ کے کتب خانے میں بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے فوراً بعد لینن نے اس کو مشرقی اقوام کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح یہ نسخہ لینن گراڈ سے پہلے تاتاریہ کے علاقے میں آیا، اور پھر وہاں سے تاشقند کی انقلابی سوئٹ کے پاس پہنچا اور اب ازبکستان کی راجدھانی تاشقند کے تاریخی میوزم میں محفوظ ہے۔"
(صدق جدید۔ لکھنؤ، [illegible])

اپنے قلم سے یہ عبارت[1] لکھی ہے :-

"جعلت هٰذه الرّسالة تذكرة للأخ الأعز الأجل صاحب النثر الفائق والنظم الرّائق الخابر بالسلوك الحقيقي والمجازي مولانا صدر الدين محمّد.... الشيرازي سلّمه اللّٰه وأبقاه. نمّقه العبد ابو الفيض فيضي في ربيع الأول لا زال مخضرًا كأول الرّبيع سنة ثمان وثمانين وتسع مائة"

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے :-

"صنّفه العبد الأقل ابو الفيض فيضي أفاض اللّٰه عليه فيوضه"

علامہ فیضی کے کتب خانہ کی ایک کتاب "تاریخ گزیدہ" سر سید[2] کے ذاتی کتب خانہ میں تھی جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اس پر فیضی کے دستخط، مہر اور اسکے ہاتھ کی یہ تحریر ہے:

مالك هٰذا التاريخ النجيب العجيب بالهبة الصحيحة الصريحة ابو الفيض فيضي۔

---

[1] فیضی کی دو تحریریں از ڈاکٹر مختار الدین احمد (رسالہ "آج کل" دہلی اکتوبر ۵۶ء)

[2] اس لائبریری کے شعبۂ عربی کی مطبوعہ کتابوں میں جسٹس سید محمود مرحوم کے کتبخانہ کی ایک کتاب "قانون ابن سینا" ہے جو روما میں ۱۵۹۳ء میں چھپی تھی۔

ایسے ہی بے شمار نوادر ہندوستان اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اب اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ ہند کے عہد اسلامی کی کتابی دولت ہندوستان میں کہاں کہاں ہے؟ تو کتب خانۂ خدا بخش بانکی پور، کتب خانۂ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کتب خانۂ رام پور، کتب خانۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ، کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن، کتب خانۂ حبیب گنج[1] کے نام لے دینا کافی ہے جہاں عہد مسلم کی کمیاب و نادر کتابیں محفوظ ہیں۔ بعض کتب خانوں کے کیٹلاگ بھی شائع ہو چکے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کتب خانہ میں کون کون سے نوادر ہیں۔

ان کتب خانوں کے علاوہ بعض علم دوست حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں بھی مسلم عہد کی کتابیں موجود ہیں جن میں بہت سی کتابوں پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور جو وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہتی ہیں مثلاً ہمایوں کے کتب خانہ کا ایک قرآن مجید[2]

---

[1] "کتب خانۂ حبیب گنج کس طرح جمع ہوا" مولانا حبیب الرحمن شروانی کا مضمون "مقالات شروانی" (ص ۲۸۳) میں ملاحظہ کیجیے۔ یہ کتب خانہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں مولوی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کی عنایت اور توجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہے۔

[2] "روداد کل راجستھان اردو کنونشن جے پور" (مرتبہ احترام الدین احمد شاغل) ص ۱۰۲۔

ڈاکٹر محمد یار خاں جے پوری کے پاس ہے شہنشاہ ہمایوں کی اس پر مہر ہے اس کا ہر ورق مُطلا اور دیدہ زیب ہے اور باوجود سیکڑوں برس گذر جانے کے اسکی آب و تاب قائم ہے۔
جے پور میں احترام الدین احمد شاغل کے پاس "دیوان فیضی" کا ایک مُطلا نسخہ ہے جس پر اکبر کے کتب خانہ میں رہنے کا نوٹ درج ہے۔ مولوی مظہر علیم مرحوم (سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ) نے الذہبی کی "الکاشف" کا نسخہ ڈھاکہ میں دیکھا تھا جس کی کتابت ۷۴۹ھ میں خط کوفی میں ہوئی تھی۔ ایک نسخہ "منطق الشفا" ابن سینا ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ عالمگیری کتب خانہ کا تھا کمیلا (مشرقی بنگال) کے ایک رئیس حسام حیدر نے "قرآن مجید" کا ایک نسخہ مولوی مظہر علیم کو دکھایا۔ یہ خاص داراشکوہ کی تلاوت میں رہتا تھا۔ اس پر اس کی مہر موجود ہے۔ نواب صاحب نے اسے ایک یورپین لیڈی سے لیا تھا مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ اس مُذہب و مُطلا نسخہ کی آب و تاب کا یہ عالم تھا کہ اس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں۔

اور نہ معلوم کتنے ایسے جواہر پارے ہندو پاک کے علمی گھرانوں میں پڑے ہونگے کیا اچھا ہو کہ ان بکھرے ہوئے نوادر کو جمع کر کے مرکزی کتب خانوں میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ ان کی افادیت اور عمر دونوں بڑھ جائیں ورنہ ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

لہ "سفر نامہ مظہری" بحوالہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ جلد دوم کا حاشیہ